جلد سوم

مشتمل بر

دیوانِ سوم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1 آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی 110066

کلیاتِ مصحفی

جلد سوم

مشتمل بر

دیوانِ سوم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1 آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Mus'hafi

Volume III

By

Ghulam Hamdani Mus'hafi

Edited by: **Prof. Nisar Ahmed Faruqi**

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2004، شک 1924

پہلا اڈیشن : 1100

قیمت : /-181

سلسلۂ مطبوعات : 1172

ISBN: 81-7587-069-9

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے. پورم، نئی دہلی 66

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، جامع مسجد، دہلی 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہٗ واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثرنگاروں سے لے کر عہدِ جدید کے شاعروں اور نثرنگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

فہرست

دیوانِ سوم

(غزلیات)

ردیف ب

ردیف پ

ردیف ت

ردیف ٹ

ردیف ث

ردیف ج

ردیف چ

ردیف ح

ردیف خ

ردیف د

ردیف ذ

ردیف ر

ردیف ک

ردیف گ

ردیف ل

ردیف م

ردیف ن

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی، ے

حرفِ اوّل

شاعروں میں آپس کی نوک جھونک بھی ادبی قدر و قیمت سے خالی نہیں ہوتی۔ ادبی تاریخ کے صفحات کھنگا لیے تو کتنا ہی ذخیرہ ایسا ملے گا جو ہمیں فن کاروں کی رقابت اور معاصرانہ چشمک کے طفیل میں ملا ہے۔ معاصرانہ چشمکوں کا نقصان تو صرف یہی ہے کہ کبھی تہذیب واخلاق کے معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ لڑنا اور جوتم پیزار کرنا کبھی بھی شرافت اور بھلمنساہت کی نشانی نہیں سمجھا گیا، لیکن ادبی معرکوں کا معاملہ ذرا مختلف چیز ہے، اس کے فائدے زیادہ اور نقصان کم ہیں۔

پہلا فائدہ تو یہی ہے کہ ان سے فن کار کی فنّی صلاحیت جاگتی ہے اور یہ چشمکیں سمندِ طبع کے لیے تازیانے کا کام کرتی ہیں۔ چنانچہ اِن ادبی معرکوں میں آپ کو بدیہہ گوئی، پُرگوئی اور زود گوئی کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔

دوسرا فائدہ زبان اور اسالیبِ بیان کو ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کے طرزِ اظہار و ادا کا گہرا مطالعہ کرنے کی وجہ سے اُس کے اسلوبِ بیان میں جو خامیاں نظر آتی ہیں اُنھیں خوب اُچھالا جاتا ہے۔ بات کرنے میں زبان پکڑی جاتی ہے، اس سے زبان اور قواعد کی معیار بندی میں مدد ملتی ہے۔ محاورہ، روز مرہ، ٹکسال باہر، غلط العام، غلط العوام جیسی اصطلاحیں آپ کو اردو زبان ہی میں سننے کو ملیں گی۔ یوں تو اردو اتنی وسیع زبان ہے کہ کشمیر سے کنیا کماری تک ہر جگہ اس کا چلن ہے مگر آج بھی جب کسی لفظ کی سند طلب کی جاتی ہے تو

لکھنؤ یا دلّی کی زبان ہی قابلِ قبول سمجھی جاتی ہے۔ یہ لسانی تعصب یا تنگ نظری نہیں ہے، بلکہ کسی زبان کی معیار بندی کے لیے یہ ضروری ہے کہ کسی مخصوص علاقے کی زبان کو معیار اور سند مانا جائے۔ جن زبانوں میں اس طرح کی قید نہیں ہے اُنھیں آج سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ اپنا معیار کس کو بنائیں؟ اسی لیے ان کی نشو ونما جنگلی گھاس کی طرح ہو رہی ہے۔

اردو میں شاعروں کی باہمی چشمکوں اور معرکہ آرائیوں کا تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ ہجویہ شاعری کا بڑا ذخیرہ وجود میں آ گیا، ورنہ فارسی کی روایت کے اثر سے، اور سرکار دربار کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے کے باعث اردو شاعری میں قصیدہ نگاری کا سرمایہ تو جمع ہو گیا تھا، ہجو کا پلہ خالی رہ جاتا، اُسے ان معاصرانہ چشمکوں نے پورا کر دیا۔

چوتھا فائدہ: آج ادبی تاریخ کی چھان بین کرنے والے سے پوچھیے تو وہ بتائے گا کہ ان ہجویہ قطعات میں ضمنی طور پر کتنے اشارے ایسے آ گئے ہیں جو نہ کسی تذکرے میں ملتے ہیں نہ کسی سوانح نگار کی نظر اُس طرف جاتی ہے۔

اردو کے شاعروں میں بھی معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں اور خوب خوب ہوئی ہیں، جو مقامی یا ہنگامی چشمکیں تھیں ان کا ریکارڈ تو وقت کے ساتھ ضائع ہو گیا، مگر جو ہجویہ کلام کسی شاعر کی کلیات میں شامل ہو گیا یا کسی تذکرہ نگار نے اس کو اپنی تالیف میں درج کر دیا، وہ آج ہمارے لیے ادبی دلچسپی کے علاوہ جزوی طور پر سوانحی معلومات کا ماخذ بھی ہے۔ جن ادبی معرکوں کا حال ہمیں تذکروں میں ملتا ہے ان میں سب سے اہم، دلچسپ اور ساتھ ہی افسوس ناک معرکہ اردو کے استاد شاعر غلام ہمدانی مصحفی امروہوی اور انشاء اللہ خاں انشا کے درمیان پیش آیا تھا۔ یہ معرکہ لکھنؤ کی ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور اس لیے بھی ہو گیا کہ لکھنؤ کے نواب اور امراء اس میں در پردہ اپنی تفریح کا سامان کر رہے تھے۔ اُنھوں نے دونوں فریقوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی۔ جب معاملہ نزاکت کی حدوں میں داخل ہو گیا تو

اس کی تفصیلات لکھنے سے تذکرہ نگار بھی گریز کرنے لگے اور زبانوں کی جو روایات تھیں وہ تاریخی اصول کے مطابق کچھ سے کچھ ہوتی چلی گئیں۔ انیسویں صدی کے تذکرہ نگاروں کو اتنا محتاط نہیں سمجھنا چاہیے کہ جو کچھ وہ لکھیں گے پوری تحقیق و تفتیش کے بعد لکھیں گے۔ ان تذکروں نے جہاں بہت سے حقائق کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے، وہیں بعض امور میں گمراہ بھی کیا ہے۔ معرکۂ مصحفی کے بارے میں ہمارے پاس کوئی ہم عصر روداد ایسی نہیں ہے جو غیر جانب داری سے لکھی گئی ہو۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' میں اس کا کچھ حال لکھا تھا، لیکن ایک طویل زمانے تک یہ قلمی کتابوں کی الماری میں بند رہا ہے اور اب سے چند سال پہلے ہی اس کی اشاعت ہوئی ہے۔ ادبی تاریخ میں معرکہ مصحفی و انشا کو محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں کسی قدر تفصیل سے درج کیا ہے اور انھیں کے زورِ قلم کی بدولت اسے شہرت نصیب ہوئی ہے۔ محمد حسین آزاد یقیناً بہت بڑے انشا پرداز ہیں اس سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا، لیکن ایک محقق اور مورخ کی حیثیت سے ان پر آنکھ بند کرکے بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً جب ہمارے پاس اس کی شہادتیں بھی موجود ہوں کہ وہ کبھی تعصب کی عینک لگا کر بھی واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اُنھوں نے مصحفی کے ضمن میں اس ادبی معرکے کا حال اس طرح شروع کیا ہے:

''اب اُن کے اور سید انشا کے معرکوں کا تماشا دیکھو۔ واضح ہو کہ اول تو مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو شیخ مصحفی بنایا کرتے تھے، جب سید انشا پہنچے تو اُن کے کلام کے سامنے ان کے شعر کب مزہ دیتے تھے، غزل سید موصوف کے پاس آنے لگی۔''

اول تو یہاں پہلا جملہ ہی غلط ہے۔ خود مصحفی نے ''تذکرۂ ہندی'' میں لکھا ہے کہ وہ سلیمان شکوہ کے دربار میں سید انشا کے توسل سے پہنچے تھے۔ محمد حسین آزاد کا بیان ہے:

''مصحفی سلیمان شکوہ کے استاد تھے، جب انشا لکھنؤ پہنچے تو سلیمان شکوہ نے اُن سے اصلاح لینا شروع کردیا اور مصحفی کی تنخواہ 25 روپے ماہانہ سے گھٹا کر 5 روپے ماہوار کردی

گئی جس پر اُنھوں نے اس قطعہ میں فریاد کی ہے:

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے ہم بھی تھے کبھی روزوں میں دس بیس کے لائق

ایک دن شیخ مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

زہرہ کی جو آئی کفِ ماروت میں انگلی کی رشک نے جا دیدۂ ہاروت میں انگلی

اس کا مقطع تھا:

تھا مصحفی یہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

اس زمین میں انشا نے بھی طبع آزمائی کی اُن کا مطلع تھا:

دیکھ اُس کی پڑی خاتمِ یاقوت میں انگلی ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی

آزاد کا بیان ہے کہ جب مصحفی چلے گئے تو "یاروں" میں اُن کے بعض اشعار پر بہت چرچے ہوئے اور غزل کو اُلٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خراب کیا۔ اس پیروڈی کا مقطع یہ تھا:

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

جب مصحفی کو پتا لگا کہ شہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار میں اُن کی غزل کی پیروڈی کی گئی ہے اور اُن کا خاکہ اُڑایا گیا ہے تو اُنھوں نے ایک فخریہ غزل کہی جس کے دو شعر یہ ہیں:

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
اک طُرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

اس موقع پر آزاد کہتے ہیں کہ سید انشا پالکی میں بیٹھ کر مصحفی کے گھر گئے اور ان سے معذرت کرتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی "بھئی تمھیں میری طرف سے ملال نہ ہو"۔

شیخ مصحفی نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا کہ نہیں بھئی مجھے ایسی باتوں کا خیال بھی نہیں، اور اگر تم بھی کہتے تو کیا تھا۔ آخر کا فقرہ سید انشا کو کھٹک گیا، آتے ہی یاروں کو اور بھی چمکا دیا۔ پھر سید انشا نے بحرِ طویل میں ایک ہجو کہہ ڈالی جس کا ایک مصرعہ یہ ہے:

''بہ خداوندیِ ذاتے کہ رحیم است و کریم است و علیم است و سلیم است و قدیم است و شریف است و لطیف است و خبیر است و بصیر است و نصیر است و کبیر است و رؤف است و غفور است و شکور است و ودود است و مرا خلق نمود است و بود خالقِ آفاق، قسم می خورم اکنون کہ مرا ہیچ زہجوِ تو سروکار نبود است و لے از طرفت گشت شروع این ہمہ اقوالِ مزخرف شنوائے مردکِ نادان اندر دہنت شاشئہ عالم۔''

آزاد کے بیان سے متعدد مواقع پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شر انگیزی کی ابتدا انشا نے کی تھی، لیکن انشا کی اس ہجو در بحرِ طویل کے مصرعہ کی رو سے ابتدا کرنے کا الزام مصحفی کے سر جاتا ہے۔ اب آزاد کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا ''حور کی گردن''، ''لنگور کی گردن'' ردیف قافیہ تھا۔ مصحفی نے غزل کہی:

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن نے موے پری ایسے نہ یہ حور کی گردن

اسی زمین میں انشا نے بھی غزل کہی:

آئینے کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے سر خرس کا منہ خوک کا لنگور کی گردن

حاسد تو ہے کیا چیز، کرے قصد جو انشا تو توڑ دے جھٹ بلعمِ باعور کی گردن

اور ایک ہجو یہ قطعہ لکھ کر مصحفی کی زبان میں غلطیاں نکالیں:

سن لیجے گوشِ دل سے مری مشفقانہ عرض مانند بید غصّے سے مت تھرتھرایئے

اس میں مصحفی کی زبان پر جو اعتراضات وارد کیے تھے اُن میں سے ایک یہ تھا:

بَلّور گو درست ہے، لیکن یہ کیا ضرور　　خواہی نخواہی اِس کو غزل میں کھپایئے

یہ محض اعتراض برائے اعتراض ہے، جب خود انشا تسلیم کر رہے ہیں کہ بلّور (تشدید سے) درست ہے پھر اُسے ''غزل میں کھپانے'' پر طعنہ زنی کا جواز کیا ہے؟ اس کے بعد کچھ دوسرے قافیے سمجھائے ہیں کہ دستور، نور، طور وغیرہ بہت سے قافیہ چھوٹ گئے۔ کسی قافیے کا نظم ہونے سے رہ جانا کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ مصحفی نے اس کے لیے یہ وضاحت کردی کہ گردن کے لیے ایک ''شکلِ کشیدہ'' ہونا ضروری ہے اور جہاں وہ نہ پائی جائے وہاں گردن ثابت نہیں کی جاسکتی، اسی لیے اُنھوں نے نور اور طور کی گردن نہیں باندھی۔ پھر انشا کہتے ہیں کہ کافور کی گردن سے مُردے کی باس آتی ہے حالاں کہ خود بدولت اُسے نظم کر چکے تھے:

محفل میں تری شمع بنی موم کی مریم　　پگھلی پڑی ہے اُس کی وہ کافور کی گردن

اس سے آگے بڑھ کر یہ اعتراض کیا ہے کہ نجس، کثیف قافیے لاکر مصحفی نے ''دندانِ ریختہ پہ پھپھوندی جمائی ہے'' چند اشعار یہ تھے:

استاد اگرچہ ٹھیرے ہیں صاحب یوہیں سہی　　لیکن ڈھکی ہی رکھیے بس اِس کو چھپایئے

جھٹ لکھیے روپ رام کٹارا کو ایک خط　　بھلّو کی مُہر سے سند اُس کی منگایئے

اپنی کمک کے واسطے جا بھرت پور میں　　رنجیت سنگھ جاٹ کو ہمراہ لایئے

یا گرد و پیش کے قصباتی جو لوگ ہیں　　اک بلوا باندھیے اُنھیں جلدی بلایئے

سرکار کی یہاں نہیں گلنے کی دال کچھ　　روٹی جو کھانی ہووے تو پنجاب جایئے

خشکا گدھوں کو دیجیے لوزینہ گاؤ کو　　واں جا کے بین بھینس کے آگے بجایئے

مصحفی نے انشا کے اعتراضوں کو رد کرتے ہوئے ایک طویل قطعہ بند اسی زمین میں کہا اور اس میں انشا کی زبان پر جوابی حملے کیے جن میں بعض اعتراض یقیناً وزنی تھے مثلاً مصحفی نے کہا ''نور کی گردن'' کہنا غلط ہے:

گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن   ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک کا پُتلا
بے جا ہے خُمِ بادۂ انگور کی گردن   گردن تو صراحی کے لیے وضع ہے ناداں
تو مجھ کو دکھا دے شبِ دیجور کی گردن   جو گردنیں میں باندھی ہیں لا تجھ کو دکھا دوں

جب یہ معرکہ خوب گرما گیا تو دونوں طرف سے شاگردوں کی فوج بھی میدان میں اُتر پڑی۔ مصحفی کی جانب سے نورالاسلام منتظر اور حیدر علی گرم نے انشا کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ محمد حسین آزاد کہتے ہیں: ''ایک دن سب اکٹھے ہوئے، شُہدوں کا سوانگ بھرا اور ایک ہجو کہہ کر اُس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کی طرف روانہ ہوئے اور مستعد تھے کہ زد و کشت سے بھی دریغ نہ ہو۔ سید انشا کو ایک دن پہلے خبر لگ گئی۔ اب اُن کی طبعِ رنگین کی شوخی دیکھیے کہ مکان کو فرش فروش، جھاڑ فانوس سے سجایا، اور امرائے شہر اور اپنے یاروں کو بلایا، بہت سی شیرینی منگا کر خوان لگوائے، کشتیوں میں گلوریاں، چنگیروں میں پھولوں کے ہار، سب تیار کیے۔ جب سنا کہ حریف کا مجمع قریب آ پہنچا ہے اُس وقت یہاں سے سب کو لے کر استقبال کو چلے۔ ساتھ خود تعریفیں کرتے، سبحان اللہ واہ واہ سے داد دیتے، اپنے مکان پر لائے، سب کو بٹھایا اور خود دوبارہ پڑھوایا، آپ بھی بہت اُچھلے کودے، شیرینیاں کھلائیں، شربت پلائے، پان کھلائے، ہار پہنائے، ہنس بول کر عزت احترام سے رخصت کیا۔ لیکن پھر سید انشا نے جو اُس کا جواب حاضر کیا، وہ قیامت تھا۔ یعنی ایک انبوہِ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گڈا، ایک میں گُڑیا، دونوں کو لڑاتے تھے، زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے، جس کا ایک شعر یہ ہے:

لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن   سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخِ کہن

لیکن اس روایت کا ابتدائی حصہ محض محمد حسین آزاد کی قوتِ متخیلہ کا کرشمہ ہے۔ انشا بہت نازک مزاج انسان تھے۔ تمام تذکرہ نگار اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ہجو کرنے والوں کا

اس طرح استقبال کرنا اُن کی طبیعت اور افتادِ مزاج سے بعید تھا۔ اس کی کوئی سند بھی موجود نہیں ہے۔ خود مصحفی نے سلیمان شکوہ کی خدمت میں جو معذرت کا قصیدہ پیش کیا ہے اس میں سوانگ کا بانی سید انشا کو بتایا ہے۔ بہر حال یہ سوانگ اس ہنگامے کا نقطۂ عروج تھا۔ اس کے علاوہ بھی سید انشا اور اُن کے حامیوں نے سارے شہر میں وہ دُھند مچایا کہ توبہ ہی بھلی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ تھانے تک پہنچا تھا اور فوجداری مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔

اس ہنگامے نے مصحفی کی کمر توڑ دی۔ اُن کی زندگی جو تنگدستی اور پراگندہ معاشی سے پہلے ہی تلخ تھی اب یاس وحرماں کا مرقع بن گئی۔ مخزن الغرائب کے مولف احمد علی خاں سندیلوی نے لکھا ہے کہ: ''چند سال پہلے مصحفی کو ایسا رسوائے کوچہ و بازار کیا کہ اگر غیرت مند ہوتے تو خودکشی کر لی ہوتی۔ بس گدھے پر سوار کرنے کی کسر باقی رہ گئی تھی اور کوئی ایسی ذلت نہ تھی جو اُس بے چارے کو نصیب نہ ہوئی ہو۔'' قاسم اور سرور نے بھی انشا کو ہنگامہ آرا اور شوخ طبع لکھا ہے۔ انشا کی طبیعت میں غوغا بہت تھا۔ خود نواب گھرانے کے فرد تھے۔ درباداری اور پرچانے کے گُر خوب جانتے تھے۔ مصحفی ایک مسکین طبع قصباتی آدمی تھے، اُن کے پاس سوائے استادی اور شاعرانہ مہارت کے کیا رکھا تھا۔ یہ اہل دولت واقتدار کچے کانوں کے تو ہوتے ہی ہیں انشا نے سلیمان شکوہ کو بھی مصحفی سے بدظن کر دیا تھا اور اُنھیں یہ باور کرا دیا تھا کہ مصحفی نے اُن کی ہجو بھی لکھی ہے۔ اس پر مصحفی کو شہزادے سے بھی معذرت خواہ ہونا پڑا:

میں اک فقیر، غریب الوطن، مسافر نام	رہے ہے آٹھ پہر جس کو قُوت کی تدبیر
مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی	اگر میں ہوں، تو مجھے دیجے بدتریں تعزیر
میں آپ فاقہ کش، اتنا مجھے کہاں مقدور	کہ فکر اور کروں کچھ، بغیر آشِ شعیر
مرے حواس پریشاں باین پریشانی	ہو جیسے لشکرِ بشکستہ کی خراب بھیر
گر اس پہ صلح کی ٹھیری رہے تو صلح سہی	اگر ہو پھر بھی شرارت، بشر ہوں میں بھی شریر

مصحفی کا یہ دیوان سوم لکھنؤ میں اُس وقت تیار ہوا ہے جب شہزادہ سلیمان شکوہ لکھنؤ پہنچ کر اپنا دربار جمائے بیٹھے ہیں۔ اسی زمانے میں معرکۂ مصحفی وانشا پیش آیا ہے اس کی ابتدا، جس غزل سے ہوئی ہے (حور کی گردن نور کی گردن) وہ اسی دیوان میں شامل ہے۔ معرکہ سے متعلق کچھ منظومات دیوان قصائد میں بھی ہیں۔

بہر حال یہ ادبی معرکہ بھی اردو شاعری کی تاریخ کو ایک چٹپٹی اور رنگین داستان دے گیا ہے، جسے ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا جاتا رہے گا۔

کلیاتِ مصحفی کے اس پورے منصوبے کی اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان اور اُس کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا تہِ دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

نئی دہلی 22/نومبر 2003

پروفیسر نثار احمد فاروقی

الف

1

کیا دید میں عالم کی کروں جلوہ گری کا
یاں عمر کو وقفہ ہے چراغِ سحری کا

مُردوں کو جلاتی ہے ترے پانو کی ٹھوکر
اس چال پہ مرنا ہے بجا کبکِ دری کا

تربت پہ مری برگِ گلِ تازہ چڑھائے
احسان ہے مجھ پر یہ نسیمِ سحری کا

جو دیکھے ہے نقشے کو ترے، وہ یہ کہے ہے
''سارا بدن انسان کا، چہرہ ہے پری کا''

واقف ہیں مرے حال سے کیا اہلِ شریعت
ویرانے میں کم ہووے گذر رہ گذری کا

کیا لطفِ مقام اُن کو جو آمادۂ رہ ہیں
دل کوچ میں رہتا ہے ہمیشہ سفری کا

داغوں سے مرے بوے ''اگر'' کیونکے نہ آوے
میں سوختہ ہوں اُس کے لباسِ اگری کا

کیا بھیجوں کبوتر کے تئیں، کوچے میں جس کے
جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا

بندہ ہے ترا، مصحفیِ خستہ کو یا رب
محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا

2

کیا غیر کا خطرہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا؟
یہ منھ مجھے تیرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بکتا ہے تُو، جو کچھ کہ ترے آوے ہے منھ میں
بے درد، یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

گر غیر کے ملنے کی صلاح اُس سے میں پوچھوں
چتون میں یہ کہتا ہے کہ ''میں کچھ نہیں کہتا''

بدگوئیاں کرتا ہے مری غیر ہر اک سے
اُس پر یہ اچنبھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

گراس سے کہوں "تو بھی تو کچھ کہہ مرے حق میں"
اُس کا یہ مقولہ ہے کہ "میں کچھ نہیں کہتا"

چپ مجھ کو کیا ہے تری خاموشی نے پیارے!
یہ پاس اِسی کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ مجھ کو سنا جائے ہے سَو، غصے میں آ کر
اور میرا یہ شیوا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اُٹھ جائے تو کیا کیا نہ بکوں، پاسِ ادب سے
تُو سامنے بیٹھا ہے تو میں کچھ نہیں کہتا

ہو جائے ہے بے پردہ وہ ہر ایک کے آگے
یہ طُرفہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

ناحق وہ مجھے گالیاں دیتا ہے، خدایا
تو عالِم و دانا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اے مصحفی، بعضے ہیں مرے کہنے کے قایل
بعضوں نے یہ سمجھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

3

تیشہ فرہاد نے جب سر پہ اُٹھا کر مارا
کیوں نہ شیریں نے یہ سن سینے پہ خنجر مارا

تُو جو گھر غیر کے تھا، چشمکِ بے جا نے تری
چٹکی اک دل میں یہ لی، جیسے کہ نشتر مارا

بس کہ دیوانہ نزاکت کا تری تھا، مجھ کو
گل بھی مارا جو کسی نے تو وہ پتھر مارا

جس کبوتر کو میں خط دے کے وہاں بھیجا تھا
بیچ رستے کے گیا وہ ہی کبوتر مارا

جنبشِ لب نے تری، میری زبان کر دی بند
تو نے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا

میں ادا اُس کی کہوں کیا، مرے مے نوش نے رات
سر پہ ساقی کے، جس انداز سے ساغر مارا

بھڑک اُٹھا میں، نسیمِ سحری تُو نے تو
دامن ایسا ہے مری آتشِ دل پر مارا

مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

4

مجھ سے کہتے ہیں، تُو اس کا آشنا کیونکر ہوا؟
کیا کہوں یاروں سے میں، یہ ماجرا کیوں کر ہوا

چھیڑ تھی اُس کی طرف سے، یا طرف تیری سے لاگ
یہ تو بتلا، دوستی کا ابتدا[1] کیوں کر ہوا

زلف دکھلائی کسی نے، آنکھ گرمائی کہیں
یہ دلِ وحشی گرفتارِ بلا کیوں کر ہوا؟

صبح تک تو پائے گلبن تھی وہ سرگرمِ فغاں
یہ بتا بلبل کا قصہ، اے صبا کیوں کر ہوا

رنجشِ خوباں کو یارو، کیا سبب درکار ہے
پوچھتے کیا ہو کہ وہ تجھ سے خفا کیوں کر ہوا؟

میں بگولے کی طرح پھرنے لگوں ہوں اُس کے گرد
گر کوئی پوچھے ہے تو اُس پر فدا کیوں کر ہوا؟

رنگِ گل کے دیکھتے ہی جس کو چڑھ آتی تھی تپ
اب وہ دل، دیکھوتو، پامالِ حنا کیوں کر ہوا

بے وفا اُس کو کہوں تو، پر یہی آتا ہے سوچ
جور ہے نت چت چڑھا، وہ بے وفا کیوں کر ہوا

میں تو دل سے لب تلک لاتا نہ تھا خواہش کا حرف
چاہیے میرے کا چرچا جا بجا کیوں کر ہوا

آرسی میں رُو نہ دیتا تھا وہ اپنے عکس کو
مصحفی ایسے سے تیرا مدّعا کیوں کر ہوا

5

مجھ صیدِ ناتواں سے مگر عار لے گیا
قاتل مرا جو کھینچ کے تلوار لے گیا

جو خوب رُو ہے اُس کو خریدار ہے ضرور
یوسف کو حسن بر سرِ بازار لے گیا

یہ قتل اُس گلی میں ہوا کل، کہ دستِ جور
لاشوں کا تودہ تا سرِ دیوار لے گیا

کنجِ قفس سے چھوٹ کے پہنچا نہ باغ تک
حسرت یہ جی میں مرغِ گرفتار لے گیا

قسمت تو دیکھ غیر کی، گھر اُس کو مدعی
پوشیدہ کر کے مجھ سے شبِ تار لے گیا

دیکھا جو میں تو دل سے مرے تیر پار تھا
جس دم وہ ہاتھ کو سرِ سوفار لے گیا

اک طرفہ میکدے میں یہ صحبت رہی کہ رات
زاہد کے سر سے مغبچہ دستار لے گیا

ہرگز بکی نہ جنسِ وفا گرچہ مصحفی
سو بار اُس کو میں سرِ بازار لے گیا

1- ابتدا، کو مذکر باندھا ہے۔

6

بے ڈول ہم نے دیکھا شیوہ یہ خوش قداں کا ، دامن اُٹھا کے چلنا انداز ہے کہاں کا

دہقاں جہاں کھڑے تھے خوبانِ کیسری پوش　بونا وہیں روا تھا یہ کشتِ زعفراں کا

جنگل میں ٹیسو پھولا اور باغ میں شگوفہ　فصلِ بہار آئی، موسم گیا خزاں کا

یہ جانتا نہیں میں، واں کیا ستم تھا لیکن　اک غل تو ہو رہا تھا اُس کُو میں الاماں کا

مرغانِ باغ سارے چُنتے پھریں ہیں تنکے　ہم کو بھی اب بنانا لازم ہے آشیاں کا

اک جامِ مے کی خاطر پلکوں سے یہ مسافر　جاروب کش رہا ہے برسوں درِ مغاں کا

جو تجھ پہ ہو گئے ہیں مُنڈوا کے سر قلندر　عالم جدا ہے سب سے اُن سر برہنگاں کا

کیا جانیے عدم کو کس راہ جاتے ہیں یہ　ملتا نہیں ہمیں تو کچھ کھوج رفتگاں کا

یاں تک تو یہ جہاں ہے، یارو بُرا کہ اب تک　شہرِ عدم کا کوئی پھر اس طرف نہ جھانکا

موجِ نسیمِ صحرا ہے آج عنبر افشاں　رخنہ نہ کھل گیا ہو دیوارِ گلستاں کا

صحرائیانِ پورب کیا جانتے ہیں اس کو
اے مصحفی، جدا ہے انداز اس زباں کا

7

نہ پوچھ عشق کے صدمے اُٹھائے ہیں کیا کیا　شبِ فراق میں ہم تلملائے ہیں کیا کیا

ذرا تو دیکھ تو صناعِ دستِ قدرت نے　طلسمِ خاک سے نقشے اُٹھائے ہیں کیا کیا

میں اُس کے حسن کے عالم کی کیا کروں تعریف　نہ پوچھ مجھ سے کہ عالم دکھائے ہیں کیا کیا

ذرا تو دیکھ تو گھر سے نکل کے اے بے مہر　کہ دیکھنے کو ترے لوگ آئے ہیں کیا کیا

کوئی پٹکتا ہے سر، کوئی جان کھوتا ہے　ترے خرام نے فتنے اُٹھائے ہیں کیا کیا

ذرا تو آن کے آبِ رواں کی سیر تو کر　ہماری چشم نے چشمے بہائے ہیں کیا کیا

نگاہِ غور سے ٹک مصحفی کی جانب دیکھ
جگر پہ اُس نے ترے زخم کھائے ہیں کیا کیا

8

نخل لالے کا جب زمیں سے اُٹھا — شعلہ اک دو وَجَب[1] زمیں سے اُٹھا
تو جو کل خاکِ کشتگاں سے گیا — شور اُس دم عجب زمیں سے اُٹھا
بیٹھے بیٹھے جو ہو گیا وہ کھڑا — اک ستارہ سا شب زمیں سے اُٹھا
قد وہ بُوٹا سا دیکھ کہتی ہے خلق — یہ تو پودا عجب زمیں سے اُٹھا
تشنہ صہبائے وصل کا تیری — حشر کو خشک لب زمیں سے اُٹھا
بیٹھ کر اُٹھ گیا جہاں وہ شوخ — فتنہ واں جب نہ تب زمیں سے اُٹھا
سوچتا کیا ہے دیکھ دیکھ اُسے — بن اُٹھائے وہ کب زمیں سے اُٹھا
تھی قضا یوں ہی تیرے کُشتے کی — لاش کو اُس کی اب زمیں سے اُٹھا

گل نہیں مصحفی کا دل ہے یہ
اس کو اے بے ادب زمیں سے اُٹھا

9

بزم میں اُس کی شب اغیار[2] پہنچتا ہوگا — واں تلک کب یہ دلِ زار پہنچتا ہوگا
گوشِ گل تک بھی، خدا جانیے، اے ہم نفساں — نالۂ مرغِ گرفتار پہنچتا ہوگا
ہو گیا دل جو الگ مجھ سے، مرے پہلو سے — اُس کو شاید کہ کچھ آزار پہنچتا ہوگا
بے پر و بال ہے مرغِ دلِ وحشی، صیاد — اُڑ کے کب تا سرِ دیوار پہنچتا ہوگا
اب تلک جیتے رہے ہیں جو ترے زندانی — واں انھیں مژدۂ دیدار پہنچتا ہوگا
دیکھ کر راہ میں کہتے ہیں مجھے بازاری — ''گھر تلک کیونکے یہ بیمار پہنچتا ہوگا؟''
بخت اُس کے ہیں جو جی اپنا جلا کر پیارے — تیری بالیں پہ شب تار پہنچتا ہوگا
تیرے آگے سے قدم اس کے نہ بڑھتے ہوں گے — جس پہ تُو کھینچ کے تلوار پہنچتا ہوگا

1۔ وجَب = بالشت 2۔ اغیار بطور واحد استعمال کیا ہے

حرف ناداں سے نہیں، مغزِ سخن کو میرے
مصحفی ہاں کوئی ہشیار پہنچتا ہوگا

10

دن جوانی کے گئے موسمِ پیری آیا | اِنزوا[1] خوب ہے اب وقتِ حقیری آیا
تاب و طاقت رہے کیا خاک کہ اعضا کے تئیں | حاکمِ ضعف سے فرمانِ تغیری[2] آیا
سبقِ نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے، و لے | نہ اُسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی، جو گئی اپنی نظر | نہ ضمیر اپنے میں اُس وقت ضمیری آیا
ورد پڑھتے جو اُٹھا صبح کو، سب سے پہلے | مکتبِ عشق میں ہونے کو وہ میری آیا
اس کے در پر میں گیا سانگ بنائے تو کہا | "چل بے چل، دور ہو، کیا لے کے فقیری آیا"
پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ ہاں | قیس مارا گیا، وامق بہ اسیری آیا
اے سلیماں، ہو مبارک تجھے یہ شاہی و تخت | تیرا آصف بھی بہ سامانِ وزیری آیا

چشمِ کم سے نہ نظر مصحفی خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

11

گاہ بازو پہ یہ سر، گہ تہِ خنجر دیکھا | راحت و رنج ترے ہاتھوں سے اکثر دیکھا
جو گیا نامے کو لے کر وہ ہوا روزیِ تیغ | واں سے پھرتا نہ کوئی ہم نے کبوتر دیکھا
ایدھر اُودھر سے جو پھرتے ہوئے ہم جا نکلے | کوچۂ یار میں ہنگامۂ محشر دیکھا
قابلِ سیر نہیں بس کہ جہانِ گزراں | جو گیا یاں سے، کبھی اُس نے نہ پھر کر دیکھا
تفرقہ نام سے بھاگے تھا جنھوں کے، اُن کا | کہیں دھڑ، اور کہیں سر، اور کہیں افسر دیکھا
میت اُس در سے گئی میری تو اُس شوخ نے بھی | کبھی پٹ کھول دیا اور کبھی چھپ کر دیکھا

1۔ انزوا = گوشہ نشینی
2۔ تغیری (بروزن نفیری) تبادلہ، برطرفی

جب تلک خوابِ عدم میں تھے نہ تھا مرگ کا ڈر　کھل گئی آنکھ تو قاتل ہی کو سر پر دیکھا

مصحفی کب وہ حیاناک[1] ہوا تجھ سے دوچار
جس نے آئینے کے آکر نہ برابر دیکھا

12

غم کے مارے روز و شب ناچار میں رہنے لگا　کیا کہوں اس غم سے تو بیمار میں رہنے لگا

دھیان کس کا بندھ گیا ایسا جو راتوں کے تئیں　چشمِ انجم کی طرح بیدار میں رہنے لگا

بدگمانی نے ستایا اس قدر مجھ کو کہ آہ　شب کو واں جا کر پسِ دیوار میں رہنے لگا

ہائے کس کافر کو دیکھا، شیخ صنعاں کی طرح　جو گلے ڈالے ہوئے زنار میں رہنے لگا

جس کی صورت آنکھ سے اوجھل کبھی ہوتی نہ تھی　اب اُسی کا تشنۂ دیدار میں رہنے لگا

کس کا سودا بندھ گیا جو چھوڑ کے گھر اپنا آہ　ہو کے سودائی سرِ بازار میں رہنے لگا

دشمنی سے جس کی نکلا کی ہمیشہ دوستی　دوستی سے اُس کی اب بیزار میں رہنے لگا

زندگی سے کر دیا صورت نے کس کی مجھ کو سیر　جان دینے پر جو اب تیار میں رہنے لگا

اے فلک جائے شکایت ہے کہ ہاتھوں سے ترے　اور سب دارم[2] ہوئے نادار میں رہنے لگا

درمیاں میں جب سے دریا اشک کا حائل ہوا　پار[3] وہ رہنے لگے اور وار[4] میں رہنے لگا

کیونکے تنہائی خوش آئے، ہو گیا کیسا بجوگ[5]
مصحفی جو ان دنوں بے یار میں رہنے لگا

13

پیری سے ہو گیا یوں اِس دل کا داغ ٹھنڈا　جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا

سرگرمِ سیرِ گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا　نزلے سے ہو رہا ہے آپھی دماغ ٹھنڈا

1۔ حیاناک = نئی ترکیب　2۔ دارم (فارسی کا واحد متکلم) میں رکھتا ہوں، نادار کی ضد

3۔ پار = اُدھر　4۔ وار = اِدھر　5۔ بجوگ (ہندی) = پریشانی

بلبل کے گرم نالے، جب سے سنے ہیں اُس نے — دیوارِ گلستاں پر بولے ہے زاغ ٹھنڈا
کیا کیا خوشامدی تب پنکھا لگے ہلانے — کُشتی سے جب ہوا وہ کر کے فراغ ٹھنڈا
صرصر سے کم نہیں کچھ، وہ تیغِ تیز جس سے — لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا
کشمیری ٹولے[1] میں ہم جاتے تھے روز لیکن — جی آج ٹک ہوا ہے کر کے سراغ، ٹھنڈا
گرمی کی رُت ہے، ساقی اور اشکِ بُلبلاں نے — ق چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحنِ باغ ٹھنڈا
ایسے میں اک صراحی شورے کی تو لگا کر — لبریز کر کے، مجھ کو بھر دے ایاغ ٹھنڈا

کیا ہم ٹکڑ گدا[2] ہیں جو مصحفی یہ سوچیں
ہے گرم اِس کا چولھا، اُس کا اُجاغ ٹھنڈا

14

تیغ نے اُس کی کلیجا کھا لیا — اس نے آتے ہی مجھے سنگوا[3] لیا
وہ نہیں اب میں، جسے اے مہرباں — آئے جب دو باتوں میں دھمکا لیا
لڑ رہا ہے مجھ سے وہ اس بات پر — نقشِ پا کا میرے کیوں بوسا لیا
دم بہ دم کہتا ہے: "کیا لاؤں شراب؟" — ساقیا لانی ہے تو اُٹھ، جا، لیا

مصحفی یارِ تُو یارِ غیر گشت
بے خبر فکرِ دگر کُن حالیا[4]

15

شب گھر سے جو سیٹی کی وہ آواز پہ نکلا — نکلا تو وہ، لیکن عجب انداز پہ نکلا
مانی نے قلمداں میں رکھا خامۂ مُو کو — خط جب سے ترے لعلِ فسوں ساز پہ نکلا!

1۔ کشمیری ٹولہ = لکھنؤ کا محلّہ 2۔ ٹکڑ گدا (روزمرہ) بھکاری 3۔ سنگوانا = ٹھکانے لگا دینا۔ محمد حسین آزاد نے غلطی سے اسے امرد ہے کا محاورہ سمجھ لیا، اس کی بحث کے لیے ملاحظہ ہو: نثار احمد فاروقی: دراسات، (شائع کردہ مکتبہ جامعہ نئی دہلی) ۱۹۷۸ء میں مضمون "مصحفی کی زبان"۔ 4۔ حالیا = اب

دل مجلسِ خوباں میں جو گم رات ہوا تھا　صد شکر اُسی محرمِ ہمراز پہ نکلا
سو حسن کی تصویریں لکھیں کلکِ قضا نے　چہرہ نہ کوئی پر تری پرداز[1] پہ نکلا
طاؤسی قبا پہنے جو آیا وہ چمن میں　عالم عجب اک اُس بتِ طناز پہ نکلا
کل جس کا میں پامالِ سُمِ رخش[2] تھا وہ شوخ　پھر آج وہِ دل کے تگ و تاز پہ نکلا

اے مصحفی حسن اُس کا جو دیکھے ہے کہے ہے
یہ طُرفہ ستارہ فلکِ ناز پہ نکلا

16

ہو گئے ہیں خاک آ کر، سو رہ نورد اس جا　خضر و مسیح کا بھی پھرنا ہے گرد اِس جا
گل ہائے باغ باہم کھولے ہوئے ہیں دفتر　آتا ہے جی میں پڑھیے اک آدھ فرد اِس جا
تصویرِ کشتگاں سے ہے صفحۂ زمیں پُر　زیں پیشتر ہوئے ہیں کیا کیا نبرد اِس جا
مارا تھا تُو نے جس کو، کوچے کی تیرے مٹی　کہتی تھی یہ ''ہوا تھا وہ کشتہ سرد اِس جا''
تختے پر اس چمن کے، مدِّ نظر[3] ہے کس کو　گل لاکھوں کھل رہے ہیں یوں سرخ و زرد اِس جا
ششدر میں شش جہت کے حیراں ہیں اہلِ دانش　تدبیرِ فلسفہ کی رُکتی ہے نرد[4] اِس جا

باعث ملال کا میں پوچھا جو مصحفی سے
رکھ دل پہ ہاتھ بولا ''ہوتا ہے درد اِس جا''

17

شب نیند کا ماتا تو میاں ہو نہ رہا تھا؟　سر اپنا مرے زانو پہ رکھ سو نہ رہا تھا؟
میں نے ہی نہ چھیڑا تجھے دانستہ وگرنہ　اپنا تو کہیں ہوش بھی تجھ کو نہ رہا تھا
کیا اُس کو دکھاوے گی شبِ گور کی وحشت　اک روز بھی یاروں سے جدا جو نہ رہا تھا

1۔ پرداز (مصوری کی اصطلاح) جسے انگریزی میں Finishing کہتے ہیں۔
2۔ رخش (بہ سکون خ) گھوڑا　3۔ مدِّ نظر ہے کس کو = یعنی دیکھتا کون ہے　4۔ نرد = مُہرہ

اس پر بھی تو میں نے تعبِ عشق اُٹھایا تن میں مرے وہ تاب وتواں گو نہ رہا تھا

اے مصحفی کیوں ہوتا ہے اب گریے کا منکر

اُس کی پسِ دیوار تو شب رو نہ رہا تھا؟

18

دیکھ، آئینے میں اک مہِ تاباں ہے دوسرا تجھ سا ہی تیری شکل کا حیراں ہے دوسرا

آتے ہیں ہر فریق کے لوگ اُس کے در پہ روز اک گبر ہے کھڑا، تو مسلماں ہے دوسرا

پیکاں جو ایک دل سے نکالوں، تو دیکھوں کیا پہلو میں دل کے اور بھی پیکاں ہے دوسرا

اک وضع پر سلوکِ فلک کب ہے سب کے ساتھ گر ایک اس سے خوش ہے، تو نالاں ہے دوسرا

جس سیب کو کہ سونگھ کے یوسف نے جان دی اُس سیب کا یہ سیبِ زنخداں ہے دوسرا

سودے میں لگ چلے ہیں دو دلال اُس کے ساتھ گر ایک کچھ الگ ہے تو چسپاں ہے دوسرا

اک ہاتھ صرفِ سینہ زنی، جس طرح ہوا ماتم میں دل کے وقفِ گریباں ہے دوسرا

پلکوں پہ غش کیا ہے کسی نے گر اک طرف کوچے میں اُس کے کشتۂ مژگاں ہے دوسرا

جس دشت میں کہ ناقۂ لیلیٰ کا تھا گزر اے قیس آگے چل وہ بیاباں ہے دوسرا

صحبت گُتھی ہوئی ہے زبس بزمِ شعر کی گر ایک چپ رہا تو غزل خواں ہے دوسرا

کیا اور مصحفی میں کروں وصفِ لکھنؤ

روے زمیں پہ اب یہ صفاہاں ہے دوسرا

19

میں زمزمہ سنج تھا چمن کا باسا[1] مجھے یاں ملا ہے بن کا

واقف اُس کا ہے عالم الغیب جو مرتبہ ہے مرے سخن کا

پیدا تو کرے سپہرِ گرداں شاعر کوئی اس لب و دہن کا

آگے مرے جو ہیں صاحبِ ہوش زہرہ نہیں اُن کو دم زدن کا

1۔ بن کا باسا = بن باس

کس واسطے اک تو ہوں میں اشعر تس پر مجھے علم بھی ہے فن کا
سمجھا تجھے ہند میں نہ کوئی
عازم ہو تو مصحفی دکن کا

20

انگڑائی لے کر، اپنا مجھ پر خمار ڈالا کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا
شب آسماں سے تارے آنکھیں لگے لڑانے نرگس کا جب گلے میں اُس مہ نے ہار ڈالا
قاتل کی تیغ ابرو دمتی[1] ہے سَو ادا سے بجلی کا جم[2] طمنچہ میں اُس پہ وار ڈالا
جب چل سکا نہ ہم سے بارِ گرانِ ہستی یہ بوجھ ہم نے سر سے آخر اُتار ڈالا
اے مصحفی، نہ آیا میں ان لگاوٹوں میں
اُس کی نگہ نے مجھ پر جادو ہزار ڈالا

21

اُس نے جس دم نیمچہ[3] کر کے علم آگے دھرا قتلِ عالم میں ہلاکو سے قدم آگے دھرا
بھاگتا جاتا ہوں اور ملتی نہیں ہرگز پناہ تو نے مجھ کو خوب اے تیغِ ستم آگے[4] دھرا
جل گئے کتنے مری عزت کو دیکھ اُس بزم میں[5] پیچواں حُقہ جب اُس نے کھول خم آگے دھرا
شعر کہنے کا ہے از بس عشق ہم کو ان دنوں رات دن رہتا ہے کاغذ اور قلم آگے دھرا
میں نے جب چاہا کروں دریافت احوالِ جہاں دیدۂ پُر خوں نے لاکر جامِ جم آگے دھرا
جب برہمن نے لیا بت خانے سے بُت کو اُٹھا ہاتھ سے لے کر میں اُس کے، وہ صنم آگے دھرا
کب تسلی ہووے ہے عاشق کی تیرے، تجھ بغیر گو ورق تصویر کا اک آدھ دم آگے دھرا

1۔ دمنا = لہرانا، چمکنا 2۔ جم طمنچہ میں جم غالباً یم کی بدلی ہوئی شکل ہے یم سنسکرت میں موت کو کہتے ہیں۔ یم دوت = موت کا فرشتہ 3۔ نیمچہ = چھوٹی تلوار، گُپتی 4۔ آگے دھرا = تختۂ مشق بنایا (روزمرہ)
5۔ کسی امیر کے دربار میں کسی کو حقہ پیش کرنا اُس کی عزت و اکرام کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔

اب نہیں پھرنے کا واں سے جیتے جی، اے مصحفی
پانو اس کوچے میں میں کھا کر قسم آگے دھرا

22

ہے کاروانِ رفتہ فراموشِ نقشِ پا | بانگِ جرس کو سن نہ سکے گوشِ نقشِ پا
افتادگانِ وادیِ غربت کی سرگزشت | کرتا ہے خود بیاں لبِ خاموشِ نقشِ پا
رنگِ کفک سے تا نہ ہوا اُس کے ہم کنار | نکلی نہ دل سے حسرتِ آغوشِ نقشِ پا
خورشید و مہ نے بھی ابھی دیکھے نہیں وہ پانو | گردوں ہے جن کی راہ میں مدہوشِ نقشِ پا
اک ناز سے جب اُس نے زمیں پر قدم دھرا | سو منتیں رکھیں بہ سرِ دوشِ نقشِ پا
پہنچے ہے جنس ہی سے یہاں جنس کو شکست | سچ، نقشِ پا ہی ہووے ہے روپوشِ نقشِ پا

کہہ اس زمیں میں اور بھی اے مصحفی غزل
سننے کا جس کو شوق کرے گوشِ نقشِ پا

23

تودے ہوں ایسے کیوں کے فراموشِ نقشِ پا | دیکھے سے جن کے صاف گیا ہوشِ نقشِ پا
میں ناتواں زمیں پہ قدم کیا دھروں کہ ہے | ہستی مری گراں بہ سرِ دوشِ نقشِ پا
تربت پہ میری بھول کر اس نے دھرا تھا پانو | اب تک دعا میں ہیں لبِ خاموشِ نقشِ پا
تلوے بھی ٹک زمیں کو لگا جا، کہ اب تلک | خالی ہے ان کے شوق میں آغوشِ نقشِ پا
کس کی حنائے تازہ کے ہیں فرش پر نشاں | فرّاش اب تلک ہیں جو مدہوشِ نقشِ پا

روندھن[1] میں ہم تو ہو گئے پامال مصحفی
از بس کہ اُس گلی میں ہوا جوشِ نقشِ پا

24

لختِ دل ہے یہ کہ گل برگِ تری کا ٹکڑا | لعل پارہ کہ عقیقِ جگری کا ٹکڑا

1۔ روندھن=پیروں سے رَوندنا، کچلنا

باؤ بندھتی نہیں اب اُس کی چمن میں اے آہ　　کھو دیا تو نے نسیمِ سحری کا ٹکڑا
خوش دماغی سے کٹے عمر، گر ایامِ فراق　　پاس ہو اُس کے لباسِ اگری کا ٹکڑا
اس نے چلمن جو اُٹھا دی تو لگی کہنے خلق　　رتھ میں جاتا ہے غضب یہ تو پری کا ٹکڑا
تیرِ ناوک وہ بنا ٹوٹ کے سینے میں مرے　　رہ گیا لیٹ کے اُس کی جو سری کا ٹکڑا
فرش قالیں تھے سدا جن کے گھروں میں بچھتے　　اب وہ بیٹھے ہیں بچھا در پہ دری کا ٹکڑا
اس کے دولمیان[1] کی خاطر میں لیا مول اُسے　　کوئی بکتا نظر آیا جو زری کا ٹکڑا
میرے گریے سے ہوئی غرق زمیں سرتاسر　　اب نہ خشکی کا کنارہ، نہ تری کا ٹکڑا

معنی چونگے[2] کے تو اے مصحفی مت مجھ سے پوچھ
جانے وہ، کھاوے جو دریوزہ گری کا ٹکڑا

25

عاشق سے نہ ملنے کا سبب کچھ بھی تو ہوگا　　منظور اُسے لطف و غضب کچھ بھی تو ہوگا
بے نام ونشاں ہیں جو پڑے خاک پہ، ان کا　　دنیا میں حسب اور نسب کچھ بھی تو ہوگا
مر جاؤں گا میں، یا وہی جاوے گا مجھے مار　　انجام مرا وصل کی شب کچھ بھی تو ہوگا
ہوتا نہیں کچھ عشق میں اس بت کے مجھے اور　　بدخواہ یہی کہتے ہیں سب، کچھ بھی تو ہوگا
سودا زدہ و وحشی و دیوانہ و مجنوں　　آخر ترے عاشق کا لقب کچھ بھی تو ہوگا
جب جان سے جاؤں گا گزر ہجر میں اس کے　　دل میں اثر اُس شوخ کے تب کچھ بھی تو ہوگا
کیا ہاتھ لگاوے گا تجھے وصل کی شب غیر　　عاشق کا ترے پاسِ ادب کچھ بھی تو ہوگا
جس وقت میں تھا خاک میں، رحمت کو تری ہاے　　اندیشہ مرا، کیوں مرے رب کچھ بھی تو ہوگا

اے مصحفی، جاؤں تو مجھے واں سے عنایت
دشنام ہی یا بوسۂ لب کچھ بھی تو ہوگا

1۔ دولمیان= کمر میں باندھنے والا کیسہ، یہ غالباً ذوالمیان کی عوامی شکل ہے
2۔ چُونگا = چکوتھی، بھانت بھانت کا ذائقہ

26

کون ہے وہ کہ نہیں جان دوانا تیرا　　اب بھی اس حسن پہ گاہک ہے زمانا تیرا
گرمیِ غیر کی باتیں نہ کیا کر مجھ سے　　مجھ کو بھاتا نہیں ہر وقت جلانا تیرا
حسن نے شہرۂ آفاق کیا ہے تجھ کو　　تب تو ہر اک کی زباں پر ہے فسانا تیرا
چین سے کیوں کے میں سوؤں کہ شبِ ہجر مجھے　　یاد آتا ہے وہ راتوں کا جگانا تیرا
قاصد اس کوچے میں بھیجوں تو تجھے میں، لیکن　　مجھ کو مشکل نظر آتا ہے پھر آنا تیرا
تیرے کوچے کی طرف سینے سے اُٹھ دوڑے ہے دل　　اس کو یاد آئے ہے جب آنکھ لڑانا تیرا
ہوگیا کیا یہ بگاڑ آہ کہ مطلق نہ رہا　　روٹھنا تجھ سے مرا، اور وہ منانا تیرا
اب میں اُس دن کو بھی روتا ہوں کہ بےلطف نہ تھا　　بانہہ گہہ گہہ کے[1] وہ در پر سے اُٹھانا تیرا

مصحفی ڈر ہے کہ رسوا نہ کرے تجھ کو کہیں
اس کے کوچے میں یہ ہر وقت کا جانا تیرا

27

جدا جو لیلیٰ کے محمل سے رہ گیا ہوگا　　وہ دُور عشق کی منزل سے رہ گیا ہوگا
عروجِ ماہِ عرب دیکھ کر شبِ معراج　　قمر بھی سیرِ منازل سے رہ گیا ہوگا
تو بیٹھا ہووے گا کشتی میں جب، ترا عاشق　　پٹک کے سر وہیں ساحل سے رہ گیا ہوگا
گرا نہ خاک پہ ہووے گا خونِ بسملِ عشق　　لپٹ کے دامنِ قاتل سے رہ گیا ہوگا
پڑے ہیں در پہ جو اس کے سفال ریزہ بہت　　شکستِ کاسہ یہ سائل سے رہ گیا ہوگا
زمیں پہ خنجرِ برّاں کی تشنگی کے سبب　　نہ قطرہ خوں ترے بسمل سے رہ گیا ہوگا
قفس میں مرغِ گرفتار کا وہ شور نہیں　　پھڑک پھڑک تپشِ دل سے رہ گیا ہوگا

نہ پایا صبح جو میں مصحفی کو جیتا، شب
برونِ در تری محفل سے رہ گیا ہوگا

1۔ بانہہ گہہ گہہ کے = بانہہ پکڑ کے، زور زبردستی سے (عوامی)

28

بالوں کو اس کے دیکھ کے میں مبتلا ہوا
بالوں کا کھولنا مرے حق میں بلا ہوا

زیبائی کا میں خون کی اپنے ہی کشتہ ہوں
لگتے ہی اس کے ہاتھوں پہ رنگِ حنا ہوا

کی مجھ سے رنگی تری زلفِ سیاہ نے
میں رُو سیاہ تب تو ترا آشنا ہوا

میری بھی آرزو تھی یہی تیرے عشق میں
رسوا ہوا، خراب ہوا میں، بھلا ہوا

تو کس طرف چلا ہے مری جاں، ادھر تو دیکھ
جاتا ہے اس گھڑی تو مرا جی چلا ہوا

قالب تہی کیا ہے وہ رخ دیکھ، ماہ نے
یہ اس کے کان میں نہیں بالا پڑا ہوا

رتبہ ہوا کچھ اور ہمارے غبار کا
جوں جوں کہ پایمالِ نسیم و صبا ہوا

لختِ جگر کا اشکِ رواں میں یہ رنگ ہے
دریا میں جیسے جائے ہے مردہ بہا ہوا

قاتل ادائے شکر میں تلوار کے تری
آیا جو زخم سینے پہ دستِ دعا ہوا

کرتا تھا باغ میں جو وہ خوش قد خرامِ ناز
سرو سہی روش پہ کھڑا تھا بچا ہوا

میں کیا کہوں شب اُس بتِ کافر نے مصحفی
کی وہ ادا کہ کام ہی میرا ادا ہوا

29

کھڑا نہ سن کے صدا میری ایک یار رہا
میں رہروانِ عدم کو بہت پکار رہا

قفس سے چھوڑے ہے اب مجھ کو کیا تو اے صیاد
چمن کے بیچ کہاں موسمِ بہار رہا

پس از وفات بھی اپنی ہوئیں نہ آنکھیں بند
زبس کہ تیرے ہی آنے کا انتظار رہا

خدا کے واسطے اب اس سے ہاتھ اُٹھا کہ مرے
جگر میں نم نہیں اے چشمِ اشک بار رہا

ہوا تو غیر سے جب ہم کنار، میرے ساتھ
کہاں وہ وعدہ رہا اور کہاں قرار رہا

کروں جو چاک گریباں کو اپنے، ہوں مجبور
کہ میرے ہاتھ میں میرا نہ اختیار رہا

نہ سیرِ لالہ و گل ہم کو کچھ نظر آئی
کہ نوکِ ہر مژہ پر یاں دلِ فگار رہا

گلی میں اُس کی گئے اور وہاں سے پھر آئے تمام عمر یہی اپنا کاروبار رہا

غزل اک اور بھی اے مصحفی سنا دے تُو
کوئی کہے نہ کہ "بندہ امیدوار رہا"

30

خیالِ یار جو شب میرا ہم کنار رہا تمام شب میں اُسی کے گلے کا ہار رہا
فغانِ بانگ جرس تھی کچھ ایسی درد آمیز قفاے[1] قافلہ کوئی تو بے قرار رہا
میں تیرے ڈر سے نہ دیکھا اُدھر، بہت شبِ وصل ستارۂ سحری مجھ کو آنکھ مار رہا
محیطِ ناقہ ہوئی ایسی خاک مجنوں کی کہ گرد محملِ لیلیٰ کے نت غبار رہا
کبھی جو یوں بھی ملو تم تو مہربانی ہے غرض وہ وصل کا وعدہ تو درکنار رہا
ترے ہی غم کی لگے ہم خوشامدیں کرنے جہاں میں جب کوئی اپنا نہ غم گسار رہا
شبِ فراق میں، خنجر لیے خیال ترا تمام شب مری چھاتی ہی پر سوار رہا
کچھ ایسے ڈھب سے وہ بگڑی کہ پھر نہ سنوری آہ میں بگڑی بات کو اپنی بہت سنوار رہا
ہمارے ہاتھ میں آئے کبھو نہ یا قسمت کہ پانو پر ترے مہندی کا اختیار رہا
یہ میرے برہنہ پانوؤں نے کی خریداری کہ نام کو بھی نہ صحرا میں ایک خار رہا

ملے نہ آکے کبھی مصحفی سے تم افسوس
امیدوار تمھارا امیدوار رہا

31

جب چھپ کے وہ گھر غیر کے مہمان گیا تھا چوری کی نظر میں وہیں پہچان گیا تھا
کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا
جانے کا نہ لے نام، شبِ عید ہے پیارے سن بات مری، میں ترے قربان گیا تھا

1۔ قفا= پیچھے

گھر جاتے ہی عاشق کو ترے کل اجل آئی کوچے سے ترے کہتے ہیں، بے جان گیا تھا
جب تو نے جمائی تھی دھڑی مسّی کی کافر واللہ اُسی دم مرا ایمان گیا تھا
دل پھر وہیں نکلا یہ عجب بات ہے، کل تو کوچے کی ترے خاک بھی میں چھان گیا تھا
مکرائے[1] ہے کیا مجھ کو ڈھٹائی سے وہ کافر ہر چند ابھی میرا کہا مان گیا تھا
گل رکھ کے مری خاک پہ بولا وہ ستم گر لے سونگھ کہ تو سخت پُر ارمان گیا تھا
اے مصحفی، شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

32

سرِ شام اُس نے منھ سے جو رخِ نقاب اُلٹا نہ غروب ہونے پایا، وہیں آفتاب اُلٹا
جو کسی نے قیس[2] ولبنیٰ اُسے لا کے دی مصوّر نہ حیا کے مارے اُس نے ورقِ کتاب اُلٹا
میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اُلٹا
جو ہیں آشنائے مشرب وہ کسی سے ہوں نہ سائل اسی واسطے رہے ہے قدحِ حباب اُلٹا
مہِ چاردہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو اگر اُس نے پردہ منھ سے شبِ ماہتاب اُلٹا
جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شبِ وصل سحر اُٹھ کے میرے آگے وہیں اس نے خواب اُلٹا
بہ سوالِ بوسہ اُس نے مجھے رُک کے دی جو گالی میں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب اُلٹا
کہیں چشمِ مہر اس پر تو نہ پڑ گئی ہو یارب جو نکلتے صبح گھر سے وہ پھرا شتاب اُلٹا
میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے کہ مرے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اُلٹا
کسی مست کی لگی ہے مگر اس کے سر کو ٹھوکر جو پڑا ہے مے کدے میں یہ خمِ شراب اُلٹا
یہ مقام آفریں ہے کہ بزور مصحفی نے
انھیں قافیوں کو پھر سے بہ صد آب و تاب اُلٹا

1۔ مکرانا = مکرنا، بات پلٹنا 2۔ قیس ولبنیٰ (کتاب باتصویر) عشق کی داستان

33

جو پھرا کے اس نے منھ کو بہ قفا نقاب اُلٹا ادھر آسمان اُلٹا، اُدھر آفتاب اُلٹا

نہ قفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجو، صیاد کہ گھڑی گھڑی وہ ہووے دمِ اضطراب اُلٹا

مرے حال پر مغاں نے یہ کرم کیا کہ ہنس ہنس مرے ننگے سر پہ رکھا قدحِ شراب اُلٹا

ترا تشنہ لب جہاں سے جو گیا لحد پہ اُس کی پسِ مرگ بھی کسی نے نہ سبوے آب اُلٹا

مری آہ نے جو کھولی یہ قشونِ اشک، بیرق[1] وہیں برق و رعد لے کر علمِ سحاب اُلٹا

جو خیال میں کسو کے شبِ ہجر سو گیا ہو نہ ہو صبح کو الٰہی کبھی اس کا خواب اُلٹا

مرے دم الٹنے کی جو خبر اُس کو دی کسی نے وہیں نیم رہ سے قاصد بہ صد اضطراب اُلٹا

جو علیؓ کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں بہ گہِ غروب آیا نکل آفتاب اُلٹا

اگر اس میں تو سہ غزلہ جو کہے تو کام بھی ہے
نہیں مصحفی، مزہ کیا جو دو رو کباب اُلٹا

34

یہ دم اس کے وقتِ رخصت بہ صد اضطراب اُلٹا کہ بہ سوے دل مژہ سے وہیں خونِ ناب اُلٹا

سرِ لوح اس کی صورت کہیں لکھ گیا تھا مانی اسے دیکھ کر نہ میں نے ورقِ کتاب اُلٹا

میں عجب یہ رسم دیکھی، مجھے روزِ عیدِ قرباں وہی ذبح بھی کرے اور وہی لے ثواب اُلٹا

یہ اُلٹ گئی ہے قسمت کہ جو دل کسی کو دوں میں وہ مرے ہی سر سے مارے اُسے کر خراب اُلٹا

یہ نقاب پوش ظالم کوئی زور ہے کہ جس نے کیے خون سیکڑوں اور نہ ذرا نقاب اُلٹا

جو بوقتِ غسل اپنا وہ پھرا لے موج سے منھ تو پھراتے ہی منھ اس کے لگے بہنے آب اُلٹا

میں لکھا ہے خط تو قاصد، یہ یہ ہوگا مجھ پہ احساں انھیں پانو آئے گا تو، جو لیے جواب اُلٹا

ترے آگے مہرِ تاباں ہے زمیں پہ سر بہ سجدہ یہ ورق کا گنجفے کے نہیں آفتاب اُلٹا

1۔ بَیرق = جھنڈا، قشون = لشکر

نہیں جائے شکوہ اس سے ہمیں مصحفی ہمیشہ
یہ زمانے کا رہا ہے یوہیں انقلاب اُلٹا

35

اس کے خط میں جو لکھا غیر کا میں نام اُلٹا — لایا قاصد بھی مجھے واں سے تو پیغام اُلٹا
ہیں مسلمانوں سے یاں تک تو یہ ہندو برعکس — کہ کبھی خط بھی جو کرتے ہیں تو ارقام اُلٹا[1]
نہ وہ ساقی نہ وہ مے نوش ہیں مے خانے میں — اب تو رہتا ہے سرِ خم پہ دھرا جام اُلٹا
اک تو سی پارۂ دل تم نے کیا ہے برہم — تس پہ پھر مجھ کو ہی تم دیتے ہو الزام اُلٹا
واژگونی[2] جو طبیعت میں فلک کی ہے ہنوز — نظر آتا ہے زمانہ سحر و شام اُلٹا
شبِ ہجراں کی سیاہی نہ ہوئی روزِ سفید — یہ ورق تو نے نہ اے گردشِ ایام اُلٹا
رسنِ دام کو صیاد نے کھینچا تو وہیں — آن کر سر پہ اسیروں کے گرا دام اُلٹا

مصحفی تو ابھی تھا عزمِ سفر پر تیار
گھر پھرا جائے ہے، کیوں اس کا سرانجام اُلٹا؟

36

پیامِ وصل لا دیتا ہے مجھ کو ہر سحر جھوٹا — نہیں کہتا ہے سچی ایک دن بھی نامہ بر جھوٹا
ستاروں نے اُسی پر انکھڑیاں اپنی لگا دی ہیں — کلابتو[3] کا ہے جو کام تیرے کفش پر جھوٹا
جو سچا ہے تو کر تو خانۂ عقبیٰ کی تیاری — نہ ہو پابند دنیا کا دوانے ہے یہ گھر جھوٹا
کبھی جو غیر کے آنے کا وعدہ اس سے ہوتا ہے — تو سو رہتا ہے وہ اُس رات دے کر قفلِ در جھوٹا
نہیں آتی ہے سچی بانگ بھرنی مرغِ بستاں کو — ابھی بولے ہے طوطے کی طرح یہ جانور جھوٹا
کہا تھا ایک دن میں نے ''میں ظالم تجھ پہ مرتا ہوں'' — مجھے وہ آج تک سمجھے ہے بس اس بات پر جھوٹا

1۔ ارقام کرنا = رقم کرنا، لکھنا (عوامی)   2۔ واژگونی = اوندھاپن، اُلٹا ہونا

3۔ کلابتو = زرتار سے پھول بوٹے بنانے کا کام

نہ گھر جانے پہ ہو تیار، کیسی صبح؟ سن پیارے ابھی تو رات ہے، بولے ہے یہ مرغِ سحر جھوٹا

میں وعدہ وصل کا تجھ سے بھلا باور کروں کیوں کر تری تزئین کا زیور تو دیکھا سر بسر جھوٹا

ترا پھولوں کا گہنا جس طرح جھوٹا ہے، ویسا ہی تری بالی[1] کی لڑیوں کا بھی ہے ہر اک گھر جھوٹا

کہا تھا جان اپنی ساتھ دوں گا سو نہ نکلی وہ

ہوا میں منہ سے اس کے مصحفی وقتِ سفر جھوٹا

37

نہ تعظیمِ مسیحا کو بھی جو بیمار اُٹھ بیٹھا ترے آتے ہی آنکھیں کھول کر یک بار اُٹھ بیٹھا

جو چاہا آخرِ شب کامِ دل میں، کی یہ عیاری مرے سر دھر کے، توڑ اپنے گلے کا ہار اُٹھا بیٹھا

صدائے قُم باذنی[2] سن ترے پانو کی ٹھوکر سے لحد میں کشتہ تیری تیغ کا یک بار اُٹھ بیٹھا

ترے بیمار پر طاقت کی تہمت کی انیسوں نے سہارے سے پکڑ کر گر ذرا دیوار اُٹھ بیٹھا

لیے میں خواب میں بھی اُس کے گر بوسے تو سوتے سے پھرا کر منہ وہیں وہ آتشیں رخسار اُٹھ بیٹھا

ہلایا وصل کی شب گر ہوا نے بھی ذرا در کو میں ہو کر بدگماں لے ہاتھ میں تلوار اُٹھ بیٹھا

پڑا تھا خواب میں شورِ قیامت ایک مدت سے لگی ٹھوکر لگانے جب تری رفتار، اُٹھ بیٹھا

جو آیا غیر کے ہوتے کبھی میں اس کی مجلس میں تو وہ مجلس کے باہر، اس کو چشمک[3] مار اُٹھ بیٹھا

ہوا نے رات دروازے کی یہ صورت رکھی، جس سے تصور میں ترے شب کو میں سو سو بار اُٹھ بیٹھا

میں کچھ اس سے کہا چاہے تھا، جی کی بوجھ کر میرے الگ ہو ہم نشیں سے وہ بتِ عیار اُٹھ بیٹھا

غزل جب دوسری بھی مصحفی ہونے لگی مجھ سے

تو لیٹے لیٹے میں لکھنے کو یہ اشعار اُٹھ بیٹھا

1۔ بالی = زیور کا نام 2۔ قُم باذنی (عربی) = میری اجازت سے اُٹھ بیٹھ، (حضرت مسیح مُردے کو زندہ کرنے کے لیے کہتے تھے) 3۔ چشمک مارنا = آنکھ سے اشارہ کرنا

38

مرے پانووں کی آہٹ سے جو شب دلدار اُٹھ بیٹھا
تو اس دم مدعی بھی بس وہیں کھنکار اُٹھ بیٹھا

اُٹھایا در سے گر درباں نے عاشق کو، تو پھر وہ بھی
اُدھر، دیکھا جدھر کو رخنۂ دیوار اُٹھ بیٹھا

طبیعت قیس کی گر بید کے سایے سے گھبرائی
تو وحشی سا بطرفِ سایۂ کہسار اُٹھ بیٹھا

جو جا سویا میں گاہے چوری چوری اُس کے پہلو میں
تو وہ صوتِ تنفس[1] سے مری، یک بار اُٹھ بیٹھا

گلی میں اس کی یوں خطرے کے مارے شب کٹی میری
جو سویا میں، تو دل پہلو میں ہو بیدار اُٹھ بیٹھا

لگا چلنے جو اک شب رہ کے وہ گورِ غریباں سے
ہر اک مردہ سفر کرنے کو ہو تیار اُٹھ بیٹھا

لحد میں بھی قیامت تیرے کشتے پر رہی، یعنی
اُٹھایا جب فرشتوں نے اُسے، ناچار اُٹھ بیٹھا

پڑی گر خواب میں میری نگاہِ پاک بھی اس پر
تو میں پڑھتا ہوا بستر سے استغفار اُٹھ بیٹھا

کیا تھا حشر پر تو نے تو وعدہ، وائے بے صبری
کہ پیش از حشر تیرا کشتۂ دیدار اُٹھ بیٹھا

پھرانے[2] کا جسے وعدہ دیا تھا تو نے سودے میں
کفن کو پھاڑ وہ مردہ سرِ بازار اُٹھ بیٹھا

1۔ صَوت = آواز تنفّس = سانس 2۔ سودے میں پھرانا = کسی جنس کو معاوضے میں ادا کرنا (عوامی)

سحر ہوتے ہی جو قاصد کا جانا اس کو یاد آیا
تو خط لکھنے کو شب سے مصحفیِ زار اُٹھ بیٹھا

39

واں جن دنوں میں اُس پر عالم شباب کا تھا — یاں، اُن دنوں گھر اپنے ماتم شباب کا تھا
سینے پہ زخم میں نے، کھائے تو تھے، پر اُن پر — سینے سے اک صنم کے مرہم شباب کا تھا
کیوں تو نے اس کو توڑا جڑ پیڑ سے دوانے — انگور پر بھی عالم اے جم شباب کا تھا
عالم کا کیا مرقع کام آئے اب کہ اپنا — پل مارتے ورق ہی برہم شباب کا تھا
تھے جن دنوں کہ ان پر لوگوں کے دم اُلٹتے — ق — اپنا بھی زور عالم، ہمدم شباب کا تھا
سو مثلِ خندۂ گل پھر ہم نے وہ نہ دیکھا — افسوس ہے کہ عرصہ یہ کم شباب کا تھا

اے مصحفی اب اس کے ڈھیلا نہ کیوں کے آتا
پہنا جو تھا وہ اُس نے، محرم شباب کا تھا

40

ناتوانی نے مجھے جب سے نظر بند کیا — تب سے درباں نے مرے گھر کا نہ در بند کیا
آہ جس گھر میں کبھی اپنا گزر تھا، سب نے — کر کے دروازے کو تیغا[1]، وہی گھر بند کیا
میں بھی دیکھے تھا کھڑا، غیر کو خلوت سے نکال — در کو اُس شوخ نے جب وقتِ سحر بند کیا
گم ہے یوسف کی خبر، اُس کے تئیں اخواں[2] نے — چاہِ زندان میں لے جا کے مگر بند کیا
وقتِ خلوت وہ یہ کہتا ہے کہ "میں کہہ دوں گا — تو نے ہاتھوں سے مرے منھ کو اگر بند کیا"
بس کمر ٹوٹ گئی اپنی، سفر سے آکر — غیر کے اُس نے حوالے جو کمر بند[3] کیا
کیوں فلک پر نہیں جاتی ہے مری آہ، اس رات — کیا فرشتوں نے کہیں بابِ اثر بند کیا؟

1۔ تیغا کرنا = کسی دروازے کو مٹی گارے سے بند کرنا 2۔ اِخوان = بھائی (اَخ کی جمع)
3۔ کمر بند = کمر میں باندھنے کا پٹکا

روز نے چار پہر چھوڑ دیا گر ہم کو شب نے زندان میں پھر چار پہر بند کیا

تابداں[1] چھت میں جو تھا اس کی، سمجھ کر اس نے جب لگے جھانکنے نت شمس و قمر، بند کیا

کی کسی نے جو سفارش مری صیّاد سے آہ اُس نے اس ضد سے قفس میں مجھے پر بند کیا

میرے آگے سے گیا وہ، نہ کہا کچھ میں نے منھ کسی نے جو مرا وقتِ سفر بند کیا

مصحفی آبلۂ دل وہیں پھر بہہ نکلا

سو خرابی سے جو میں خونِ جگر بند کیا

41

تیار ہو سفر کو جب یار گھر سے نکلا اسبابِ ہمرہاں بھی دو چار گھر سے نکلا

کج کج قدم کا دھرنا کیا جانے کبکِ کوہی[2] تیری ہی یہ طریقِ رفتار، گھر سے نکلا

دستار و جامہ میرا پایا وہیں سے رنگیں خوں کا مرے، اُسی کے آثار گھر سے نکلا

بانبی کے پاس میں نے جب زلف کا لیا نام مار سیاہ دوں ہی پھنکار گھر سے نکلا

کھدوائی جب زمیں تب کشتوں کی لاشیں پائیں ایسا گھڑنت[3] اُس کے سو بار گھر سے نکلا

صبر و شکیب و طاقت کر ضبط، وہ یوں بولا ''اللہ مال کتنا نادار گھر سے نکلا''

سیرِ چمن نے میرا دامانِ دل جو کھینچا

میں مصحفی یہ پڑھتا اشعار گھر سے نکلا

42

کپڑے نئے پہن کر واں یار گھر سے نکلا یاں چاک کر گریباں، میں زار گھر سے نکلا

در پر سے دیکھ مجھ کو، جھٹ پھر گیا وہ ظالم نکلا جو پھر، تو لے کر تلوار گھر سے نکلا

قسمت مری بُری تھی، کیا پوچھتے ہو یارو میں کیا کہوں کہ کیسے گلزار گھر سے نکلا

1۔ تابدان = چمنی، (کمرے سے دھواں، گرمی خارج کرنے کے لیے) 2۔ کبک کوہی = پہاڑی چکور

3۔ گھڑنت (گڑنت) گڑا ہوا سامان

پھر بن منے بھی میرے، اُس سے بنی نہ ہرگز میں روٹھ روٹھ جس کے سو بار گھر سے نکلا
ٹھٹکا گلی میں اُس کی جس دم مرا جنازہ ہرگز نہ ڈر کے مارے عیار گھر سے نکلا
پٹی کے نیچے پایا تعویذوں کا دفینہ ق کہتے ہیں کل یہ اُس کے اسرار گھر سے نکلا
جادو کیا تھا اُس نے میرے لیے جب اُلٹا اتنی ہی بات پر بس اغیار گھر سے نکلا
روے وطن نہ دیکھا تُو نے جو مصحفی پھر
شاید کہ چھینکتے تُو، اے یار گھر سے نکلا

43

یاس سے لب تک میں آہِ سرد لا کر رہ گیا دل ہی دل میں خونِ دل شب جوش کھا کر رہ گیا
میان سے لی اپنے جب قاتل نے تیغِ آبدار میں سرِ تسلیم زانو پر جھکا کر رہ گیا
در جو صدمے سے ہوا کے کھل گیا یک بارگی رات میں بالیں سے کیسا سر اُٹھا کر رہ گیا
بعد مدت کے ملا مجھ سے جو وہ آئینہ رو میں بھی کیا اُس کی طرف آنکھیں ملا کر رہ گیا
یہ نہیں معلوم مجھ کو کیا خلل واقع ہوا آج پھر اودھر کو قاصد چل چلا کر رہ گیا
کشتہ اس کا جب نہ تڑپا بعدِ قتل، اس نے کہا "واہ واہ کیا خوب تو گردن کٹا کر رہ گیا!"
میں جو نظروں میں کہا اس کو کہ آؤں تیرے پاس؟ وہ بھری مجلس میں اپنا سر ہلا کر رہ گیا
نجد میں پہنچا جو میں مجنوں کے سر پہ وقتِ نزع حی[1] کی جانب کچھ اشارے سے بتا کر رہ گیا
ساتھ سونا اُس کا یاد آیا جو مجھ کو مصحفی
رات میں بستر پہ کیسا تلملا کر رہ گیا

44

جو دم حقے کا دوں بولے کہ "میں حقا نہیں پیتا" بھروں جلدی سے گر سُلفا[2]، کہے "سُلفا نہیں پیتا"
خدا کے واسطے کر تو ہی، ساقی اس کی دلداری کہ میرے ہاتھ سے مے، یارِ بے پروا نہیں پیتا

1۔ حی = (عربی) محلّہ 2۔ سُلفا= چلم میں تَوا نہ رکھ کر تمبا کو پر ہی آگ رکھیں تو اُسے سُلفا کہتے ہیں

اگرچہ مے کدہ معمور ہے لیکن ترا کیفی[1] برنگِ گل بہ جز یک ساغرِ صہبا نہیں پیتا
میں عالی ہمتی کا اس کی بندہ ہوں کہ جو میکش نہیں ملتی جو مے، تو بھنگ اور بُوزا[2] نہیں پیتا
وزیرالملک کا ازبسکہ مے نوشاں پہ قدغن ہے بجائے مے، ہے وہ یاں کون جو کتھا نہیں پیتا
لبِ سوفار میں سرخی کہاں سے اُسکے آئی ہے؟ جو تیرا تیر پیارے خونِ دل میرا نہیں پیتا
کسی نے یہ فسوں کچھ پڑھ کے اُس کافر پہ مارا ہے کہ ان روزوں وہ پانی بھی مرے گھر کا نہیں پیتا
پیے ہے اس طرح دیوانہ مل مل تاک کے پتّے کہ تریاکی بھی یوں افیون کا گھولا نہیں پیتا
کہے ہے مجھ سے یوں ہمدم کہ رُت لاہن کی آئی ہے ولے کیا فائدہ تجھ کو، تو ڈرٹھرّا[3] نہیں پیتا
چلے ہے روز غیروں کے گلے پر تیغِ تیز اُس کی لہو کے گھونٹ کس دن عاشقِ شیدا نہیں پیتا
شرابِ دوستگانی کا قدح رکھ ہاتھ پر اپنے کہا میں نے جو ’پی‘ اُس کو، وہ یوں بولا ”نہیں پیتا“
نہیں ملتا وہ جو شیریں دہن اے مصحفی تجھ کو
تو اُس کے ہجر میں کیوں زہر کا پیالا نہیں پیتا

45

ہمیشہ تم کو میاں ننگ و عار ہم سے رہا ہمیشہ دل میں تمھارے غبار ہم سے رہا
گماں عماریِ لیلیٰ کا جس پہ ہوتا تھا دریغ دور وہ محمل سوار ہم سے رہا
ہم ایسے راہِ خلائق میں ہوگئے پامال کہ خشت تک نہ نشانِ مزار ہم سے رہا
ترے خیال کو بھی شب نہ ہم نے پہچانا اگرچہ دیر تلک وہ دوچار ہم سے رہا
کنارہ جس نے کیا دن کو، شب بہ عالمِ خواب سحر تلک وہی مہ ہم کنار ہم سے رہا
گئے مدار کی چھڑیوں میں ساتھ غیر کے، اور تمام سال یہ دار و مدار ہم سے رہا
قلق میں ہم نے زمین آسمان ایک کیا نہاں گر ایک بھی شب، روے یار ہم سے رہا
کہے ہے دیکھ مرے صیدِ دل کو یوں وہ شوخ ہزار حیف کہ بچ یہ شکار ہم سے رہا

1۔ کیفی = دیوانہ 2۔ بُوزا = گانجا 3۔ ڈرٹھرّا = خانہ ساز شراب

ملایا تجھ سے میں لا کر جسے بہ صد تقریب		ترے ملے پہ، نہ وہ دوستدار ہم سے رہا
زبس کہ عشق میں سیمیں تنوں کے گل کھائے		ہمیشہ داغ دلِ روزگار ہم سے رہا
مہِ دو ہفتہ جو کہیے اُسے تو زیبا ہے		کہ جز دو ہفتہ نہ وہ شوخ یار ہم سے رہا
"اب اپنی جان مجھے دے"، اجل کا صبح تلک		یہی سوال شبِ انتظار ہم سے رہا
کبھی تپ اور کبھی دردِ جگر بتاتے رہے		یہی بہانہ تو لیل و نہار ہم سے رہا

جہاں میں ہم نہ رہے مصحفی، بہ طورِ سلف
اگر رہا تو سخن یادگار ہم سے رہا

46

چھپ کے دو چار دن اُس سے میں جہاں بیٹھ رہا		جی میں کہتا ہے: "وہ کم بخت کہاں بیٹھ رہا"؟
رفتگی دیکھ کہ دیوانۂ رفتار ترا		جا کے کیسا طرفِ آبِ رواں بیٹھ رہا
جا نہ تھی کوچۂ لیلیٰ میں مگر مجنوں کو		نجد میں کر کے معیّن جو مکاں بیٹھ رہا
عشق بازوں میں سپاہی نہیں ہم گنتے اُسے		کھا کے در پر جو ترے ایک سناں بیٹھ رہا
نہ پھرا واں سے، بہت دیر ہوئی قاصد کو		نہیں معلوم وہ رستے میں کہاں بیٹھ رہا
جب مرے نالہ و فریاد نے تاثیر نہ کی		میں بھی تالو[1] سے لگا اپنی زباں بیٹھ رہا
نظر آتا جو نہیں قیس کسی صحرا میں		تکیہ شاید کہ بنا کر وہ جواں بیٹھ رہا
میں بھی کھوجی ہوں ترا، کھوج نکالوں گا تجھے		کیا ہوا، مجھ سے جو تُو ہو کے نہاں بیٹھ رہا
تُو تو سنتا ہے کہاں، عاشقِ مسکیں تیرا		کر کے آخر ترے کوچے میں فغاں بیٹھ رہا

مصحفی سے تو خفا بھی بہت ان روزوں تھا
خوب سمجھا کہ گھر اپنے وہ میاں بیٹھ رہا

47

میاں اس طرف بھی کبھی آیئے گا		ہمیں یا یوں ہی رو رو ترسایئے گا

1۔ تالو سے زبان لگانا=چُپ رہنا (روزمرہ)

کچھ اتنا نہیں کام جی سے گزرنا جو فرمایئے گا تو مر جایئے گا
الجھتی ہیں ہم سے یہ بے پیچ مشفق ذرا اپنی زلفوں کو سمجھایئے گا
چمن کی طرف آج جاتے ہیں ہم بھی کسی گل سے واں جی ہی بھلایئے گا
میں لی مول کنگھی تو پوچھا صبا نے یہ کس زلف کے بال سلجھایئے گا
کبھی از رہِ شفقت و مہربانی ق مرے گھر جو شب باشی کو آیئے گا
توقع پھر آگے بھی مجھ کو پڑے گی جو بندِ قبا مجھ سے کھلوایئے گا
میاں مصحفی یہ زمیں سرسری ہے
غزل اور بھی اس میں فرمایئے گا

48

لحد میں گر اس دل کو لے جایئے گا تو تا روزِ محشر سزا پایئے گا
مزاج اُس کا گر اِس طرف پایئے گا تو آنکھوں سے تلووں کو سہلایئے گا
بھلا ناصحو پوچھتا ہوں میں تم سے مرا چاکِ دل کیوں کے سلوایئے گا
خجل تیرے رو سے ہم ایسے نہیں ہیں کہ محشر میں منھ تجھ کو دکھلایئے گا
وہ شب میرے زانو پہ سر رکھ کے بولا مرے سر سے زانو نہ سرکایئے گا
یہ شب اور بڑھتی ہی جاوے گی، ہے ہے شبِ ہجر میں جوں جوں گھبرایئے گا
پسِ قافلہ قیس آتا ہے کہتا ''ذرا ناقہ لیلیٰ کا ٹھہرایئے گا''
گلی میں تری یہ جو کشتے پڑے ہیں یہیں اُن کی لاشوں کو گڑوایئے گا
میاں مصحفی گریہ اتنا نہ کیجے
نہیں اس کی نظروں سے گر جایئے گا

49

جیتے ہی جی کو خاک کیا میں نے، کیا کیا اپنے تئیں ہلاک کیا میں نے، کیا کیا

حیراں ہوں میں، کہ کیا یہ مرے جی میں آ گئی   کیوں خط کو لکھ کے چاک کیا میں نے، کیا کیا

خنجر پہ اُس کے رات گلا جا کے رکھ دیا   قصہ ہی اپنا پاک کیا میں نے، کیا کیا

پروانہ جل بُجھا پہ نہ یہ شمع نے کہا   ''اس کو جلا کے خاک کیا میں نے، کیا کیا''

خوشوں کے مدھ[1] پہ آتے ہی گلشن میں مصحفی
خوں اپنا[2] زیرِ تاک کیا میں نے، کیا کیا

50

ہے جو گم دریائے اُلفت کا کنارا دوسرا   ایک ڈوبے ہے تو کرتا ہے نظارا دوسرا

نتھ کے موتی یوں ہیں اس کے مہ کے ہالے کے قریب   اک ستارے کے قریں ہو جوں ستارا دوسرا

''ایّھا الرّامی جزاکَ اللہ'' [3] یہی نکلی صدا   دل پہ میرے اُس نے جب اک تیر مارا دوسرا

اب یہ عالم ہے کہ واں رہتا ہے جمگھٹ رات دن   جس کے گھر میں کر نہ سکتا تھا گزارا دوسرا

روزنوں میں اُس کی جالی کے عجائب سیر ہے   ایک جھانکے ہے تو کرتا ہے اشارا دوسرا

آئینے میں دیکھ کہتا ہے وہ اپنے عکس کو   ''تو نے کیوں کر ٹھیک یہ نقشا اُتارا دوسرا''

بس کہ ہیں خوابِ پریشاں میں ترے زندانیاں   ایک چلّایا تو پھر ووں ہی پکارا دوسرا

مصحفی قاتل کا اپنے کشتۂ احساں ہوں میں
قتل کو میرے نہ دیکھا استخارا[4] دوسرا

51

اول تو ترے کوچے میں آنا نہیں ملتا   آؤں تو کہیں تیرا ٹھکانا نہیں ملتا

ملنا جو مرا چھوڑ دیا تو نے، تو مجھ سے   خاطر سے تری سارا زمانا نہیں ملتا

1۔ خوشوں کا مدھ پہ آنا = انگور کی بیل کا تیار ہونا کہ اُس سے شراب کشید کی جاسکے۔ 2۔ یہ بھی رسم تھی کہ انگور کی جڑ کو خون دیا جاتا تھا۔ 3۔ (ترجمہ): اے تیر انداز، شاباش، خدا تجھے جزا دے۔

4۔ دوسرا استخارہ واجب کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

آوے تو بہانے سے چلا شب مرے گھر کو ایسا کوئی کیا تجھ کو بہانا نہیں ملتا؟
کیا فائدہ گر حرص کرے زر کی تُو ناداں کچھ حرص سے قاروں کا خزانا نہیں ملتا
بھولے سے بھی اس نے نہ کہایوں مرے حق میں کیا ہو گیا جو اب وہ دوانا نہیں ملتا
پھر بیٹھنے کا مجھ کو مزہ ہی نہیں اُٹھتا جب تک کہ ترے شانے سے شانا نہیں ملتا
اے مصحفی استادِ فن ریختہ گوئی
تجھ سا کوئی، عالم کو میں چھانا، نہیں ملتا

52

اک تیر میں جب اُس نے نشانا اُڑا دیا اس وقت چٹکیوں میں زمانا اُڑا دیا
سر پیٹتے نہ کیوں کے پھریں اُس کے آشنا دریا کا بھی اب اس نے نہانا اُڑا دیا[1]
عشقِ کبوتراں میں جو دل اس کا پھنس گیا جو آشنا تھا اپنا بگانا اُڑا دیا
مل مل کے کے ہم بھی تب کفِ افسوس رہ گئے جب اُس پری نے رات کا آنا اُڑا دیا
اُس رندِ بادہ دوست کے صدقے میں جس نے یاں قاروں کا ایک دم میں خزانا اُڑا دیا
دستِ جنوں سے جب کہ لگیں اڑنے دھجیاں ہم نے بھی اپنا جیب سلانا اُڑا دیا
اب کون سا فسوں میں کروں دم کہ اس نے تو ہاتھوں سے میرے پان بھی کھانا اُڑا دیا
سیٹی سنی یہ کس کی کہ اُس رشکِ ماہ نے راتوں کا آکے بام پہ گانا اُڑا دیا
اُڑنے لگا[2] جو ہم سے وہ باتوں میں مصحفی
ہم نے بھی اُس کے کوچے کا جانا اُڑا دیا

53

نزع کے دم بھی میں منہ کر کے اُدھر دیکھ لیا مرتے مرتے بھی اُسے ایک نظر دیکھ لیا
صبح ہوتی ہے، وہ بے مہر نہ آیا مرے گھر نالۂ صبح میں تیرا بھی اثر دیکھ لیا

1۔ اُڑادیا = بند کر دیا (عوامی) 2۔ اُڑنے لگا = پہ بچنے لگا

پھر تصور وہیں لے لے گیا راتوں کو مجھے ایک شب خواب میں اُس کا جو میں گھر دیکھ لیا
کر کے رخصت اُسے ہم، گھر کو نہ آئے جیتے منھ پھرا اس نے جو ہنگامِ سفر دیکھ لیا
مچھلیاں آب میں کہتی ہیں یہی غسل کے وقت ہم نے پنڈا ترا، اے رشکِ قمر دیکھ لیا
زخم کھایا جو میں پہلو پہ تو قاتل نے کہا
مصحفی ہم نے ترا آج جگر دیکھ لیا

54

کب میں یاروں کے تئیں دیکھ پکارا نہ کیا پر کسو نے مری تربت پہ گزارا نہ کیا
بیٹھنا پاس تمھیں غیر کے کیا لازم تھا؟ تم نے اتنا بھی میاں پاس ہمارا نہ کیا
کون سی رات وہ آئی کہ تصور سے ترے شیشۂ دل میں پری کو میں اتارا نہ کیا
میں وہ ہوں کشتۂ ناچیز گلی میں اس کی جس کا خورشید نے روزن سے نظارا نہ کیا
داغ چیچک وہ ترا کون سا نظروں نہ چڑھا کہ میں عزت سے اُسے آنکھ کا تارا نہ کیا
کشتۂ خنجرِ تسلیم نے تیرے دمِ نزع طرفِ چشمۂ کوثر بھی اشارا نہ کیا
مجلسِ غیر میں شب اُس نے بلایا تھا مجھے بیٹھنا واں مری غیرت نے گوارا نہ کیا
مصحفی میں تو نہ کہتا غزلِ ثانی لیک
بحرِ معنی سے طبیعت نے کنارا نہ کیا

55

باغ میں گل تجھے کب دیکھ پکارا نہ کیا تجھ کو نرگس نے کب آنکھوں کا اشارا نہ کیا
کل وہ رستے میں تہی کر گئے پہلو مجھ سے اور ڈھٹائی[1] کے سبب میں نے کنارا نہ کیا
کون سی ہجر کی شب آئی کہ میں یار بغیر صبح تک سر در و دیوار سے مارا نہ کیا
رحم کی جا ہے ترے کشتے کا مرنا، جس نے کھول کر آنکھ فلک کا بھی نظارا نہ کیا

1۔ ڈھٹائی = ڈھیٹ ہونا

ننگ و ناموس کو ہم جس کے لیے تج بیٹھے — در تک آنے کا بھی ننگ اس نے گوارا نہ کیا
اُس کی سختی پہ یہ کہتا ہوں کہ کیوں خالق نے — اس طرح دل کو مرے آہن و خارا نہ کیا
تیرے بیمار کو جس دم کہ ہوا دردِ گلو — آبِ خنجر کے سوا اُس نے غرارا نہ کیا
خیر گزری، المِ عشق ڈھلا دل کی طرف — ہم بھی نزدیک تھے، قصد اُس نے ہمارا نہ کیا
مسی آلودہ لب اُس کے ہیں وہ عینِ ظلمات — جس طرف خضر و سکندر نے گزارا نہ کیا
مصحفی کشتہ وہ مظلوم سدھارا جس نے
اپنے قاتل کا تہِ تیغ نظارا نہ کیا

56

دل لبِ زخمِ جگر کا جب کہ تبخالہ بنا — داغ سینے کا لہو میں بھر کے گل[1] لالا بنا
رفتہ رفتہ کی ترقی بس کہ تیرے حسن نے — کان کا بالا ترے، جا چاند کا ہالا بنا
رات شوخی سے مجھے رستے میں آتا دیکھ کر — چھیڑنے کو میرے وہ بدمست متوالا بنا
شیخ جی کا جب ہوا سبزے[2] کی پوتی سے نکاح — ڈومنی گائی بدھاوا ''میرا ہریالا بنا''
حسن کی آرایش ایسی بھی نہ تو آساں سمجھ — لاکھ نتھ ٹوٹیں جب اُس کے کان کا بالا بنا
شیخ کی جورو سے اب کیا لطف گر کیجے (نکاح) — منھ پہ جھریاں پڑگئیں، پیری سے سرگالا بنا
مصحفی کنّئے[3] لیے پھانس اس کے آخر غیر نے
رات دن پیچھے پھرا میں اس کے پنچھالا[4] بنا

57

پہلوے دل میں رات جو اس کا خدنگ تھا — آمد شدِ نفس پہ مرے عرصہ تنگ تھا
آج اس کی خاک پر وہ گیا رخش کیں کُدا — کل جس کے خوں سے دامنِ زیں لالہ رنگ تھا

1۔ گُل لالہ (بدون اضافت) [عوامی] 2۔ سبزے کی پوتی یعنی بھنگ۔ مغربی اتر پردیش میں شادی کے موقع پر دولھا بناتے ہوئے یہ گیت گایا جاتا تھا۔ ''میرا ہریالا بنا'' (بنا = دولھا)
3۔ کنّئے پھانسنا (عوامی) گھیر لینا 4۔ پنچھالا = پیچھے لگنے والا

اک دن میں جا پڑا تھا شکایت کے بحر میں گرداب تھا جو اس کا وہ کامِ نہنگ تھا
بندوق کا اُسی کی نشانہ ہوا یہ دل طفلی میں جس کا زخمِ تیر و تفنگ تھا
رہتا ہے اب وہ قبضۂ شمشیر کیں گہے وہ دن گئے کہ ہاتھ میں ڈور اور پتنگ تھا
اب ہم غلام اور وہ صاحب ہیں یا نصیب ملنے سے جن کے اپنے غلاموں کو ننگ تھا
کیا غم ہے مصحفی جو نصاریٰ میں جا ملا
روزِ ازل سے کشتۂ حسنِ فرنگ تھا

58

عرصہ جہان کا مری وحشت پہ تنگ تھا ہستی سے لے کے تا بہ عدم، اک شلنگ[1] تھا
جب نازکی سے بر میں ترے جامہ تنگ تھا کچھ برگِ گل سے کم نہیں چولی کا رنگ تھا
جس شب تو اپنے گھر سے نہ نکلا تھا تا سحر میری جبیں تھی اور ترے در کا سنگ تھا
چھلنی کیا تھا اُس نے جو تیروں سے سب بدن جس عضو کو چھوا میں وہاں اک خدنگ تھا
خط نامہ بر نے اُس کو مرا کس گھڑی دیا سمجھا نہ یہ کہ ہاتھ میں اُس کے پتنگ تھا
چاکِ قفس سے مرغِ قفس سر نکال کر یہ کہہ کے مر گیا: ''یہ قفس مجھ پہ تنگ تھا''
رسوا ہوا تو چاہ جتا اُس کو مصحفی
خانہ خراب چاہ کا کوئی[2] یہ بھی ڈھنگ تھا

59

مہندی ہے کہ قہر ہے خدا کا ہوتا ہے یہ رنگ کب حنا کا
مَل آئے ہو ہاتھوں سے تم اپنے یا خوں کسی تازہ آشنا کا
پیغام بر آ کے کہہ زبانی پیغام ہی یارِ بے وفا کا
خط لے کے مرا یہ کب گیا، میں دن دیکھوں ہوں قاصدِ صبا کا

1۔ شلنگ = جست، قلانچ 2۔ کوئی فع کے وزن پر باندھا ہے

تم قتل سے ہاتھ مت اُٹھاؤ بدنام ہے نام تا قضا کا
شوخی ہے تمام پھر تو شوخی پردہ اُٹھ جائے گر حیا کا
تلوار کو کھینچ ہنس پڑا وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

60

جب کہ بے پردہ تو ہوا ہوگا ماہ پردے سے تک رہا ہوگا
کچھ ہے سرخی سی آج پلکوں پر قطرۂ خوں کوئی بہا ہوگا
میرے نامے سے خوں ٹپکتا تھا دیکھ کر اس نے کیا کہا ہوگا
گھورتا ہے مجھے، وہ دل کی مرے میری نظروں سے پا گیا ہوگا
یہی رہتا ہے اب تو دھیان مجھے واں سے قاصد مرا چلا ہوگا
جس گھڑی تجھ کو کنجِ خلوت میں پا کے تنہا وہ آ گیا ہوگا
مصحفی اس گھڑی میں حیراں ہوں
تجھ سے کیوں کر رہا گیا ہوگا

61

گلبن تلے جو ضعف سے بلبل نے غش کیا دھڑکا یہ گل کا دل، کہ وہیں گل نے غش کیا
بے حس پڑے ہوئے ہیں جو یوں خفتگانِ خاک اُن کو یہ کس کے طرزِ تغافل نے غش کیا
چھلّوں کو دیکھ پھولوں نے گل کھائے باغ میں جُوڑے پہ تیرے دستۂ سنبل نے غش کیا
جائے گلاب مے ہی چھڑک، اُس پہ ساقیا جس مست کو ہو خندۂ قلقل نے غش کیا
موجِ نسیمِ گل تُو سرکنا پرے ذرا اس وقت مجھ کو نکہتِ کاکل نے غش کیا
کھولے جو اُس نے بیٹھ کے دریا پہ سر کے بال یک بار رہ روانِ سرِ پل نے غش کیا
اے مصحفی خموش کہ اس گفتگو پہ یار
مجلس کو آفرین کی غلغل[1] نے غش کیا

1۔ غُلغل بجائے غلغلہ = شور، ہنگامہ

62

میں ٹک گیا کہ بر دمِ خنجر جگر رکھا
جاتے ہی میرے دل نے یہ کیا کام کر رکھا

جس نیمچے سے کام کیا تھا مرا تمام
ظالم نے نیمچہ وہی زیبِ کمر رکھا

یہ کس کی جستجو تھی کہ جس نے تمام عمر
جوں آفتاب میرے تئیں در بدر رکھا

آنکھوں نے تیری، سرمۂ دنبالہ دار سے
یہ تو بتا، وہ کیا ہے جو مد نظر رکھا

خونِ جگر حوالۂ مژگاں کیا تمام
کچھ تم نے اپنے پاس بھی اے چشمِ تر رکھا؟

اک دن ملے جگہ سے نہ ہم نقشِ پا کی طرح
کیا فائدہ جو جی ہی میں عزمِ سفر رکھا

شب آ کے تیرے سر پہ تصدق ہوئی وہیں
جُوڑا جو تو نے بالوں کا، رشکِ قمر رکھا

چرچا سنا یہ صبح کو یاروں میں جا بجا
گر ایک شب بھی ہم نے اُسے اپنے گھر رکھا

مجروح تھا میں کس کا جو شب مجھ پہ یوں کٹی
بستر پہ اپنا پہلو نہ دو دو پہر رکھا

جراح بن، میں پھاہے کو مرہم کے مصحفی
اِس زخم سے اُٹھایا تو اُس زخم پر رکھا

63

یوں ہے پُر دود ترے سوختہ تن کا کپڑا
شمع پر جیسے ہو فانوسِ کہن کا کپڑا

تیرے بیمار کی حالت یہ دگرگوں ہے کہ آج
لوگ لینے گئے ہیں اس کے کفن کا کپڑا

تم سفر سے جو نہ آؤ تو تسلی کو مری
بھیج دو جلد کوئی اپنے بدن کا کپڑا

جامہ زیبی کو تری دیکھ کے غنچے نے کہا
بر میں گل کے بھی نہیں ایسی پھبن کا کپڑا

دستِ گل خوردہ میں یوں اس کو دکھایا جا کر
جیسے لاتے ہیں نمونے کو چکن کا کپڑا

دامنِ جامہ رکھو، جانِ من اتنا نہ دراز
پہنیے بھی تو زمانے کے چلن کا کپڑا

فرش کیا چاہیے گلشن میں شبِ ماہ کے بیچ
چاندنی آپ ہے یہ صحنِ چمن کا کپڑا

سیوڑوں[1] کے تئیں یاں تک تو ہے پاسِ انفاس
کہ سرکتا ہی نہیں اُن کے دہن کا کپڑا

1۔ سیوڑے = جینی سادھو

اس ادب سے وہ ترا مائلِ سرگوشی ہے — کہ ہر اک برگ ہے اب گل کے دہن کا کپڑا

مصحفی چینِ جبیں سے جو ہمیں نفرت ہے
ہم پہنتے ہی نہیں چین و شکن کا کپڑا

64

ڈھونڈ لاوے تو فلک، خوار و پریشاں مجھ سا — کوئی دنیا میں نہیں بے سر و ساماں مجھ سا

دردِ عاشق کو سمجھتا ہی نہیں ہے بے درد — یا الٰہی کہیں ہوجائے یہ درباں مجھ سا

کعبہ و دیر میں ڈھونڈے جو کہیں لے کے چراغ — تجھ سا کافر نہ ملے اور نہ مسلماں مجھ سا

لب جو سایہ فگن ہو تو کہے وہ بتِ شوخ — "آب میں بھی تو ہے اک سروِ خراماں مجھ سا"

آنکھ جھپکی نہ موے پر بھی مری، واہ رے شوق — سچ تو یہ ہے کہ نہیں آئینہ حیراں مجھ سا

ہو کے شب رو بہ فلک ناز سے وہ کہنے لگا: — "تو نہ ہووے گا کبھی اے مہِ تاباں مجھ سا"

بے خبر قدر مری کر، نہیں پچھتاوے گا — ق — کیونکہ دشوار بہم پہنچے ہے انساں مجھ سا

عقلِ فعّال اگر صرفِ صناعت ہوجائے — تو بھی پیدا نہ کرے گردشِ دوراں مجھ سا

مصحفی گرچہ سبھی مرغِ نواسنج ہیں خوب
باغِ معنی میں نہیں لیک غزل خواں مجھ سا

65

اُس شوخ کا رستہ میں اگر روک کے بیٹھا — تو غیر مری چونپ[1] سے در روک کے بیٹھا

تب اُس نے کہیں اپنی دکھائی مجھے صورت — راہ اُس کی میں جب دو دو پہر روک کے بیٹھا

جب تیغِ جفا شوخ نے عیسیٰ پہ علم کی — خورشید کی منہ پر وہ سپر روک کے بیٹھا

جس گھر میں بلایا میں اُسے شب کو تو دشمن — دو چار کو لے ساتھ، وہ گھر روک کے بیٹھا

مانندِ نگیں لختِ جگر چشم میں میری — آخر رہِ خونابِ جگر روک کے بیٹھا

1۔ چونپ = مخالفت (عوامی)

آیا تری مجلس میں اگر غیر، تو ضد سے آگے کو مرے مدّ نظر روک کے بیٹھا

تا آنے نہ پاوے کوئی اے مصحفی بلبل
موسم میں درِ باغ پہ پر روک کے بیٹھا

66

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا

جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینھ کی بوندیں جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا

جینے کا نہیں کوئی، اگر یوں ہی، عزیزو یہ طفلِ پری زاد ذرا اور بھی چمکا

رخسار تلک اُس کے لگے ہاتھ جو جانے دو دن ہی میں وہ ماہ لقا اور بھی چمکا

ہولی میں ملا منھ پہ عبیر اُس نے تو یارو اُس شوخ کا کچھ حسن و صفا اور بھی چمکا

دھویا نہ گیا خون مرا تیغ سے اس کی کم بخت پہ پانی جو پڑا اور بھی چمکا

اے مصحفی کیا بات کہوں دردِ جگر کی
جوں جوں کہ میں کی اسکی دوا اور بھی چمکا

67

بوئے خوں دیتا ہے مجھ کو کچھ یہ گلشن اے صبا ہے شہیدوں کا یہاں کس گل کے مدفن اے صبا

مَل کے پھولوں کو ہتھیلی میں تُو دیتی ہے اُڑا طبع میں تیری بھی ہے کتنا لڑکپن، اے صبا

اُن مسی آلودہ لب کے کشتگاں کی خاک پر جائے گل کافی ہیں بس دو برگِ سوسن، اے صبا

یہ چراغِ دل ہے دیوانی، چراغِ گل نہ ہو ماریو اس پر سمجھ کر اپنا دامن اے صبا

اِنکو اک گوشے اُٹھا رکھ فصلِ دَے[1] کام آئیں گے۔ ہوگئے ہیں سوکھ کر جو نخل ایندھن اے صبا

یہ ادا تو نے نکالی بے نواؤں کی سی کیا گوندھ کر پہنی ہے جو کلیوں کی سُمرن[2] اے صبا

کیوں عبث خفت اُٹھایا کرتی ہے تو بے شعور تو کہاں اس چال پر، اور اُس کا تو سن اے صبا

1۔ فصلِ دَے = خزاں کے موسم میں 2۔ سمرن = مالا

یاس پر میری تو رو، میں نارسائی پر تری
گُل سے واں لپٹے گئے غرفے کے روزن، اے صبا

کس کے ماتم میں ہوئے ہیں گُل ہزاروں سینہ چاک
بلبلیں کرتی ہیں کس کُشتے کا شیون اے صبا؟

سچ تو کہہ، کیا ماجرا ہے، ان دنوں میرے تئیں
اور آتا ہے نظر کچھ رنگِ گلشن، اے صبا

مصحفی پڑھتا ہے اب اک اور وہ رنگیں غزل
یہ غزل ہے جس کی رنگینی کا بیٹھن[1] اے صبا

68

کیا خوش آوے خاک ہم کو سیرِ گلشن، اے صبا
سینہ جب نرگس کے تیروں سے ہو روزن، اے صبا

ہو گئی بیتابی اپنے دل کی دشمن، اے صبا
ہم نکل کر گھر سے بھولے راہِ گلشن، اے صبا

ڈال کر غنچوں کی مُندری[2] شاخِ گُل کے کان میں
اب کے ہولی میں بنانا گُل کو جوگن اے صبا

ہم اسیرانِ قفس کو تب خبر دی تو نے آہ
لٹ گئے جب باغ میں پھولوں کے خرمن اے صبا

باغ میں کس نے اُڑایا مُٹھیاں بھر بھر گُلال
جو شفق گوں ہو گیا سب صحنِ گلشن اے صبا

خاکِ کوے یار کو کرتا کفن کا میں عبیر
مجھ کو یاد آئی بہت تُو وقتِ مردن، اے صبا

اس کے سو ٹکڑے، تو یاں سو دھجیاں اُس کی بھی ہیں
میں گریباں کا، تو تُو ہے گُل کی دشمن، اے صبا

یہ ادا ہے مرغِ گلشن، موجِ گُل کا ہو اسیر
پانو میں میرے پڑے زنجیرِ آہن، اے صبا

یوں تو میں پھولوں کا گہنا کس طرح بھیجوں مگر
گھر میں اس کے جائے تو خود بن کے مالن، اے صبا

اُس سمن بو کو مرا بہرِ خدا دینے پیام
جائیو تُو، ہو جہاں اس کا نشیمن، اے صبا

ایک تو میں جل رہا ہوں آپ بھی اس کی یاد میں
تس پہ تو اور آگ پر مارے ہے دامن، اے صبا

گُل کا شکوہ کیا کریں ہم اک نہ آنے سے ترے
ہو گیا ہم پر یہ زندان چاہِ بیژن[3]، اے صبا

کن حنائی ہاتھوں کے کُشتے کا ہے گلشن میں عرس
لالہ و گُل کی جو قندیلیں ہیں روشن، اے صبا

1۔ بیٹھن = رنگ کرنے کے لیے پہلے اُس کی زمین بنائی جاتی ہے، پھر رنگ پر رنگ زیادہ چمکتا ہے

2۔ مُندری = چھوٹا آویزہ　3۔ بیژن = داستان رُستم وسہراب کی تلمیح

مصحفی اک جلوۂ دیدار کا ہے منتظر
وقتِ فرصت ہے، اُٹھادے رتھ کی چلمن، اے صبا

69

وقتے کہ ہو گیا ہو اغیار، یار تیرا اپنی بلا کرے ہے پھر انتظار تیرا
یاں سو پری شمائل، صیاد گھات میں ہیں خاطر سے دور رکھیو، میں ہوں شکار تیرا
میں کس طرح سے تجھ کو قابو میں اپنے لاؤں تجھ پر نہ ہووے یک دم جب اختیار تیرا
شاید کہ سرخی اِن کی تو غیر کو دے آیا جو آج ہے زریری[1] رنگِ عذار تیرا
کیسا ہی ہو تو منکر میں خوب جانتا ہوں ق ہے میرے مدعی سے عہد استوار تیرا
پر ہم نے دل ہی اپنا جب تجھ سے لے لیا ہو کناس[2] کیوں نہ ہووے پھر ہم کنار تیرا
مقدور ہو تو تجھ کو میں خاک میں ملا دوں دل میں مرے بھرا ہے یاں تک غبار تیرا
یا رب یہ مدعی کو ہو کر کے سانپ لپٹے اک دن مری طرف سے پھولوں کا ہار تیرا
غیرت کے پاسباں یاں چاروں طرف ہیں بیٹھے اب دل میں میرے کیونکر ہووے گزار تیرا
اس تیری فاسقی سے جاتا رہا وہ بالکل بس تھا جو اپنے آگے کچھ اعتبار تیرا
بے ہوش مصحفی اب کوئی تجھ سے لگ چلے ہے
وقتے کہ غیر سے ہو ملنا شعار تیرا

70

ہے ہے ترا سر جھکا کے چلنا پھر شرم سے مسکرا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھلکھلانا اور راہ میں منھ بنا کے چلنا
سیکھے ہو یہ کس سے جان میری برقعے[3] میں بدن چھپا کے چلنا

1۔ زریری = اک گھاس جس سے رنگتے ہیں، مراد پھیکا، زردی مائل۔ 2۔ کناس = جھاڑو دینے والا
3۔ برقعے میں عین ساقط کر دیا ہے۔ (روزمرہ)

ہے قہر، کہ دیکھ مجھ کو پیچھے　پھرتی سے قدم اُٹھا کے چلنا
نیچی آنکھوں سے دیکھنا ہائے　پر تس پہ نظر چُرا کے چلنا
اس اتنی حیا پہ، پھر یہ شوخی　بازار میں پان کھا کے چلنا
آئے ہو جو خاکِ مصحفی پر
دامن یاں سے اُٹھا کے چلنا

71

پانی بھرے ہے، یارو یاں قرمزی دوشالا　لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا
کاندھے پہ مشک لے کر جب قد کو خم کرے ہے　کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا
دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں　لنگی کے رنگ سے واں جب تا کمر ہو لالا
گرمی سے کیونکے میرے وہ دل کو چھل نہ جاوے　چاہِ ذقن نے جس کے پیاسوں کو مار ڈالا
اے مصحفی بہشتی سننے نہ آئیں کیونکر
اس ریختے میں تو نے عالم نیا نکالا

72

میں اِکدم چین سے رستے میں اُس گل کے کہاں بیٹھا　کبھی اُٹھ کر یہاں بیٹھا، کبھی اُٹھ کر وہاں بیٹھا
صبا گر جائے تُو کوچے میں اُس کے اتنا کہہ دیجو　تمھاری راہ دیکھے ہے کوئی مسکیں جواں بیٹھا
نہ کیونکر ہاتھ سے ماتھا پکڑ کر بیٹھ جاؤں میں　کہ میرے سر پہ بامِ چرخ سے سنگِ گراں بیٹھا
اُٹھا لیویں گے جب ہم آشیانہ اپنا گلشن سے　خوشی سے کیجو رنگ رلیاں تُو پھر اے باغباں بیٹھا
نہ دی ساقی نے مجھ کو لای مے[1] بھی وائے بے قسمت　رہا میں گرچہ اکثر بر درِ پیرِ مغاں بیٹھا
تصور میں تری رفتار کے، میں موجِ دریا کا　تماشا دیکھتا ہوں بر لبِ آبِ رواں بیٹھا
پھرایا دھوپ میں مجھ کو سدا گردش نے طالع کی　میں کس دن باغ میں جا زیرِ تاکِ گلستاں بیٹھا
کہیں کیا، مرتے مرتے بھی یہی حسرت رہی ہم کو　کہ بالیں پر ہمارے تُو نہ اے آرامِ جاں بیٹھا

1۔ لائے مے = شراب کی تلچھٹ

کچھ اس کوچے میں جاتے ضعف نے یہ آن کر گھیرا
کہ ہر ہر گام پر سو سو جگہ یہ ناتواں بیٹھا

مجھے رحم آئے ہے حسرت پہ آہ اس مرغِ بے پر کی
کہ اُڑ سکتا نہ ہو اور ہو بہ زیرِ آشیاں بیٹھا

نہ تنہا مصحفی ہی اس کے ہاتھوں سے ہے آوارہ
کوئی بھی چین سے، یارو بہ زیرِ آسماں بیٹھا؟

73

میں نے بھی تیرے عشق میں کیا کیا نہیں کیا
سب کچھ کیا ہے، پر تجھے رسوا نہیں کیا

مجنوں و کوہ کن کو بھی پہنچی ہے یہ خبر
کس کس نے میرے عشق کا چرچا نہیں کیا

پردے میں اک ادا پہ تری، بک گیا ہوں میں
کچھ میں نے دیکھ بھال کے سودا نہیں کیا

غرفے سے سر نکال کے ظالم تُو ہٹ نہ جا
سینے کا تیرے میں نے تماشا نہیں کیا

شب کونسی وہ گزری ہے تجھ بن کہ تا بہ صبح
زانو پہ سر کو رکھ کے میں رویا نہیں کیا

دیکھا ہے میرا حالِ تباہ اُس نے لاکھ بار
پر یہ عجب ہے اس کا اچنبھا نہیں کیا

حسنِ سلوک دیکھ کہ کچھ جی میں سوچ کر
عاشق سے اُس نے وعدۂ فردا نہیں کیا

میں وہ مریض ہوں تری چشمِ سیاہ کا
جس نے کبھی علاجِ مسیحا نہیں کیا

آزردہ مصحفی سے عبث ہوتے ہو میاں
اس نے کہیں تمھارا تو شکوہ نہیں کیا

74

تری کُو میں اس بہانے ہمیں دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اُس سے بات کرنا

تجھے کس نے روک رکھا، ترے جی میں کیا یہ آئی
کہ گیا تُو بھول ظالم اِدھر التفات کرنا

ہوئی تنگ اُس کی بازی مری چال سے، تو رخ پھیر
وہ یہ ہمدموں سے بولا کوئی اس کو مات کرنا

جو ملے بھی وہ، تو مجھ سے نہ ہو فعلِ زشت سرزد
یہ دعا قبول میری، مرے پاک ذات کرنا

یہ زمانہ وہ ہے جس میں ہیں بزرگ و خُرد جتنے
انھیں فرض ہو گیا ہے گلۂ حیات کرنا

جو سفر میں ساتھ ہوں ہم، تو رہے یہ ہم پہ قدغن　　کہ نہ منھ کو اپنے ہرگز طرفِ قنات کرنا

یہ دعائے مصحفی ہے جو اجل بھی اُس کو آوے
شبِ وصل تو تُو یارب، نہ شبِ وفات کرنا

75

دیکھ اُس سروِ رواں کے بر میں کم خوابی قبا　　آسماں نے اپنی لے تہ کر رکھی آبی قبا

کس نے رستم افگنی کا آ کے یاں دعویٰ کیا　　چرخ نے خوں میں بھری جس کی نہ سہرابی قبا

ٹک سیہ رو شیخ کا یارو تمغل[1] دیکھیو　　جیسے آتا ہے پہن کر کوئی پنجابی قبا

دیکھ کر عالم ترے اس دستِ فندق بند کا　　چاک کر ڈالی گلِ فندق نے عُنابی قبا

آستین و دامن اس قاتل کا ہے جو شور بور　　خوں سے کس بسمل کے یہ رکھتی ہے سیرابی قبا

چرخ پر لالے شفق کے یہ نہیں اے مصحفی
بر میں اس سفاک نے پہنی ہے قصابی قبا

76

ہر عضو میں ہو جس کے اک دل بری کا نقشا　　نقشے کو کیوں نہ کہیے اُس کے پری کا نقشا

تیزیِ کلکِ مانی ٹک جا کے دیکھتے ہیں　　کھینچا ہے اُس نے تیری جولاں گری کا نقشا

کر داغ سے تو پیدا مُہرِ نبوت اے دل　　جس سے درست بیٹھے پیغمبری کا نقشا

جادوگری ہی اُس کے ہر عضو میں بھری ہے　　ہے سر سے پانو تک وہ جادوگری کا نقشا

رنگِ کفک کا تیرے کچھ رنگ لے کے مانی　　دلچسپ کھینچ لایا کبکِ دری کا نقشا

مانندِ نقشِ دیبا تنہا پڑے رہے ہم　　اک شب کبھی نہ ٹھہرا ہم بستری کا نقشا

ہم خاک میں ملیں تو قمری تجھے دکھا دیں　　اُس سرو کے لباسِ خاکستری کا نقشا

میں نقشِ روے خوش پر دیتا ہوں جان اپنی
اور مصحفی جما ہے یاں بے زری کا نقشا

1۔ تمغل = مغل بننے کی کوشش

77

بیمار کا ترے جو بدن رعشہ دار تھا　　دیکھا تو بعد مرگ کفن رعشہ دار تھا
موتی سے جنبش اُس کے بنا گوش کو نہ تھی　　شبنم کے ساتھ برگِ سمن رعشہ دار تھا
دل میں نہ تھا جو چور تو کیوں اُس کے سامنے　　لکنت سے شب زباں پہ سخن رعشہ دار تھا
بہتا پھرے تھا جو مرے دریائے اشک میں　　شب ماہِ چاردہ کا لگن رعشہ دار تھا
تھی رات طرفہ سیر کہ غبغب کی موج پر　　ہر لحظہ اُس کا سیبِ ذقن رعشہ دار تھا
آ کر کھڑا ہوا تھا جو وہ جویبار پر　　پانی میں عکسِ سروِ چمن رعشہ دار تھا
صید اس کا جان توڑے تھا اک سمت دشت میں　　اور اک طرف وہ صید فگن رعشہ دار تھا
ہم خوابگی سے "نل" کی وہ آتی تھی شب مگر　　ہر گام پر جو پائے "دمن" رعشہ دار تھا
شیرِ خدا کے پنجۂ دہشت سے مصحفی
دیکھا تو دستِ چرخِ کہن رعشہ دار تھا

78

میدانِ عشق سے جو میں کھا کر قسم بڑھا　　نالہ بھی میرے ساتھ ہی لے کر علم بڑھا
پسلی کا تھا مرض[1] جو مرے طفلِ شعر کو　　جھاڑا[2] تو رام سر[3] کی طرح سے قلم بڑھا
دوڑا میں جس قدر کہ بیابانِ عشق میں　　دوڑے سے اُس قدر ہی مرا اور دم بڑھا
صحرائے کشتگانِ محبت کو دیکھ کر　　میں یہ ڈرا کہ واں سے نہ آگے قدم بڑھا
سبزے میں جس کے گم کرے نظارہ راہِ حسن　　اتنا بھی اپنے خط کو نہ تو اے صنم بڑھا
کیا کیا نہ سرکشوں کی یہ عیّار آسماں　　پگڑی اُتار لیوے ہے، دستِ ستم بڑھا
ڈر ہے مجھے کہ دیکھ کے اُس شمعِ حسن کو　　شیخ الحرم نہ دیوے چراغِ حرم بڑھا[4]
جوں جوں گھٹا میں عشق کی کاہش سے مصحفی
ووں ووں بہ رنگِ شمع مرا داغِ غم بڑھا

1۔ پسلی کا مرض= ذات الجنب　2۔ جھاڑنا، دعائیں وغیرہ پڑھ کر جھاڑنا
3۔ رام سر= ایک درخت کا نام　4۔ چراغ بڑھانا = گُل کرنا

79

یاں سے گئے پہ گرچہ پھر آیا نہ جائے گا پر یاں کا لطف بھی تو بھلایا نہ جائے گا
پُتلا ہے یہ جو آدم خاکی کا اے فلک مت توڑ اسے، کہ تجھ سے بنایا نہ جائے گا
اے گل! سہیں گے ہم تری باتیں ہزار لیک ہم سے دماغِ غیر اُٹھایا نہ جائے گا
کھاویں گے ٹانکے زخمِ سرو رُو پر اے طبیب پر زخمِ دل تو ہم سے سلایا نہ جائے گا
رنگِ حنا کو دیکھ ترے بول اُٹھا پتنگ اس آگ میں تو جی کو جلایا نہ جائے گا
یا رب نہ روزِ حشر اُٹھانا ہمیں کہ ہائے منہ ہم سے دوستوں کو دکھایا نہ جائے گا
کوشش کریں ہیں ہم کہ چھپاویں یہ رازِ عشق ہر چند جانتے ہیں چھپایا نہ جائے گا

سوئے جو ایکے تان کے چادر کو منہ پہ ہم
اے مصحفی کسی سے جگایا نہ جائے گا

80

ملنا ہمارے ساتھ صنم عار کچھ نہ تھا تم چاہتے تو تم سے یہ دشوار کچھ نہ تھا
سن کر کے واقعے[1] کو مرے اُس نے یوں کہا کیا سچ ہے یہ، وہ اتنا تو بیمار کچھ نہ تھا
میری کشش سے آپ عبث مجھ سے رک رہے روٹھا تھا یوں ہی، جی سے میں بیزار کچھ نہ تھا
بے کل رکھے تھی لاگ طبیعت کی رات دن ہر چند اس سے مجھ کو سروکار کچھ نہ تھا
کٹتا نہ کیونکے دیکھ کے ابرو کی چیں کو میں یہ خطِ تیغ تھا، خطِ زنّار کچھ نہ تھا
یا رب شبِ فراق کی کیا بے کسی کہوں صبر و قرار و خواب کا آثار کچھ نہ تھا
اک بوسہ چاہتا تھا تصور کے لب سے جان ق میں جنسِ حسن کا تو خریدار کچھ نہ تھا
پر حیف تم سے اتنی بھی ہمت نہ ہو سکی اس میں زیانِ خوبیِ رخسار کچھ نہ تھا

ظالم نے کیا سمجھ کے کیا مصحفی کو قتل
یارو وہ اس قدر تو گنہگار کچھ نہ تھا

1۔ واقعہ = موت (روزمرہ)

81

یوں تو کیا مجھ سے مہ جبیں نہ ملا ، بات کہنے کا ڈھب کہیں نہ ملا
جس سے ہم اپنا دردِ دل کہتے کوئی ایسا تو ہم نشیں نہ ملا
بل بے کُہنی کی تیری گدراہٹ جس سے یہ چاکِ آستیں نہ ملا
مَل چکا یار خاک میں مجھ کو اب تو اے آہِ آتشیں نہ ملا
مصحفی لختِ دل کی قدر ہے اور
ہر نگیں سے تو یہ نگیں نہ ملا

82

قتل کرتی ہے بتاں کے مسکرانے کی ادا قہر ہے، آفت ہے تس پر کھلکھلانے کی ادا
سر کو دے دے مارتا ہوں میں درودیوار سے یاد آتی ہے جب اس کے جھانک جانے کی ادا
کیوں عبث شکوہ کریں اس کا کہ ہم لوگوں کے ساتھ بے ادائی ہے ہمیشہ سے زمانے کی ادا
دل پہ صدمہ سا گزر جاتا ہے جب آتی ہے یاد دورِ دامن پر ترے ٹھوکر لگانے کی ادا
پھر بھی اک باران کی جانب دیکھ لے کافر جو لوگ مر گئے ہیں دیکھ تیرے منھ پھرانے کی ادا
غیر سے گرمی لگے کرنے ہمارے روبرو یہ نئی تم نے نکالی جی جلانے کی ادا
بجھ گئے پھولوں کے تختے دیکھ کر یک بارگی سیرِ گلشن میں ترے دامن اُٹھانے کی ادا
دل میں روزن پڑ گئے ہیں جب سے دیکھی ہے میں آہ روزنِ در سے تری آنکھیں لڑانے کی ادا
کیوں نہ روز اس کا سیہ ہو جس نے دیکھی ہو تری آرسی لے ہاتھ میں مسّی لگانے کی ادا
لطف سے خالی نہیں ہے روٹھ جانے پر مرے ہاتھ رکھ سر پر، تری سوگند کھانے کی ادا
جوش کھایا خوں نے اور منھ تک جگر آیا مرا یاد آئی جب کسی کے پان کھانے کی ادا
ان کے ہاتھوں سے کوئی جاں بَر ہو کیونکر مصحفی
قہر ہے خوباں کی یہ مہندی لگانے کی ادا

83

شانہ کرتے جو وہاں زلف کا مُو ٹوٹ گیا
زخمِ سینہ کا مرے تار رفو ٹوٹ گیا

دے کے ساقی نے مجھے شیشۂ مے، ہنس کے کہا
تجھ سے سمجھوں گا جو یہ شیشہ کبھو ٹوٹ گیا

یار سے اپنے وہ کہتا ہے بہ ہنگامِ شکست
ایسی کیا تجھ پہ بلا آئی جو تو ٹوٹ گیا

ٹوٹتی شیشے کی گردن، تو نہ تھا اتنا غم
غم تو یہ ہے کہ بطِ مے کا گلو ٹوٹ گیا

مجھ پہ ہوتا ہے تو کیوں زخم لگا کر برہم
نیمچہ کب ترا اے عربدہ جو ٹوٹ گیا

بے نصیبی کا گلہ ہے کہ ہم اس دم پہنچے
گر کے جب ہاتھ سے ساقی کے سبو ٹوٹ گیا

مصحفی خوب ہوا یہ کہ کشاکش میں بہم
رشتۂ الفتِ یارانِ دو رو[1]، ٹوٹ گیا

84

اس کے کوچے میں نہ میں یوں ہی چلا جاؤں گا
اب کے جاؤں گا تو کچھ سانگ بنا جاؤں گا

مثلِ خورشید لبِ بام ہوں پل کا مہماں
شام کے ہوتے تو میں منہ ہی چھپا جاؤں گا

شوق سے تیغ لگا مجھ پہ کہ ہوں سینہ سپر
وہ نہیں میں کہ ترا وار بچا جاؤں گا

کیونکے گھر غیر کے جاوے گا تو، دیکھوں تو سہی
اب کے چوکی[2] میں کوئی تجھ پہ بٹھا جاؤں گا

خواب میں آ کے زلیخا سے کہا یوسف نے
یوں ہی صورت میں کبھی پھر بھی دکھا جاؤں گا

ہاتھ آئی جو قلق میں، مرے ہیرے کی کنی
اب کے ٹھانی ہے یہی اُس کو میں کھا جاؤں گا

گل کہے ہے مجھے کھانے دے ہوا گلشن کی
کیا شتابی ہے، رہ اے بادِ صبا جاؤں گا

وعدۂ وصل کا دیتا ہے تو مجھ کو ہی فریب
سچ ہے میں ہی تو تری باتوں میں آ جاؤں گا

مصحفی گر وہ بشاشت سے سنے گا مرے شعر
حالِ دل کہہ کے دو غزلہ میں سنا جاؤں گا

1۔ یارانِ دو رُو = منافق دوست 2۔ چوکی = بمعنی چوکیدار

85

نالہ کرتا جو ترے کوچے میں آ جاؤں گا فتنۂ روزِ قیامت کو جگا جاؤں گا
ہو نہ آزردہ تو رہنے سے مرے اس کو میں ہوں مسافر، میں کوئی دم کو چلا جاؤں گا
نہ ستا مجھ کو بہت، مان کہا اے کافر ورنہ یکبار قسم تجھ سے میں کھا جاؤں گا
آنے جانے سے مرے گر تو برا مانے ہے اب کے آؤں گا تو قضیہ[1] ہی چکا جاؤں گا
نظر آتا ہے کہ اک روز میں اس گلشن سے خاک اُڑاتا ہوا مانند صبا جاؤں گا
میں وہ بیمارِ محبت ہوں کہ مرتے مرتے سیکڑوں مرغِ گرفتار چھڑا جاؤں گا
اب کے اس باغ سے نکلا تو قسم ہے گل کی آشیاں اپنے کو میں آگ لگا جاؤں گا
نکلے ہے کبک کی چتون سے، ترے وقتِ خرام رفتہ رفتہ میں یہ رفتار اُڑا جاؤں گا

ہے یقیں پھر غمِ اعدا نہیں رہنے کا مجھے
مصحفی سایۂ ''آصف[2]'' میں جو آ جاؤں گا

86

جب دن دَہوں[3] کے اس نے گہنا اُتار رکھا ماتم میں حسن کے میں دل کو فگار رکھا
وہ سادگی کا عالم کس طرح جی سے بھولے آئینہ رات اور دن جس نے دو چار رکھا
پیارے کئی محرّم گزرے اسی طرح سے تم نے تو یوں ہی ہم کو امیدوار رکھا
اک صید کے گلے پر پھیری چھری نہ اُلٹی اِس کو شکار رکھا، اُس کو شکار رکھا
گر زلف و خال و خط بھی ہوتا تو قہر کرتے اس سادگی پہ تم نے عالم کو مار رکھا
تم پاس آ کے مجھ کو بوسہ ہی اک الگ دو لو وصل کے مزے کو میں درکنار رکھا

تم ساتھ مصحفی کے واں سو رہے خوشی سے
دل کے قلق نے مجھ کو یاں بے قرار رکھا

1۔ قضیہ = جھگڑا، اختلاف کا سبب (بروزن رَسیا) (روزمرہ) 2۔ نواب آصف الدولہ (وزیر اودھ)

3۔ دَہوں کے دن = ایّامِ عزا (عاشوراء)

87

اک دن حنا گئی جو بہ سیرِ فرنگِ پا　　دیکھا وہاں شگفتہ تر از لالہ رنگِ پا
ایسے کہاں نصیب ہیں میرے کہ بعد مرگ　　چھاتی مری ہو اور ہو اُس بت کا سنگِ پا
اُس دشتِ پُرخطر کا مسافر ہوں میں کہ ہائے　　ہر نقشِ پا جہاں ہے وہاں ہے نہنگِ پا
فصلِ بہار آئی ہے، زنجیر سے نکل　　اب اے جنوں نہیں ہے مناسب درنگِ پا
سبزے پہ میری قبر کے کیونکر رکھے وہ پانو　　مخمل کے فرش کو جو سمجھتا ہو تنگِ پا
اے کاش ایک دن دلِ مجنوں کے آبلے　　اکٹھے[1] ہو ہوویں ناقۂ لیلیٰ کے زنگِ پا
قضیہ یہ مل کے سونے میں نکلا کہ تا سحر　　سوتے میں میری اس کی رہی رات جنگِ پا
دیوانگانِ عشق کی وحشت میں کیا کہوں　　سیکھے ہیں جن سے آہوے صحرا شلنگِ پا
دشتِ جنوں سے رات میں آگے نکل گیا　　مستی میں لے گئی جو اُدھر کو ترنگِ[2] پا
اے مصحفی سمجھیے کہ دل دادہ ہے وہ شخص
پیدا کرے جو دفعتہً اس کو میں لنگِ پا

ب

88

غیر کے ساتھ تری گرمیِ بازار ہے خوب　　میں سنا ہے کہ تجھے اس سے سروکار ہے خوب
دیکھ کر میری طرف کل وہ لگا یوں کہنے　　میں جو سنتا تھا یہی میرا خریدار ہے، خوب!
جس میں اک آدھ گھڑی تیرا تصور بندھ جائے　　شبِ مہتاب سے ہم کو وہ شبِ تار ہے خوب
دیکھ کر خطِ شعاعی کی طرف وہ بتِ شوخ　　ہنس کے بولا کہ مرا طرۂ دستار ہے خوب
گلِ نسرین[3] و شقائق[4] ہیں کھلے چار طرف　　کوئی دم ٹھہرو تو صاحب یہ چمن زار ہے خوب

1۔ اِکٹھے = یک جا (بروزن پکتے) (عوامی)　2۔ ترنگ = مستی، جھونک
3۔ نسرین جسے انگریزی میں Jonquil کہتے ہیں　4۔ شقائق = گلِ لالہ

خطِ شمشیر ہو گر اُس کا مری گردن پر — ہوں میں کافر جو کہوں رشتۂ زنار ہے خوب
اَن گنت خوبیاں ہیں اس میں تو، اے کبکِ دری — اور ظاہر میں فقط اک تری رفتار ہے خوب
سن کے بیمار مجھے تم نہیں آتے مجھ تک — گر چہ یہ جانتے ہو پرسشِ بیمار ہے خوب

اُس کی ابرو کے تو سودے میں نہ چوک اے بیہوش
مصحفی ہاتھ گر آئے تو یہ تلوار ہے خوب

89

رہ گیا تھا وہ آ کے شب کی شب — وصل کی شب تھی یا غضب کی شب
آج گزری نفس شماری میں — تیرے بیمارِ جاں بہ لب کی شب
وصل کثرت میں یوں ہوا لیکن — کبھی آئی نہ اپنے ڈھب کی شب
تہِ گل گیر شمع کہتی تھی — کٹتی ہووے گی یوں نہ سب کی شب
وہ شبِ وصل مجھ سے کہتا ہے — پھر نہ دیکھے گا اس طرب کی شب
مجھ کو گزری ہے رات یوں اس بن — جس طرح کٹتی ہے غضب کی شب

مصحفی پر جو کل ہوئے تم گرم
اس نے گھر اپنے جا کے تب کی شب

90

راہی آنکھوں سے ہوئے لختِ جگر آخرِ شب — جس طرح قافلہ کرتا ہے سفر آخرِ شب
کیا شبِ ہجر کا انجام ہو معلوم کہ ہائے — کام کرتی نہیں یلدا[1] میں نظر آخرِ شب
دل سرِ جعد میں اُس کی جو پھنسا، یوں بولا — رات اندھیری ہے میں اب جاؤں کدھر آخرِ شب
چڑھ گیا پھینک کے میں بھی اُسی کوٹھے پہ کمند — جس جگہ تھا نہ فرشتے کا گزر آخرِ شب
مجھ کو پہنچی یہ خبر، تم جو مری مجلس سے — رات اُٹھ کر کے گئے غیر کے گھر آخرِ شب

1۔ یلدا = موسم سرما کی لمبی اندھیری رات

بات کچھ بنتی چلی تھی یہ شبِ وصل مری　　کہ وہیں بول اُٹھا مرغِ سحر آخرِ شب

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ جا کہ ہنوز
لاکھ مضموں ہیں ترے پیشِ نظر آخرِ شب

91

یار جب گھر کو چلا باندھ کمر آخرِ شب　　رہ گیا کر کے میں حسرت کی نظر آخرِ شب

بدگماں ہوویں نہ ہمسائے مرے حق میں کہیں　　کھولتا میں نہیں اس خوف سے در آخرِ شب

نہیں معلوم کہ کون اس کے مزے لوٹے ہے　　زرد ہو جاوے ہے کیوں رنگِ قمر آخرِ شب

نالۂ نیم شبی، میں ترے صدقے جاؤں　　جوں بنے آج تو کچھ تو اثر آخرِ شب

تیرے بیمار کی بالیں پہ دمِ رخصت آج　ق　تھی کھڑی شمع بھی با دیدۂ تر آخرِ شب

اتنے میں مرغِ سحر نے یہ سنائی آواز　　وائے ویلا کہ کیا اس نے سفر آخرِ شب

مصحفی جی میں ہے کہیے غزل اب اور بھی ایک
آئے اس عرصے میں جب تک کہ بسر آخرِ شب

92

یار سوتے سے اُٹھ آوے مرے گھر آخرِ شب　　کاش اتنا تو کرے نالہ اثر آخرِ شب

شمع جانے پہ جو ہوتی ہے، تو پروانے بھی　　سیکڑوں جان سے جاتے ہیں گزر آخرِ شب

گرچہ گلزارِ ارم ہے شفقِ شامِ وصال　　پر مرے خون پہ باندھے ہے کمر آخرِ شب

وہ بھی کچھ جی میں سمجھ جائے ہے جوں جوں شبِ وصل　　اس کے چہرے پہ میں کرتا ہوں نظر آخرِ شب

تھا انیدا[1] جو شبِ دوش کا وہ، آج اسے　　ایسا سویا کہ رہی کچھ نہ خبر آخرِ شب

جانِ من یا تُو گیا غیر کے گھر چوری سے　　یا کیا اُس نے ترے گھر میں گزر آخرِ شب

چُول[2] کی آئی تھی آواز مرے کانوں میں　　اتنا جانوں ہوں کھلا تھا ترا در آخرِ شب

1۔ انیدا = جسے نیند نہیں آئی، جاگا ہوا　2۔ چُول = کواڑ کی چُول جو کھلنے بند ہونے میں آواز دیتی ہے

مصحفی چوتھی غزل لکھ کے قلم کو رکھ دے
کہ ہوئی مطلعِ خورشیدِ سحر آخرِ شب

93

آج کس کا ہے مرے گھر سے سفر آخرِ شب　جو بھرے آتے ہیں یہ دیدۂ تر آخرِ شب
اور بھی آگ لگاویں ہیں یہ سینے کو مرے　نالے کرتے ہیں کچھ اُلٹا ہی اثر آخرِ شب
چشمِ بد دور عجب طرح کا ہے اس کا بناؤ　کہ وہ جاتا ہے بگڑنے میں سنور آخرِ شب
جھومکا[1] سات سہیلی کا، نہ وہ جلوہ فروش　ق　قطب تارا ہی نہ آتا ہے نظر آخرِ شب
نہ وہ نوبت کی ٹکوریں[2]، نہ نفیری کی صدا　نہ مؤذن کی اذاں کا ہے اثر آخرِ شب
نہ وہ طوطی کی صفیریں، نہ وہ بلبل کا خروش　نہ وہ چڑیوں کا ترنم، نہ گجر آخرِ شب
کیا شبِ ہجر ہے یارب یہ کہ جس سے اب تک　جلوہ کرتے نہیں آثارِ سحر آخرِ شب

مصحفی جن سے سدا بے مزگی رہتی تھی
رات آ پھی وہ ہوئے شیر و شکر آخرِ شب

94

حصے میں ہمارے بھی کبھی آؤ گے صاحب　یا یوں ہی الگ ہم سے چلے جاؤ گے صاحب
اس وقت اگر چھوڑ کے گھر جاؤ گے صاحب　تو صبح کو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے صاحب
ملنے سے مرے جو تمھیں انکار رہے ہے　یوں غیر کے ملنے کی قسم کھاؤ گے صاحب
لڑکے ہو ابھی سمجھو ہو کیا دل کی پرائے　جب ہوش سنبھالو گے، سمجھ جاؤ گے صاحب
اک آپ کی تعریف نہیں کرنے کے، اِس چُھٹ[3]　لاویں گے بجا جو ہمیں فرماؤ گے صاحب
دل آپ سے کو دیتے ہو کیوں دیکھو نہ چوکو　کہتا ہوں بھلے کی، نہیں پچھتاؤ گے صاحب

1۔ جھومکا سات سہیلی کا= بنات النعش (ستارے)　2۔ نوبت کی ٹکوریں= آواز
3۔ اِس چُھٹ= اس کے سوا

ایامِ جدائی کا نہ کچھ ذکر کرو اب　　جانے دو، مرا منھ کہیں کھلواؤ گے صاحب
کہتا ہوں تصور میں یہی رات کو اُن سے　　دیدار بھی اپنا کبھی دکھلاؤ گے صاحب؟
میاں مصحفی اُٹھ بیٹھو ٹک اک رستے سے اس کے
ناحق کو کہیں خاک میں مل جاؤ گے صاحب

95

ٹک آنکھ جھپکتے ہی سحر ہوگئی یہ شب　　کیا تھا یہ کہ اک پل میں بسر ہوگئی یہ شب
یارب شبِ ہجراں میں نہ تھی اتنی درازی　　اب چار سے کیا آٹھ پہر ہوگئی یہ شب؟
از بس کہ شبِ وصل رہی مجھ کو غشی سی　　میں یہ بھی نہ جانا کہ کدھر ہوگئی یہ شب
ہم لوگ کہاں اور کہاں مجلسِ شادی　　قسمت سے میسر ترے گھر ہوگئی یہ شب
تھے ناوکِ گردوں کے شبِ وصل نشانہ　　پر بچ رہے اس سے کہ سپر ہوگئی یہ شب
از بس کہ رہے دیکھتے ہی اُس کی طرف کو　　جوں شمع ہمیں وقفِ نظر ہوگئی یہ شب
سرخی شبِ ہجراں میں نہ تھی اتنی تو شاید　　آلودہ بہ خونابِ جگر ہوگئی یہ شب
عاشق سے یہ کہتے ہیں تری مانگ کے موتی　　زیبندہ بہ یک سلکِ گہر ہوگئی یہ شب
ایامِ جوانی گئے اور آئی سپیدی
اے مصحفی اب اُٹھ کہ سحر ہوگئی یہ شب

96

فراق ہی میں رہا یہ دلِ فراق نصیب　　نہ ہووے گا کوئی ہم سا بھی اشتیاق نصیب
شبِ وصال کی میں کیا کہوں تہی دستی　　کہ صبح تک نہ تو ساعد[1] ہوئی نہ ساق[2] نصیب
جگا دیا اُسے آہٹ نے پانو کی، ہے ہے　　کبھو جو جاگے مرے حسبِ اتفاق نصیب
قرانِ ماہِ رخِ یار پر تبھی تو ہے غش　　کہ مشتری کے رکھے ہے دُر بلاق[3] نصیب

1۔ ساعد = کلائی　2۔ ساق = پنڈلی　3۔ بُلاق = ناک میں پہننے کا زیور

کسی کے عقد میں رہتی نہیں ہے لولیِ[1] دہر یہ قحبہ روزِ ازل سے ہے کچھ طلاق نصیب
تو آپھی، اے فلک! انصاف کر، میں غم کھاؤں اور آفتاب کو زردے کا ہو طباق نصیب
جو مجھ سے بر سرِ شورش ہو، یہ دعا ہے مری کہ ہووے اُس کے گلے کے تئیں خناق[2] نصیب
شبِ دوالی میں کھیلیں ہیں سب میاں سولھی[3] جگاویں، آ ؤ نہ ہم تم بہ جفت و طاق نصیب
فراقِ یار میں دیکھیں تو مصحفی کیا ہو
خدا نے اب تو کیا ہے یہ رنجِ شاق نصیب

97

خوب رویوں سے دلا، جی کا لگانا نہیں خوب یہ تو ہیں خوب و لیکن یہ زمانا نہیں خوب
مانو کہنا بھی کسی کا، نہ ملو غیروں سے کہ مری جان غریبوں کا ستانا نہیں خوب
مجھ کو مجلس سے تری غیر اُٹھا دے افسوس اور تُو اتنا نہ کہے ''اس کا اُٹھانا نہیں خوب''
بعد مدت کے تم آئے ہو مرے گھر صاحب بیٹھو، جاتے ہو کہاں، اب یہ بہانا نہیں خوب
کی سفارش مرے ہمدم نے، دمِ نزع اُس سے: اب تو کم بخت تجھے منھ کا چھپانا نہیں خوب
یوں تو مختار ہو تم، پر یہ بھلی بات ہے کیا ہر کسی سے تو میاں آنکھ لڑانا نہیں خوب
نالۂ صبح یہ کیا بے ادبی کرتا ہے پایۂ عرشِ معلیٰ کا ہلانا نہیں خوب
سامنے آؤ، سپاہی ہو اگر ایسے ہی بھپکیاں دور سے یوں ہم کو بتانا نہیں خوب
پھر بُرا مانو گے بندے سے ہم آغوشی کا لے کے خمیازہ مجھے شوق دلانا نہیں خوب
سن کے افسانہ مرا، کہتے ہیں احباب یہی ہر کسی کو تو یہ افسانہ سنانا نہیں خوب
تا نہ ہمسایہ ہو آگاہ، کہ آیا ہے کوئی وصل کی شب بھی دیا گھر کا جلانا نہیں خوب
متہم ہو گے میاں مصحفی ان باتوں میں ق کوچۂ یار میں دن رات کا جانا نہیں خوب
دیکھو سمجھا کے تمھیں کہتے ہیں ہم، باز آؤ
نا سمجھ لوگ ہیں یاں کے، یہ زمانا نہیں خوب

1۔ لولی = فاحشہ 2۔ خناق = پھندا (Asphyxia) 3۔ سولھی = ایک کھیل جو کوڑیوں سے کھیلا جاتا تھا

پ

98

چھوا تھا میں تو سمجھ اُس کو یاسمین[1] کا سانپ
یہ زلف ہوگئی کیوں میری آستین کا سانپ

نہ منھ میں رکھ سرِ گیسو، روا ہے یہ ظالم
کہ بوسہ لیوے ترے لعلِ آتشین کا سانپ؟

یہ کیچلی سی کناری ہے اُس کے دامن کی
کہ زہر کھائے ہے جس پر ہر اک زمین کا سانپ

عجب مزہ ہے جو صندل سمجھ لپٹ جاوے
ترے گلے سے تری جعدِ نازنین کا سانپ

جو کیوڑے کا نہیں پھول اُس کا کان تو کیوں
رہا ہے سونگھ اُسے زلفِ عنبرین کا سانپ

نہ موجِ سبزہ پہ گلشن میں پانو رکھ غافل
دبے پہ کاٹے ہے سنتے ہیں ہم زمین کا سانپ

لٹ اس کی زلف کی خالی نہیں حلاوت سے
بنائے جیسے کوئی موم انگبین[2] کا سانپ

کرے جو خرچ نہ قاروں صفت دفینے کو
وہ مال دار ہے گنجِ تہِ زمین کا سانپ

جو بال بانبی[3] کی مٹی سے دھوئے تُو تو صنم
خیال چھوڑے نہ اس جعدِ سنبلین کا سانپ

حذر نہ اُس بتِ کافر سے کیجیے کیوں کر
کہ مارِ سرخ ہے اُس قشقۂ[4] جبین کا سانپ

کہی ہے میں یہ غزل مصحفی بصد افسوس
ڈسے نہ اس کے تئیں چشمِ عیب بین کا سانپ

ت

99

دل کو میرے بے قراری ہے بہت
آج کی شب مجھ پہ بھاری ہے بہت

کھینچتے ہو کیا میاں تلوار کو
حق میں میرے اک کٹاری ہے بہت

1۔ یاسمین = چنبیلی کا پھول 2۔ انگبیں = شہد 3۔ بانبی = سانپ کا بھٹ 4۔ قشقہ = تلک، بندیا

وہ نہیں قاتل تری تیغِ نگاہ اب کچھ اس کی آبداری ہے بہت
سبز کرنے کو ہمارا باغِ دل گریۂ ابرِ بہاری ہے بہت
دیکھیے سروِ چمن کیدھر چھپے اُس نے اپنی چھب سنواری۔ہے بہت
مصحفی کیا جاویں اُس کوچے میں ہم
اپنی واں بے اعتباری ہے بہت

100

خوشبوئی سے جس کی ہو خجل عنبر سارا ہم مشک کی نکہت
بال اُلجھے ہوئے ہیں کہ یہ ریشم کا ہے لچھا اللہ رے نزاکت
پانوں میں کفک اور لگی ہاتھوں میں مہندی از خون محبّان
چہرہ وہ پری، کہیے جسے نور کا بکا[1] رنگ آگ کی صورت
تلوار لیے ابروے کج قتل پہ مائل لب خون کے پیاسے
پھولوں کی چھڑی ہاتھ میں، اور کان میں بالا چتون میں شرارت
مِسّی کی دھڑی اک تو جمی ہونٹوں پہ کافر اور نیبو سے پونچھی
پھر تِس پہ ستم اور وہ پانوں کا لکھوٹا جوں خوں کی ہو رنگت
پانو میں اَنی[2] دار پڑی کفش زری کی دل جس سے ہو زخمی
اور سر پہ شرارت سے بندھا بالوں کا جُوڑا سج دھج، سو اک آفت
خوں خوار نگہ، عربدہ جُو آپ سے کیفی سرشار نشے میں
اک ہاتھ میں ساغر ہے تو اک ہاتھ میں مینا مستوں کی سی حالت
آیا مرے گھر، دی مرے دروازے پہ دستک میں گھر سے جو نکلا

1۔ بُکّا = بُقعہ کی عوامی شکل 2۔ اَنی دار = نوکیلی

دیکھوں تو سرِ کوچہ اک آشوب ہے برپا پیدا ہے قیامت
تب میں نے کہا اس سے کہ اے مایۂ خوبی کیا جی میں یہ آیا
اس وقت جو آیا تُو مرے پاس اکیلا سمجھا نہ قباحت؟
یوں ہنس کے لگا کہنے اے مصحفی سن بات گھر سے مرے مجھ کو
لایا ہے ترا جاذبہ ہی کھینچ کے، ورنہ تھی کس کو یہ قدرت

101

کاغذ کا ورق یہ پائے صورت نقاش ایسی بنائے صورت
چہرے پہ نظر نہیں ٹھہرتی اللہ رے تری صفائے صورت
گر غور سے دیکھیے تو ہرگز معنی نہیں ماسوائے صورت
شیریں ہے ہزار جاں سے جس کی قربانِ کرشمہ ہائے صورت
فرہاد کو بے ستوں میں جا کر ممکن نہیں وہ دکھائے صورت
آئینہ تلک بھی یاں نہ دیکھا ق ہم نے کوئی آشنائے صورت
اس واسطے مصحفی پڑے ہیں
اِن لوگوں سے ہم چھپائے صورت

102

شعر دولت ہے، کہاں کی دولت؟ میں غنی ہوں تو زباں کی دولت[1]
سیکڑوں ہوگئے صاحب دیواں میری تقریر و بیاں کی دولت
سیرِ مہتاب کر آئے ہم بھی بارے اس آبِ رواں کی دولت
زخم کیا کیا مرے تن پر آئے تیری شمشیر و سناں کی دولت
ہوئی محبوسِ قفس، بلبل نے رنج دیکھا یہ خزاں کی دولت

1۔ دولت = بدولت

کوئی نواب کے گھر کا ہے غلام کوئی پلتائے[1] ہے خاں کی دولت

مصحفی پر ہے ترا کرّ و فر
صاحبِ عالمیاں کی دولت

103

مرا معبود تھا وہ نازنیں رات رہی تا صبح سجدے میں جبیں رات

پریشانی میں ہی تا صبح گزری گئی تھی کھل وہ زلفِ عنبریں رات

جب اُس مہ نے کہا ''کس شب میں آؤں''؟ مرے منھ سے یہ نکلا ''چودھویں رات''

نہ کرتا گر میں ضبطِ آہ تو یہ گئی تھی تا بہ چرخِ ہفتمیں رات

سحر تک شمع کو روتے ہی گزری کہیں اُلٹی تھی اُس نے آستیں رات

معاذ اللہ، چمکتی تھی ہوا میں طرح بجلی کی، آہِ آتشیں رات

خلافِ وعدہ نے اُس بے وفا کے سحر تک مجھ سے نپوائی[2] زمیں رات

ستارے سب نظر آتے تھے نزدیک مری آنکھیں تھیں گویا دوربیں رات

دعائیں مانگتا تھا دم بہ دم میں خداوندا سحر ہووے کہیں رات

نہ جھپکی مصحفی کی آنکھ اک پل
کہ تھا وہ ماہِ تاباں ہم نشیں رات

104

سو گیا تھا شام وہ رکھ کر جبیں پر پشتِ دست[3]
دیکھ اُسے خورشید نے رکھ دی زمیں پر پشتِ دست

سانپ سی مُہری کی زہ[4] جو رات لہرانے لگی
کیا جھجک کر اس نے ماری آستیں پر پشتِ دست

1۔ پلتائے ہے = پلتا ہے (عوامی) 2۔ زمین نپوائی = پھیرے لگوائے (روزمرہ) 3۔ زمین پر پشتِ دست رکھنا (فارسی محاورے کا ترجمہ) عاجزی کا اظہار کرنا 4۔ زہ = ڈوری

روز و شب مولا کے آگے ہاتھ ہیں جن کے دراز
مارتے ہیں حشمتِ خاقانِ چیں پر پشتِ دشت

دین و دنیا سے رہا کیا کام اُس آزاد کو
جس نے ماری، دور سے، دنیا و دیں پر پشتِ دست

ہاتھ اُلٹا اور کے بھی اس طرح مارا کبھو؟
آپ کی چلتی ہے کیوں صاحب ہمیں پر پشتِ دست

با حیا ہے، بس کہ اپنے کشتگانِ ناز کو
رکھ کے دیکھے ہے وہ چشمِ سرگیں پر پشتِ دست

اور بھی رنگِ حنا میں جاکے سرخی بھر گئی
اُس نے رکھی جب عذارِ آتشیں پر پشتِ دست

غنچۂ دستِ حنا بستہ ترا، اے شاخ گل
مارتا ہے گل کے روے نازنیں پر پشتِ دست

جو کہے ہے کچھ بھی میری، ہوکے کھسیانا وہ شوخ
کوسنے[1] کو اس کے رکھتا ہے زمیں پر پشتِ دست

جو مخمس ہے مرے دیوان میں اے مصحفی
آج کل مارے ہے دیوانِ یقیں[2] پر پشتِ دست

105

اُس کے مقتل میں مرا خون بٹا دست بہ دست خوب رُو جیسے لگاتے ہیں حنا دست بہ دست
خادموں کی ہے یہ کثرت کہ بھری مجلس میں جائے ہے آپ کا دامانِ قبا دست بہ دست

1۔ دیہات قصبات کی عورتیں کوسنے میں اپنا ہاتھ اُلٹا کر کے زمین پر رکھتی تھیں، یہ بددعا کی نشانی ہے
2۔ انعام اللہ خاں یقین

رات کہتی تھی حنا اُس کے خریداروں سے مول لو مجھ کو تو سودا ہے مرا دست بہ دست
خاک پر گرنے نہ پاوے کہیں پر بلبل کا جائے یہ باغ تلک بادِ صبا دست بہ دست
مارے غیرت کے کیا چاک گریباں کہ اُسے غیر کے ساتھ میں دیکھا تھا کھڑا دست بہ دست
آج وہ ہاتھ میں میرے ہے، تو کل تیرے ہاتھ طرح لٹو کی فلک یوں ہی پھرا دست بہ دست
مصحفی کرتے ہیں اُس کی جو ملائک تعظیم
عرش تک جاتی ہے عاشق کی دعا دست بہ دست

106

پردے سے صنم تُو جسے دکھلائے دو انگشت مر جائے وہ کہہ کر کے یہی ہائے دو انگشت
اس چاک سے پردے کے ترے، وہ جو ہیں بینا ٹک سوچ کے کرتے ہیں تماشائے دو انگشت
شب لے کے میں چٹکی تری کیا شاد ہوا ہوں مدّت سے مری تھی یہ تمنائے دو انگشت
آنکھیں مری رہتی ہیں لگی پردۂ در سے جس دن سے ہوا ہے مجھے سودائے دو انگشت
چلتا ہوں انگوٹھوں کے بل اُس کوچے میں از بس کثرت سے شہیدوں کی نہیں جائے دو انگشت
گر چاکِ قنات اپنی سے وہ منہ نہ دکھاوے اتنا ہی غنیمت ہے کہ دکھلائے دو انگشت
ہوں دیدہ و دل کیوں نہ گرفتارِ سلاسل جس دم وہ علی بند[1] میں پہنائے دو انگشت
اے مصحفی، کیا دیکھوں میں اُس پردہ نشیں کو
کرتی ہے نگاہوں کی نفی لائے[2] دو انگشت

107

جب چاک سے پردے کے نظر آویں دو انگشت پردے میں نہ دل کھینچ کے لے جاویں دو انگشت
اغلب کہ یُوں ہیں چاک کریں پردۂ دل کو گر دل میں مرے تیری جگہ پاویں دو انگشت
گاڑی کے لگوں پیچھے جو میں رہنے، تو مجھ کو چل آگے، اشارے سے یہ بتلاویں دو انگشت

1۔ علی بند= کوئی زیور جس کا اودھ سے تعلق ہے 2۔ لا= (عربی کا حرف نافیہ) نہیں

جیسے کہ دو عُنّاب نظر آتے ہیں اِن سے — چاہیں تو دو بادام بھی دکھلاویں دو انگشت
میں نو ہوسِ عشق ہوں دیکھا نہیں کچھ بھی — کیا جانیے کیا مجھ پہ بلا لاویں دو انگشت
عالم مری نظروں میں سیہ کیوں کے نہ ہو جائے — جب اس کے نظر آتے ہی چھپ جاویں دو انگشت
اے مصحفی رستے میں عجب کیا ہے کہ ناداں
رہزن سے ترے قتل کو فرماویں دو انگشت

108

یہ کیونکے کہوں میں مرے گھر آیئے اک رات — جی چاہے تو ہے، آکے جو رہ جایئے اک رات
مرتا ہو جو تم پر، نہیں چاہت سے عجب بھی — دانستہ اگر اس کی دغا کھایئے اک رات
گھر غیر کے تم جاتے ہو شب باش ہمیشہ — تشریف اِدھر بھی کبھی فرمایئے اک رات
لازم ہے تمھیں دوسرے دن آن ہی ملنا — اس شخص سے، پیارے جسے تڑپایئے اک رات
آتا ہے یہی جی میں کہ پروانے کے مانند — صدقے ہو سرِ شمع پہ، جل جایئے اک رات
تو مجلسِ رنداں میں گر آجائے تو اے شیخ — پوشاک زنانی تجھے پہنایئے اک رات
دن ہجر میں جاتے ہیں چلے، عمر ہے آخر — جلدی سے کہیں ملنے کی ٹھہرایئے اک رات
ہر رات یہاں دل کوئی پہلو میں ملے ہے — ہاں صبر بھی کر رہیے جو دکھ پایئے اک رات
کچھ بن نہیں آتی ہے ترے ہجر میں مجھ کو — اب جی پہ یہ ٹھہری ہے کہ کچھ کھایئے[1] اک رات
سو سانگ کیے تو بھی تُو در تک تو نہ آیا — ہے جی میں کہ اب سانگ نیا لایئے اک رات
کیا وضع نکالی ہے، کہ اک رات بہ شوخی — پیش آیئے گر ہم سے، تو شرمایئے اک رات
اب وصل کی خواہش یہی کہتی ہے، کسو سے — دھوکے میں ترے، اُٹھ کے لپٹ جایئے اک رات
ہر چند کہ وصل آپ کا مشکل ہے ولیکن — آساں ہو جو دھیان اپنا اِدھر لایئے اک رات
گر اور نہ ہووے تو بھلا اتنا تو کیجے — دروازے کی کنڈی کھلی رکھ جایئے اک رات
اے مصحفی خط یار کا ہے، اس کو کسی سے
کونے میں کہیں بیٹھ کے پڑھوایئے اک رات

1۔ کچھ کھا کے سو رہنا (روزمرہ) = خودکشی

109

وہ ٹھہرا تھا جو آ کے ساعت کی ساعت | وہی مجھ پہ گزری قیامت کی ساعت
گرے ہے مرے سر پہ تیغِ جدائی | ٹلے کیونکے سر سے نحوست کی ساعت
میں کچھ کہہ لوں چپکے سے شادی کے گھر میں | نہیں ملتی اتنی بھی فرصت کی ساعت
پس از مرگ بھی ہے جو پاس اُس کو میرا | نجومی سے پوچھے ہے تربت کی ساعت
وہ ہے سامنے، مانی، کھینچ اُس کا نقشا | نہ پاوے گا پھر ایسی صورت کی ساعت
شبِ ہجر جس وقت بچھڑا تھا تجھ سے | میں پاتا نہیں پھر وہ فرقت کی ساعت
رہے درد و غم میں، نہ اتنا بھی جانا | کسے کہتے ہیں روزِ عشرت کی ساعت

کبھی مصحفی ہم نے زیرِ فلک تو
نہ دیکھی نہ دیکھی فراغت کی ساعت

ٹ

110

شانہ لُوٹے ہے مزے کاکلِ پیچاں سے لپٹ | دلِ صد چاک تُو جا زلفِ پریشاں سے لپٹ
دھیان باندھوں ہوں جو میں اُس کی ہم آغوشی کا | دیر تک رہتی ہیں مژگاں مری مژگاں سے لپٹ
یاد میں طرۂ 'لیلیٰ' کی گیا کل 'مجنوں' | عشق پیچے[1] کی طرح بیدِ گلستاں سے لپٹ
آج چمکے ہے نپٹ رنگِ سنجافِ[2] گلگوں | خونِ عاشق نہ گیا ہو ترے داماں سے لپٹ
کششِ شوق سے کیا دور ہے، گر ہو بیتاب | جائے تصویرِ زلیخا مہِ کنعاں سے لپٹ
میں وہ رَہرو ہوں کہ رہ رہ کے گئے رستے میں | تارِ دامن کے مرے خارِ مغیلاں سے لپٹ

1۔ عشق پیچاں (جسے عشقیہ اور عَشَقہ بھی کہتے ہیں) ایک بیل جو درخت سے لپٹ کر چلتی ہے اسے انگریزی میں (Bindweed) کہتے ہیں۔ بید بھی ایک درخت ہے جسے بید مجنوں بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں Weeping Willow ہے۔ 2۔ سنجاف = گوٹ جو دامن یا آستین پر لگاتے ہیں

تیر کو کھینچ کے سینے سے وہیں پھینک دیا کہ مرا خون رہا تھا پرِ پیکاں سے لپٹ
تیغ کو کھینچ، میاں قصہ مرا کوتہ کر جائے طومارِ[1] شکایت کسی عنواں سے لپٹ
کل جو صحرا میں مری آہ کی آندھی آئی راہرو رہ گئے ہر نخلِ بیاباں سے لپٹ
خونِ ناحق تری گردن پہ ہے مشتاقوں کا رفتہ رفتہ کہیں جاوے نہ گریباں سے لپٹ
ناگنی زلف کی، آئینے میں ٹک تُو بھی تو دیکھ بوسہ لیتی ہے ترے سیبِ زنخداں سے لپٹ
نازکی موئے کمر کی ترے وہ سمجھے خوب یہ کمر جس کی گئی ہووے رگِ جاں سے لپٹ
پھر گیا آکے میاں واں سے جو تُو عید کے دن مر گئے سیکڑوں قیدی درِ زنداں سے لپٹ
بس کہا تجھ سے پرے ہو کہیں اے دستِ جنون نہ بلا ہو کے مرے چاکِ گریباں سے لپٹ

مصحفی ایک غزل اور بھی لکھ ایسی گرم
جس کا ہر شعر رہے برقِ درخشاں سے لپٹ

111

جوں ہی آ رہتی ہے سینے پہ گریباں سے لپٹ ووں ہی دل جائے ہے اُس زلفِ پریشاں سے لپٹ
رحم کر سینۂ نازک پہ تو اپنے شبِ عید گرم ہو کر نہ مرے سینۂ سوزاں سے لپٹ
یاد میں کس کی کناری کی میں روتا ہوں جو آج موجِ خوں گرتی ہے اک دامنِ مژگاں سے لپٹ
تیر اس کا جو لگا دل پہ، تو نسبت کے سبب جوہرِ جان گیا جوہرِ پیکاں سے لپٹ
تھے جو دو ہاتھ مرے، فصلِ جنوں میں اب کے ایک دامن سے گیا، ایک گریباں سے لپٹ
زلف میں جھمکے ہے یوں اُسکے کرن پھول کا رنگ جیسے گل جائے کوئی سنبلِ پیچاں سے لپٹ
اُمڈے آنسو تو ہوا آہ کا پھر یہ عالم جیسے جاتی ہے ہوا شورشِ طوفاں سے لپٹ
تیری رعنائی کے ڈھنگ اس میں ہیں، جی چاہے ہے دوڑ کر جایئے طاؤسِ گلستاں سے لپٹ
کر کے زندانی، تری یاد ہم آغوشیِ عید پھوڑیں ہیں دل کے پھپھولے درِ زنداں سے لپٹ

1۔ طومار = لمبا کاغذ جسے لپیٹ کر خریطے میں رکھا جاتا تھا

ہاتھ چوری سے جو شب پانو تک اس کے پہنچا وون ہی اک چور[1] گیا شمعِ شبستاں سے لپٹ
بھیگ کر مینھ میں گریے کے مرے لختِ جگر رات باہم گئے اوراقِ گلستاں سے لپٹ
تجھ سے کیا کام ہے اب مجھکو تو اے زلفِ سیاہ خواہ ہندو سے لپٹ، خواہ مسلماں سے لپٹ
کشتۂ رشک نہ ہوں اُس کی مسی کا کیونکر پھیل کر کیا ہی رہے ہے لب و دنداں سے لپٹ
کیا ہی کل محملِ لیلیٰ کے وہ قربان گیا اک بگولا جو اُٹھا گردِ بیاباں سے لپٹ
مصحفی ہجر کی شب، وصل کا لُوٹیں ہیں مزہ
بس کہ سو رہتے ہیں ہم حسرت و حرماں سے لپٹ

112

غمزۂ شوخ جو پھینکے ہے کبھی تیر سمت پوٹ سا جائے ہے اس چشم کا نخچیر سمت
لاشہ میرا جو سنبھل کر کے لگا کرنے زور برق کی طرح گئی اس کی بھی شمشیر سمت
جب میں دیتا ہوں اُسے پائے جنوں سے جھٹکا موجِ دریا کی طرح جاوے ہے زنجیر سمت
دل پریشاں یہ کیا زلف نے کس کی کہ کبھو لب تک آئی نہ زباں سے مری تقریر سمت
جب چرانا میں بدن کا ترے کرتا ہوں رقم خود بہ خود جائے ہے کاغذ گہِ تحریر سمت
شانہ جب اس سے لگا دست درازی کرنے کیسی کھنچ کر گئی وہ زلفِ گرہ گیر سمت
تازیانے سے نہ ہو زلف کے کیوں خال گرہ[2] سچ یہ ہے جاوے ہے مجرم گہِ تعزیر سمت
اسداللہ کا مانی نے جو پنجہ کھینچا صورتِ گربہ گئی شیر کی تصویر سمت
مصحفی اب ہے یہ احوالِ دلِ آتش خوار
لے کے گل شمع کا، جوں جاوے ہے گلگیر سمت

113

بوسہ لبوں کا لے مزۂ وصلِ یار لوٹ مَل رخ سے رخ تو، اور چمن کی بہار لوٹ

1۔ چور= شمع کا دھاگا جل کر دھبا سا بن جاتا ہے اُسے شمع کا چور کہتے ہیں۔ 2۔ گرہ ہونا= سمٹنا، سکڑنا

خوبانِ سرخ پوش جو آئے تھے سیر کو کہتے ہیں آج لے گئے سب لالہ زار لوٹ
ہوتا ہے باغِ حسن میں جس دم مرا گزر کہتی ہے یوں ہوس کہ تو سیب و انار لوٹ
آوے شبِ وصال، تو اس گل کا ہار پان گر تجھ سے لٹ سکے گہِ بوس و کنار لوٹ
اب زخمِ سینہ کس سے رفو ہو، کہ لے گیا دستِ جنوں تمام گریباں کے تار لوٹ
خوباں نے ہم سے شہر میں کی یوں تمرّدی[1] صحرا میں جوں غریب کو لیویں گنوار لوٹ

اے مصحفی ہے آج چمن وقفِ دست برد
میوے کی تو بھی واں سے کوئی شاخسار لوٹ

ث

114

مرتا ہے اُس پہ یہ دلِ شیدا عبث عبث کرتا ہے اپنے نام کو رسوا عبث عبث
دنیا سے ہم گئے تو کُھلا ہم پہ یہ کہ عمر کی ہم نے صرفِ الفتِ دنیا عبث عبث
میں جو کہا کہ تجھ پہ تو جاتی ہے جان ہی سن کر کہا یہ اُس نے کہ "بیجا، عبث عبث"
زاہد کے حیز[2] بیٹے نے جو بیاہ کو کہا کہنے لگا وہ اُس سے کہ نا، نا، عبث عبث

تو کیا کرے گا شال و قبا لے کے مصحفی
کس زندگی پہ اتنی تمنا عبث عبث

ج

115

یاں نہ صفرا کا، نہ سودا کا علاج ترک ہے مردمِ دانا کا علاج
گرچہ عیسیٰ مرے ہمسائے رہا نہ کیا میں کبھی عیسیٰ کا علاج

1۔ تمرّدی= سرکشی 2۔ حیز = نامرد

جان کر یار مجھے سودائی واہ پھر کرتے ہیں صفرا کا علاج
ہے وہی نورِ بصر دل کو مرے جس سے ہو دیدۂ اعمیٰ[1] کا علاج
ہے تشنج[3] اِسے، اے مایۂ ناز کچھ تو کر زلفِ چلیپا[2] کا علاج
واں حنا لگتی ہے اور یاں کانٹے کرتے ہیں آبلۂ پا کا علاج
مصحفی مثلِ زباں اس کو بھی کاٹ
ہے یہی دستِ تمنا کا علاج

116

میں مسیحا سے جو پوچھا چشمِ گریاں کا علاج یوں لگا کہنے کرے گا نوح طوفاں کا علاج
بخیہ کاری چاکِ دل پر سوزنِ مژگاں نے کی پر ہوا ان سے نہ اس چاکِ گریباں کا علاج
زخم گر آتا سر و رُو پر تو تھی مرہم کی جا ہو سکے کیونکر کسی سے زخمِ پنہاں کا علاج
ہے سفر کعبے کا مجھ کو منزلیں در پیش ہیں کچھ تو کر اے آہ! اس خارِ مغیلاں کا علاج
اس قدر نزلہ گرا ان پر کہ بس ہلنے لگے
مصحفی ہوتا نہیں اب ہم سے دنداں کا علاج

117

سامنے آنکھوں کے ہر دم تری تمثال ہے آج دل بھرا آئے نہ کیونکر کہ برا حال ہے آج
زعفراں زار میں لالے کی بہار آ کر دیکھ اشکِ خونیں سے رخِ زرد مرا لال ہے آج
وقت ہے، گر تو بہ تقریبِ عیادت آوے کیونکہ بیمار کا تیرے بتر احوال ہے آج
طرفہ حالت ہے کہ اُٹھ کر میں جہاں جاتا ہوں تیرے دیدار کی خواہش مرے دنبال[4] ہے آج
روز اس طول سے کاہے کو کٹے تھا میرا نہیں معلوم مجھے روز ہے یا سال ہے آج
دل، چلا، صبر چلا، جی بھی چلا جاتا ہے ٹک مدد کر تو کہ لشکر میں مرے چال[5] ہے آج

1۔ اعمیٰ = نابینا 2۔ چلیپا اصل میں صلیب ہے، زلف کو چلیپا کہنا اس رعایت سے ہے کہ اُس کے پھندے میں دل گرفتار ہوتا ہے۔ 3 تشنج = اینٹھن، پراگندگی 4۔ دنبال = پیچھے 5۔ لشکر میں چال ہے، یعنی لشکر قسطوں میں روانہ ہو رہا ہے

تجھ کو چاہا تھا میں اِس دن کے لیے کیا ظالم؟ — تیری چاہت تو مری جان کا جنجال ہے آج
دن جدائی کا قیامت سے نہیں کم، ہر چند — بیم پرسش نہ غمِ نامۂ اعمال ہے آج
مصحفی کروٹیں بدلے ہے قلق میں تجھ بن
استخواں اس کا جو ہے قرعۂ رمّال[1] ہے آج

118

ہیرا قلق میں پیس کے کھایا میں، لا علاج[2] — آخر کو اپنے ہاتھ ہی اپنا کیا علاج
میں زہر کھا کے اس کے لیے مر گیا تو وہ — بولا یہ ہنس کے: اور کچھ اس کا نہ تھا علاج
غم خوار کیا کرے کہ مسیحا سے شخص سے — خورشید کے ہوا نہ تپ لرزہ کا علاج
ہوگئیں پھریری[3] آہ سے مژگانِ نم زدہ — سچ ہے کہ رختِ[4] تر شدہ کا ہے ہوا علاج
فتنے کو اس کی چشم نے یوں بر طرف کیا — جس طرح آشنا کا کرے آشنا علاج
صندل کی احتیاج ہے کیا مجھ کو عندلیب — ہے میرے دردِ سر کا نسیم و صبا علاج
الماسِ سودہ زہرِ ہلاہل میں ضم کیا — آخر کو یہ طبیب نے میرا کیا، علاج
ملتا اگر مسیح تو میں اس سے پوچھتا — بے طاقتی کا دل کی کروں اپنے کیا علاج
چاہت کا تجھ کو روگ لگا ہے یہ بے طرح
کر مصحفی کچھ اپنا تو بہرِ خدا علاج

119

بوئے مزرعِ دل میں جو عنایات کے بیج — تو نہ ہوں سبز کبھی اپنی شکایات کے بیج
ہم نے اس مزرعِ ہستی میں کیے ہیں جو عمل — ایک دن کھینچیں گے سر اُن کی مکافات کے بیج
آہ دہقانِ فلک کی کہوں کیا بد تخمی[5] — خاکِ آدم میں یہ نت بووے ہے آفات کے بیج

1۔ رمّال = فال دیکھنے والا، رمل کے حساب سے پیش گوئی کرنے والا 2۔ لا علاج یعنی جس کا کوئی علاج نہ تھا 3۔ پھریری = (بروزن بسیری) 4۔ رخت تر شدہ = رخت، سامان۔ تر شُدہ = بھیگا ہوا، نمی کا کم ہونا، سوکھنا 5۔ بد تخمی = بد اصل ہونا

باغباں جب تئیں ہاتھ آوے ترے بذرالبنج[1] میری تربت پہ نہ بو اور نباتات کے بیج

ولدالقحبہ[2] سے پوچھو نہ، تری ذات ہے کیا بیج میں اس کے ہیں مخلوط کئی ذات کے بیج

داغ سینے کے مرے طرفہ دکھاتے ہیں بہار ہیں یہ بوئے ہوئے کس نخلِ طلسمات کے بیج

بسترِ شیخ پہ جو کونچ کی پھلیاں نکلیں تھے چھپائے ہوئے شاید اُسی بدذات کے بیج

اُن کو کیا ہووے ہے جز رزقِ پریشاں حاصل جا بجا بوتے پھریں ہیں جو ملاقات کے بیج

مصحفی اس سے بھی بہتر غزل اک اور سنا
وادیِ فکر میں بو کر تو خیالات کے بیج

120

تھے جو کھٹکے ہوئے اُس کافر بدذات کے بیج مزرعِ دل میں رکھے بو، میں وہی رات کے بیج

بوے رشک آتی ہے میری نہ تواضع کیجے آپ ہی کھایئے غیروں کی مدارات کے بیج

ان سے اب سیکڑوں گل پھولے ہیں تربت پہ مری تھے جو بوئے ہوئے مہندی کے تری، ہات کے بیج

بیج چڑ[3] میں نے جو ٹھہرائی تو ہنسنے کے لیے اُس نے منگوائے وہیں وقت ملاقات کے بیج

طاق پر تخم شریفے کے دھرے ہیں میں نے یادگار اب تئیں ہیں آپ کی سوغات کے بیج

باغ انگوری میں انگیا کے ٹکے[4] ہیں جو حباب یا جمائے ہیں کسی نے یہ طلسمات کے بیج

میں کٹھل[5] ان کو جو بھجوائے تو قاصد سے کہا کیا جی تحفہ تھے یہی موسمِ برسات کے بیج؟

باغ سے اپنے جو بھجوائی تھیں تم نے سیمیں[6] سر چڑھایا میں سمجھ ان کو عنایات کے بیج

وہ بھی کیا شب تھی کہ میں مصحفی در عالمِ خواب ق گلشنِ وصل میں بوتا تھا خیالات کے بیج

کھل گئی آنکھ سحر ہوتے تو کیا دیکھوں ہوں نہ وہ شب، اور نہ وہ گلشن ہے، نہ وہ رات کے بیج

چ

121

غافل قدم نہ رکھ کہ ہیں اس میں ہزار پیچ یعنی کہ اس کی زلف کا کوچہ ہے مارپیچ[7]

1۔ بذرالبنج = بھنگ کے بیج 2۔ ولدالقحبہ = فاحشہ کی اولاد 3۔ چڑ ٹھہرانا = کسی شخص کا کوئی ایسا نام رکھ دینا جس سے وہ بھڑکے، بُرا مانے 4۔ ٹکے ہیں یعنی ٹانکے ہوئے ہیں (روزمرہ) 5۔ کٹھل، ایک پھل جو ترکاری میں بھی استعمال ہوتا ہے 6۔ سیم ایک ترکاری، پھلی کی شکل میں 7۔ مارپیچ = بار بار مڑتا ہوا۔

کُھلوائیں آپ غیر سے جب زلف کی گرہ　　کھاوے نہ کیونکے اپنا دلِ بے قرار پیچ
ہر پیچ میں اگرچہ نہیں ہے، پر آخری　　پگڑی کے اُس کی قہر ہیں دو، تین، چار پیچ
ہم دامِ عشق پیچ میں جا کر کے پھنس گئے　　ناحق یہ ہم کو دے گئی فصلِ بہار پیچ
سلجھاؤں اس سے کیونکے دل اپنا میں مصحفی
ہر بات میں نکلتے ہوں جس کی ہزار پیچ

ح

122

بس کہ اس فنِ حذاقت میں ہے ہشیار مسیح　　دور بھاگے ہے مجھے دیکھ کے بیمار، مسیح
تیرے بیمار کی حالت سے اگر ہو آگاہ　　جاے دینار [1] لکھے شربتِ دیدار مسیح
روز صحبت دو پیمبر کی گٹھے ہے باہم　　لعل یحییٰ ہیں ترے اور ہے رخسار مسیح
کوہ وصحرا سے کبھی رو نہ کیا جانبِ شہر　　حد رہا تجھ کو تجرّد سے سروکار مسیح
یہ نہ سمجھی کہ وہ پہنچا فلکِ چارم پر　　تجھ کو جس قوم نے کھینچا بہ سرِ دار مسیح
نہ کرے تو ہی گزر اس پہ تو ناچاری ہے　　تھی مری قبر بھی اِحیا [2] کی سزاوار مسیح
رازِ دل اپنا تو ہر اک سے نہ اب ظاہر کر　　کہ حواری [3] ہیں ترے محرمِ اسرار مسیح
معجزہ دیکھ کے اس طرح کا کیا اندھے ہیں　　جو نبوت کا تری کرتے ہیں انکار مسیح
کس کا بیمار ہوا تھا میں کہ بالیں سے مری　　اُٹھ گیا نبض مری دیکھ کے یکبار مسیح
مصحفی زندہ میں رہتا ہوں انھیں کی دولت
ہیں مرے حق میں تو بس لعلِ لبِ یار مسیح

1۔ شربت دینار = یونانی دوا　2۔ اِحیاء = زندہ کرنا　3۔ حواری = حضرت عیسیٰ کے اصحاب

123

چمکے ہے کچھ وہ ابروے خم دار بے طرح
چلتی ہے آپہی آپ یہ تلوار بے طرح

کیا جانے کشمکش میں یہ جھگڑا کہاں کھنچے
ہے اختلاطِ سُبحہ و زنّار بے طرح

دستار و شملہ شیخ کا ہے خوف کی جگہ
نکلا ہے یہ ستارۂ دمدار بے طرح

وہ رخ تو آفتاب ہے، پر موے جعد سے
پیچھے پڑی ہے اُس کے شبِ تار بے طرح

جاتا ہوں اُس گلی میں تو میری طرف کو ہائے
رہتے ہیں گُھور رخنۂ دیوار بے طرح

سوتوں کو خاک کے نہ جگادے کہیں، میاں
کچھ ان دنوں میں ہے تری رفتار بے طرح

روزِ سپید اپنا سیہ کس طرح نہ ہو
زلفوں میں آگئے ہیں وہ رخسار بے طرح

ابرِ بہار کب سے صف آرا ہے سامنے
بگڑے ہیں آج دیدۂ خوں بار بے طرح

ہمسایگی پہ یار کی کیا جی کو خوش کروں
مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیادار بے طرح

دیوارِ گِل[1] جو ہووے تو رخنہ بھی ہو سکے
ہے درمیاں حجاب کی دیوار بے طرح

میں دل دیا تھا تجھ کو طرح دار جان کر
لیکن نظر پڑے ترے اطوار بے طرح

پیکاں کے ساتھ ہی نکل آیا نہ دل مرا
کھینچا تھا اُس نے جان کے سوفار بے طرح

کس کے خرامِ ناز تھے گلشن میں عندلیب
جو خاک میں ملے ہے یہ گلزار بے طرح

ایسا نہ ہو کہ ہاتھ اُلجھ کر وہیں رہے
گُھرسو[2] ہو بال تم تہِ دستار بے طرح

بالیں پہ اُسکی میں جو گیا شب بہ وقتِ نزع
دم توڑتا تھا مصحفیِ زار بے طرح

124

مجھ کو صیاد سے ہے شکوۂ احوال صریح
توڑ ڈالے ہیں مرے اُس نے پر و بال صریح

کیوں نہ دیوان کو میں اپنے صنم خانہ کہوں
ہے لکھا اس میں بتوں کا ہی خط و خال صریح

صاف رنگِ کفکِ پا، یہ کہے ہے کہ وہ شوخ
کر کے آیا ہے کسی کشتے کو پامال صریح

1۔ گِل (بروزن دل) مٹی 2۔ گُھرسنا = اندر سمیٹ لینا (روزمرّہ)

کیوں نہ فریاد کریں یہ کہ غریبوں کے تئیں — تیری رفتار کیے جاتی ہے پامال صراح
الجھی ہی جاتی ہیں جوں جوں انھیں سلجھاتا ہوں — تیری زلفیں ہیں مری جان کا جنجال صراح
باہر اس سے نہیں جو کچھ ہے مرا حال، غرض — میرا دیواں ہے مرا نامۂ اعمال صراح

کیوں نہیں چونکتے میاں مصحفی تم صبح ہوئی
مرغ بولے ہے، اُٹھو، بجتی ہے گھڑیال صراح

خ

125

ہے سوے آسماں مری آہ و فغاں کا رخ — پھر جائے کس طرح نہ بھلا آسماں کا رخ
اس چرخِ نیزہ باز کو کیا مجھ سے لاگ ہے — رکھتا ہے میرے دل کی طرف جو سناں کا رخ
بلبل سے باغباں یہ کہے ہے کہ "دیکھیو — گل کی طرف کیا جو کبھی آشیاں کا رخ[1]"
گل ہائے باغ شرم سے ہوتے تھے سرخ و زرد — شاید اُدھر کو تھا کسی رعنا جواں کا رخ

مت دیکھ سوے ابروے برگشتہ مصحفی
کس کام کی رہی وہ، پھرا جب کماں کا رخ

126

ناوکِ آہ کرے جس کا سپر میں سوراخ — یہ تعجب ہے کہ ہوں اُس کے جگر میں سوراخ
کس کے تیروں کا نشانہ میں ہوا تھا کہ ہنوز — ہیں طرح نے[2] کی، مرے سینہ و سر میں سوراخ
چشمِ حیرت زدگاں ہیں کہ لگی ہیں لاکھوں — نہیں اس غرفے کے یہ تختۂ در میں سوراخ
شکل ناسور کی بہتی ہیں جو یہ آٹھ پہر — پڑ گئے ہوں نہ کہیں دیدۂ تر میں سوراخ
کس کی جالی کے مقابل یہ رہا شب کہ ہوئے — صورتِ خانۂ زنبور[3] قمر میں سوراخ

1۔ مراد یہ کہ خبردار اُدھر کو رخ نہ کرنا (روزمرہ) 2۔ نَے = بانسری 3۔ خانۂ زنبور = بھڑوں کا چھتا

جب سے ہمسائے ہوئے تم یہ شگوفہ پھولا	ورنہ آگے تو نہ تھے غیر کے گھر میں سوراخ

آنکھ کس کس سے وہ پردے میں لڑایا نہ کیے	ان کے برقع کے ہیں سب میری نظر میں، موراخ

مردمِ[1] چشم مری بہہ گئی یوں گریے سے
مصحفی جیسے گھڑے کے ہو جگر[2] میں سوراخ

د

127

ہر پور پہ اس کی ہو مرا کیونکے نہ جی بند	انگشتوں میں ہے اُس بتِ کافر کی علی بند

دل سینۂ صد چاک میں رہتا ہے یہ حیراں	ہو جیسے قفس میں کوئی مرغِ قفسی بند

یارب وہ ڈسیں اُس کو ہی، جو واسطے میرے	جامے میں لگاوے ہے ترے ناگ پھنی[3] بند

تھا بس کہ دمِ ذبح بھی حیراں ترے رخ کا	اس وقت بھی بسمل کی ترے آنکھ نہ تھی بند

شانوں کو چڑھا اُس کے رقیب، اس سے کہے ہے	"ہیں اس فنِ کشتی میں مجھے یاد کئی بند[4]"

حیرانِ تماشائے چمن جب سے ہیں، ہم نے	جوں رخنۂ دیوار کبھی آنکھ نہ کی بند

اُس چشم کا عالم، میں گہِ خواب یہ دیکھا	جس طرح کوئی ہوتی ہے نرگس کی کلی بند

یہ تو شبِ فرقت نے بڑا ظلم کیا ہے	تھا رخ پہ ہمارے نہ درِ صبح کبھی بند

مذکور تری چال کا کرتا ہوں جو اس سے	ہو جائے ہے اک بات میں بس کبکِ دری بند[5]

ہشیاری سے شب مصحفی کرتا رہا باتیں
کچھ رات رہی تھی کہ زباں اس کی ہوئی بند

128

عاشقی ہرگز نہ کر، اے دل کہ ہے یہ کام بد	نیک کا بھی اس میں ہو جاتا ہے ووں ہی نام بد

ہے نتیجہ چاہ کا خواری و رسوائی سمجھ	کام یہ اچھا ہے، لیکن اس کا ہے انجام بد

1۔ مردم چشم = آنکھ کی پتلی 2۔ گھڑے کا جگر = پینڈا، تلا (روزمرہ) 3۔ ناگ پھنی = کانٹے دار
4۔ بند = کشتی کی اصطلاح، پینترے 5۔ بند ہونا = زچ ہو جانا

اپنے مذہب میں روا ہے روئے خوش کا دیکھنا لیکن اس کو جانتے ہیں صاحبِ اسلام بد

یک بیک یہ کیا ہوا گلزارِ ہستی میں چلی ہو گیا اُس کا جو رنگِ عارضِ گلفام بد

روزِ بہ کی کیا توقع ہم زمانے سے رکھیں سالہا گزرے ہے یوں ہی اپنا صبح و شام بد

شوق سے تو مجھ کو گالی دے ترے صدقے گیا خوب صورت کی بھی لگتی ہے کہیں دشنام بد

دیکھیں تو ہم جاگیں ساری رات یا تو صبح تک ہم سے شرط اس بات پر آج، اے بتِ خود کام، بد

مصحفی وہ غیرتِ مہ ہم سے گر ملتا نہیں

کس کا شکوہ کیجیے، اپنے ہی ہیں ایام بد

129

ہاتھ آجائے جو سیبِ ذقنِ یار کی گیند نہ چھوئیں ہم تو کبھی پھر گُلِ گلزار کی گیند

اس تمنا میں وہ سرگشتہ پڑا پھرتا ہے کہ بنے مہر ترے روزنِ دیوار کی گیند

دستِ قدرت میں ہے یوں ماہ معلّق بہ فلک جیسے رشتے میں ہو آویختہ معمار[1] کی گیند

گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہنچے تمھیں کہ پلٹتی ہے بری طرح سے سرکار کی گیند

ہاتھ آجائے جو شیریں کے، تو وہ کر کے عزیز سینہ بند اپنے میں رکھ لے مرے دلدار کی گیند

گیند بازی کا ہے اُس بزم عروسی میں مزہ کھائے ہے گُل کی طرح یار جہاں یار کی گیند

جان قالب میں نہیں ماہِ فلک کے اب تک اُس نے دیکھی تھی ترے قالب دستار کی گیند

گوے وچوگاں جو وہ طفلی میں کبھی کھیلے ہے سرِ مذبوح بنے ہے مرے خوں خوار کی گیند

گیند مقیّش[2] کا تیری ہے وہ عالم کہ کبھی نہ لگے جس کے تئیں ماہ کے رخسار کی گیند

چوٹ لگنے کو مرے اُس میں دھرے ہیں پتھرے[3] نہیں بیداد سے خالی بتِ عیار کی گیند

پھول گیندے کا جو میں سینے پہ مارا اُس کے اُس نے انگیا میں رکھا اس کو سمجھ پیار کی گیند

1۔ معمار ایک ڈوری میں لوہے کا گول ٹکڑا باندھ کر اُس سے دیوار کے سیدھی تعمیر ہونے کا اندازہ لگاتے ہیں

2۔ مُقیش = چمکیلا زر تار جس سے لباس وغیرہ کو سجاتے ہیں 3۔ پَتھرے = پتھر کے چھوٹے ٹکڑے (عوامی)

نکلے کچھ، جوں جوں معمائے فلک کو کھولیں　　ہم نے دیکھی نہ کہیں ایسی تو بستار[1] کی گیند
دل کو کیونکر نہ لگے چوٹ جو وہ وصل کی شب　　پھینکے غصے سے، بنا میری طرف ہار کی گیند
گیند خانے میں پڑھ اس کو کہ ٹک اُس سے اُلجھے　　آصف الدولہ بہادر کی بھی سرکار کی گیند
مصحفی ہے یہ غزل دوختۂ سوزنِ فکر
دیکھنے میں نہیں آئی ہے اِس اطوار کی گیند

130

چرخ زن جسم میں یوں ہے دلِ بیتاب کی گیند　　جوں کٹھالی[2] میں گرہ کھائے ہے سیماب کی گیند
لڑھتی[3] پھرتی نہیں خورشیدِ جہاں تاب کی گیند　　چرخ زن ہے یہ کسی کے دلِ بیتاب کی گیند
نہیں دریا میں حباب، اس کے تماشا کے لیے　　نت بناتی ہے نئی، موجِ ہوا آب کی گیند
ہے مرے قطرۂ ہر اشک کا اب یہ عالم　　پوٹ پانی کی ہو جوں کوزۂ دولاب کی گیند
خوں میں لوٹے ہے پڑا سر ترے بسمل کا جہاں　　رنگ پاتی ہے وہیں لالۂ سیراب کی گیند
اس کے ہاتھوں کی میں صنعت کے ہوں صدقے جس نے　　صاف مڑھ[4] دی ہے تمامی[5] سے یہ مہتاب کی گیند
چاہیے موسمِ ہولی میں چلے دست بہ دست　　قمقمہ رنگ کا اور جامِ مےِ ناب کی گیند
آصف الدولہ بہادر کی وہ گیندیں ہیں جنھیں　　باج دیتی ہیں سدا رستم و سہراب کی گیند
گو ے لے جاویں نہ کیوں زانوے معشوقاں سے　　گل بدن کی تھی کوئی، اور کوئی کم خواب[6] کی گیند
مصحفی گوہرِ نایاب سخن ہے تیرا
نذرِ نواب کر اس گوہرِ نایاب کی گیند

131

ہے پیش گاہِ دہر میں زردار کی نمود　　طرّے سے جیسے ہوتی ہے دستار کی نمود
کیونکر تری نگہ نہ لڑے خانہ جنگیاں　　ہوتی ہے بانکپن سے نمودار کی نمود

1۔ بستار = پھیلاؤ　2۔ کٹھالی = جس میں گرم کر کے سونا صاف کرتے ہیں　3۔ لڑھنا (بہ ضم اول) لڑکنا
4۔ مڑھنا = (بہ فتح اول) منڈھنا　5۔ تمامی = سجاوٹ کا سامان　6۔ گلبدن و کمخواب = کپڑے کے نام

سیلِ سرشک نے مرے جیدھر کو رُو کیا
باقی رہی نہ واں در و دیوار کی نمود

رکھ لے جلو میں کیو نکے نہ اشکوں کو لختِ دل
ہوتی ہے فوج سے ہی تو سردار کی نمود

کہتے ہیں شب وہ کشتۂ غم ہو گیا وداع
تھی جس کے خون سے تری تلوار کی نمود

یوسف نے اپنے منھ سے اُٹھایا تھا جب نقاب
دونی ہوئی تھی مصر کے بازار کی نمود

زلفوں سے اُس کی چمکے ہے عارض، تو اس کو ہم
کہتے ہیں: ہے یہ صبحِ شبِ تار کی نمود

چٹکی سے میری خاک سے کھینچے وہ کیو نکے تیر
جب مطلقاً نہ ہو لبِ سوفار[1] کی نمود

یاقوتِ سرخ لگ نہیں سکتا ہے آج تو
ہے رنگِ پاں سے ایسی لبِ یار کی نمود

کیا چمکے اُس کے کان کی بالی قرینِ رخ
پہلوے گل میں ہو نہ کبھی خار کی نمود

تعویذ رہ گیا ہے فقط اور کچھ نہیں
سنگِ مزارِ کشتۂ دیدار کی نمود

نقطہ ہے انتخاب کا گویا وہ خالِ رخ
جس سے ہوئی ہے اور بھی رخسار کی نمود

ایسی ہی یہ کہی ہے غزل تو نے مصحفی
ہو کیوں نہ ہر جگہ ترے اشعار کی نمود

132

سمجھیں ہیں ہم جو اُٹھتی ہے گاہے زمیں سے گرد
اس رہ گزر میں کتنے ہوئے ہیں ہمیں سے گرد

شاید کہ جل کے سینے میں دل خاک ہو گیا
جھڑتی ہے جو مری نفسِ آتشیں سے گرد

جاتا ہوں گر میں برہنہ پا نجد میں تو قیس
پانوں کی پونچھتا ہے مرے آستیں سے گرد

ہم داد خواہ عرصۂ محشر میں آئیں گے
تھوڑی سی کوے یار کی مل کر جبیں سے گرد

جب سوے نجد ناقۂ لیلیٰ رواں ہوا
ہو گرد باد اُٹھی قدمِ اولیں سے گرد

ہے جاے رشک یہ کہ تو ہوتا ہے جب سوار
جھاڑے ہے ہر کوئی ترے دامانِ زیں سے گرد

گزرا خیال ناقۂ لیلیٰ کا قیس کو
گاہے جو دشتِ نجد میں اُٹھی کہیں سے گرد

کون آئے گا چمن میں جو شبنم تمام شب
دھوتی رہی ہے روے گل و یاسمیں سے گرد

1۔ لبِ سُوفار = تیر کی نوک notch of an arrow

ناقہ اَٹا[1] ہے خاک میں اتنا کہ آج قیس جھاڑے ہے روے لیلیِ محمل نشیں سے گرد
پٹکا تھا جس زمیں پہ مجھے آسمان نے دیکھو تو اب تک اُٹھتی ہے کیا یہ وہیں سے گرد
اس خاکداں میں رہنے کا کیا لطف مصحفی
جھڑتی ہے قصرِ کہنۂ چرخِ بریں سے گرد

133

گلی سے آتی ہے اس کی صبا غبار آلود نہ کیونکے ہووے چمن کی ہوا غبار آلود
برہنہ پا نہ قدم رکھ تو میری تربت پر مبادا ہو ترا رنگِ حنا غبار آلود
مِلا جو منھ پہ بھبوت اُس نے اپنے ہولی میں اک آئنہ تھا کہ وہ ہوگیا غبار آلود
دُرِ یتیم کے مانند اپنا قطرۂ اشک رہے ہے آب میں با ایں صفا غبار آلود
کہے تھا تجھ سے میں پیارے کہ دیکھ سرمہ نہ دے ہوئی نہ وہ نگہِ سرمہ سا غبار آلود؟
حصول اہلِ تردد کو کیا ہے دنیا سے مگر یہ ہوتے ہیں جوں آسیا[2] غبار آلود
تو ہے غلامِ علی، مصحفی بہ سجدۂ بت
جبیں کو کر نہ براے خدا غبار آلود

ذ

134

گلے میں چاہیے کیا تجھ کو، سیم بر تعویذ لٹکتے ہیں تری ہیکل[3] کے تا کمر تعویذ
جبیں پر اُس کی پڑا چاند سا چمکتا ہے کیا ہے اُس نے جو چاندی کا زیب سر تعویذ
تو پتلیاں مری ٹوپی پہ جائے چشمک[4] ٹانگ کہ چشمِ بد کے لیے ہے یہ کارگر تعویذ
لکھے رقیب جو عاشق کے حق میں نقشِ ہلاک مزہ تو تب ہے کہ الٹا کرے اثر تعویذ

1۔ اَٹنا = دھول بھر جانا (روزمرہ) 2۔ آسیا = چکی 3۔ ہیکل = گلے کا زیور
4۔ چشمک = جھلملاتے ہوئے ریزے

ہوا نہ نرم ترا دل اگرچہ میں نے بہت بہائے آب میں لکھ لکھ کے ہر سحر تعویذ
یہ زورِ نقشِ مربع[1] کسی نے تجھ پہ بھرا کہ چاروں کھونٹ[2] گڑے نکلے تیرے گھر تعویذ
نمود چاہیے کیا اس کے خاکساروں کو بنائیو نہ کوئی ان کی گور پر تعویذ
ہمیشہ کاہے کو در پر کھڑا رہے تھا وہ شوخ کوئی تو گاڑ گیا زیرِ سنگِ در تعویذ

گر اپنے ہاتھ کا چھلا وہ مصحفی تجھے دے
مڑھاکے[3] تو اُسے بازو کا اپنے کر تعویذ

ر

135

زاہد کے نہیں داغِ سیہ رنگ جبیں پر ہے آئنۂ دل کی لگی زنگ جبیں پر
بنی کا نہ پوچھ اس کی تو کچھ ڈھنگ جبیں پر کافر نے دکھائے ہیں کئی رنگ جبیں پر
کھینچا ہے جو اُس بت نے کئی رنگ کا قشقہ آتا ہے نظر عالمِ نیرنگ جبیں پر
ہر اک اُسے کھینچے ہے زبس اپنی طرف کو باہم مہ و خورشید میں ہے جنگ جبیں پر
قاشِ مہِ نو جیسے شفق میں ہو نمایاں اک پیچ[4] کا اس گل کے ہے یہ ڈھنگ جبیں پر
سختی سے نصیبوں کی شبِ ہجر میں تجھ بن گاہے ہے جبیں سنگ پہ، گہ سنگ جبیں پر
دیتا ہے وہ ہندو بچہ صندل کا جو چھاپا حسن اُس کا دکھاتا ہے کئی رنگ جبیں پر
بدلی میں چھپا جائے ہے مہ، دیکھ یہ عالم بالوں کا جبیں کے ہے جو آہنگ جبیں پر
جھک جھک کے جنھیں کرتے ہیں ہم دور سے مجرا ہے ہاتھ کا رکھنا بھی انھیں ننگ جبیں[5] پر

اے مصحفی اب اپنا یہ عالم ہے کہ جیسے
رکھ ہاتھ کو بیٹھے کوئی دل تنگ جبیں پر

1۔ نقشِ مربع = تعویذ کی قسم 2۔ کھونٹ = طرف، گوشہ 3۔ مڑھاکے = سِلواکے یا اُس پر چاندی کا خول لگوا کر۔ 4۔ اک پیچا = ایک پیچ کی دستار 5۔ مغلیہ خاندان کی ایک خصوصی ادا یہ تھی کہ وہ کسی کے سلام کا جواب نہ دیتے تھے

136

بیٹھے ہے جو کوئی اُس بتِ پُرفن کے برابر　اُس دوست کو ہم سمجھیں ہیں دشمن کے برابر

میں کشتۂ رنگِ مسی و پانِ بتاں ہوں　رکھیو مجھے، یارو گل و سوسن کے برابر

گزروں ہوں جوں آگے سے میں اس بت کے تو وہ بھی　منھ اپنا لگا دیوے ہے چلمن کے برابر

انداز تو بسمل کا سمجھ اپنے، وہ کیسا　رہ جائے ہے آکر ترے دامن کے برابر

اس کُو میں یہ قدغن ہے کہ اس رہ سے جو گزرے　آنکھ اپنی نہ لاوے کبھی روزن کے برابر

کیا جانیے اُس تیغ کو کیا سوجھے ہے اُس دم　پھر جائے ہے آ آکے جو گردن کے برابر

نرمی کی توقع نہ رکھ اے مصحفی اُن سے
ان سنگ دلوں کا ہے دل آہن کے برابر

137

تختے پہ تباہی کے ہوں، ساحل ہے ابھی دور　کیا جانے میں کب پہنچوں گا، منزل ہے ابھی دور

پانوؤں میں مرے طاقتِ رفتار نہیں اور　کوچہ بتِ خوں خوار کا، اے دل ہے ابھی دور

آگے ہی میں تڑپوں ہوں پڑا خون میں، یارو　ہر چند کہ مجھ سے مرا قاتل ہے ابھی دور

کیا بیٹھ رہا تھک کے مغیلاں[1] میں تو مجنوں　چل پانو اُٹھا جلد کہ محمل ہے ابھی دور

ہے شور مرا سلسلۂ اہلِ جنوں میں　پانوؤں سے مرے گرچہ سلاسل ہے ابھی دور

کیوں اتنا ہٹا جائے ہے دہشت سے تو قاتل　تجھ سے تو تری تیغ کا بسمل ہے ابھی دور

اے مصحفی گو طیِ مکاں[2] تو نے کیا ہے
پر منزلِ مقصود تو غافل ہے ابھی دور

138

میں کیا کہوں اس نغمۂ مستور کی تصویر　آواز سے کھینچی ہے تری نور کی تصویر

1۔ مغیلاں = کیکر کے کانٹے (Thorns of the Sweet lote)

2۔ طیِ مکاں (درویشوں کی اصطلاح) طویل فاصلے کو آنِ واحد میں طے کر لینا

لغزش ہوئی مانی کے وہیں دست وقلم کو کھینچے تھا تری نرگسِ مخمور کی تصویر
یارو کوئی اس کو وہ ورق جا کے دکھا دو جس پر ہو بہم ناظر و منظور کی تصویر
رعنائیِ گُل مل گئی ہے خاک میں، اُس نے دیکھی تھی کہیں اُس بتِ مغرور کی تصویر
اُس عارضِ رنگیں پہ نہیں زلفِ پریشاں ہے گل کے ورق پر شبِ دیجور کی تصویر
آتا ہے یہ جی میں سرِ بازار لگا دوں کھنچوا کے ترے عاشقِ رنجور کی تصویر
تو کس کا بنایا ہے جو تصویر کو تیری نقشا نہ پری کا لگے، نے حور کی تصویر
مانی نے مرے سر کو لکھا پانو پر اُس کے کھینچی تو یہ کھینچی مرے مقدور کی تصویر
بیٹھا ہوں میں یوں تیغ تلے سر کو جھکائے جیسے کوئی کھینچے کسی مجبور کی تصویر
دانے یہ زمرد کے نہیں کان میں اُس کے لٹکے ہے پڑی خوشۂ انگور کی تصویر
اے مصحفی حق جان کا دشمن ہے، نہ دیکھی
سولی پہ کھنچی حضرتِ منصور کی تصویر

139

روبرو اُس کے تو اس شرم پر آیا کیوں کر آرسی نے تجھے حیران ہوں دیکھا کیوں کر
جانتا ہے کہ یہ وعدے پہ نہیں ٹلنے کا وہ مرے ساتھ کرے وعدۂ فردا کیوں کر
رشک ہے طالعِ مجنوں صفتوں پر، یہ لوگ عاشقی کرتے ہی ہو جاتے ہیں رسوا کیوں کر
سوچ دن رات یہی ہے ترے دیوانے کا جایئے شہر کو، پر چھوڑیے صحرا کیوں کر
مجھ دوانے کے جب آنے کی خبر اُس کو نہ ہو دیکھنے آئے وہ کوٹھے پہ تماشا کیوں کر
دل دیا ایسے کو کچھ جس سے نہیں بس چلتا واسطے دل کے پھر اب کیجے تقاضا کیوں کر
رک رہا ہے ترے بیمار کا دم چھاتی میں اب علاج اُس کا کرے آہ مسیحا کیوں کر
اُس کی قسمت دو جہاں، اپنی بساط اک یہی دل ہم غریبوں کا بنے ایسے سے سودا کیوں کر
مصحفی میں بھی تو دنیا سے نہیں کچھ باہر
چھوڑیے دوستیِ مردمِ دنیا کیوں کر

140

تھا سرخ پوش کوئی شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو وسمن کے اندر

بارانِ گریہ اب کے ایسا ہوا کہ آنکھیں
پانی اُلیچتی[1] ہیں بھر بھر لگن کے اندر

جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے
وہ کھنچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر

گورے بدن کا اُس کے عالم میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑا[2] تھا پیرہن کے اندر

شکوے کا نامہ اُس نے وہ خونچکاں لکھا تھا
چھریاں دھری تھیں جس کی ہر اک شکن کے اندر

یاروں کو ہے وصیت یہ بیت لکھ کے رکھ دیں
جائے جوابِ نامہ میرے کفن کے اندر

اب چین سے ذرا ہم پھیلا کے پانْو سوئے
جاگے تھے رات ساری، اُس انجمن کے اندر

وعدہ نہ مصحفی سے جھوٹا کرو کہ صاحب
ہے اک زباں حلال اس سارے بدن کے اندر

141

جب اُس نے ہاتھ دھوئے خونِ عاشق سے ذرا مل کر
کیا اس رنگِ اصلی کو غلط رنگِ حنا مل کر

میں سمجھا تھا کہ تم جس وقت چھوڑو گے خیال اس کا
مَلو گے دل کو چٹکی میں، سرِ بندِ قبا مل کر

کفِ کا کس کے نقشا یاد آیا اُس کو، گلشن سے
چلی پانْو تلے پھولوں کو کیوں بادِ صبا مل کر

کچھ ایسی ہوگئی حالت مری شب، جس سے غش آیا
بدن سے آئے تھے یوں تو وہ بٹنا[3] بارہا مل کر

1۔ اُلیچنا = (جیسے گھر میں) بھرا ہوا پانی باہر نکالنا (روزمرّہ) 2۔ جھمکڑا = جھلملاتا ہوا انگڑا، پیکر
3۔ بٹنا (اُبٹن) = دیسی غازہ، جلد کو نکھارنے کے لیے

پڑے کیا آنکھ تاروں پر، مجھے اُس مہ نے ہولی میں
سمیں[1] دکھلائے ہیں مکھڑے سے بھوڈل[2] جابجا مل کر

جو شب باشی (سے) صدمہ ان پہ کچھ گزرا تو گھر آ کر
چھپایا درد اپنا صبح دم، سر سے دوا مل کر

معاذ اللہ کہ ہو اِس پر گماں کُچ گرد[3] عاشق کو
نہ دھویا کر تو یوں پانی سے مکھڑا چاند سا مل کر

سر اپنا میں لیا پیٹ، اس ادا سے صبح دم نکلا
جبیں سے صندلِ سائیدہ وہ کافر ادا مل کر

جو عالم اُس پری کا غسل میں دیکھے ہے کہتا ہے
کھڑی گنگا میں دھوتی ہے بدن کو رادھکا مل کر

کہا مجموعۂ خوبی اُنھوں کو سب نے مجلس میں
وہ آ بیٹھے تھے شب چوٹی سے تھوڑا ارگجا[4] مل کر

نہیں تاب اس الم کی مصحفی یہ جی میں آتا ہے
مسل ڈالوں ابھی چٹکی میں دل کا آبلا مل کر

142

تنگ آ کر کے ترا عاشقِ زار آخر کار　　مر گیا غم میں ترے آپ کو مار آخر کار
نظر آیا نہ مجھے جب رخِ یار آخر کار　　جا کے میں بیٹھ رہا جان کو مار آخر کار
بادۂ عشق کو مت پی کہ پشیماں ہوگا　　توڑ ڈالے ہے بدن اس کا خمار آخر کار
سنگِ دہلیز پہ خسرو کے لکھا تھا کہ یہ سنگ　　ہووے گا تعبیۂ لوحِ مزار[5] آخر کار
سوزن و رشتہ کو لے کر کے تب آیا ناصح　　رہ گئے جیب کے یاں جب دو سہ تار آخر کار

1۔ سمیں = مناظر 2۔ بھوڈل، ابرک کا بنا ہوا رنگ جو ہولی میں مَلا جاتا ہے 3۔ کچ گرد = کوچہ گرد کا مخفف ہے (عوامی) 4۔ ارگجا = چند خوشبوؤں کا مرکب جو چہرے اور بالوں پر ملا جاتا ہے
5۔ تعبیہ لوحِ مزار ہوگا = لوحِ مزار پر لگایا جائے گا

خاک سے جس کی تو دامن کو سدا جھٹکے تھا — منھ پہ بیٹھا ترے اُس کا ہی غبار آخر کار
رنگِ سرخ اپنے پہ مغرور نہ ہو، اے منعم — سیر دکھلائے گی تجھ کو یہ بہار آخر کار
لے گیا جذبِ محبت طرفِ وادی قیس — کھینچ کر ناقۂ لیلیٰ کی مُہار آخر کار

مصحفی میں تجھے کہتا تھا کہ تُو عشق نہ کر
لب پر آئی نہ تری جانِ نزار آخر کار؟

143

ہوئی ہے چاہ ثابت جب سے اپنے اور بگانے پر
ہزاروں توتیے[1] بندھتے ہیں یاں اک میرے آنے پر

غضب یہ ہے کہ اُس کا مجھ کو صاحب خانہ کہتے ہیں
قدم رکھا نہیں اب تک میں جس کے آستانے پر

گناہ اتنا ہی میرا ہے کہ ٹک اس کو سراہا تھا
کیا تھا غش میں کب اُس شاخِ گل کے کھلکھلانے پر

بلایا تھا مجھے کب گھر میں اپنے پیار سے اُس نے
میں کب دوڑا گیا تھا شاد ہو اُس کے بلانے پر

ٹھٹکتے کس نے دیکھا تھا مجھے اُس در کے آگے، ہائے
یہ تہمت لگ گئی ناحق کو سیدھی راہ جانے پر

کب اندازِ خرام اس کا کیا تھا میں نے نظروں میں
گیا تھا لوٹ دل کب پانو کی ٹھوکر لگانے پر

دکھاتا سب بدن مجھ کو تو مجھ پر کیا غضب آتا
بندھے یہ باندھنو[2] جس کے فقط اک منھ دکھانے پر

1۔ توتیا باندھنا = الزام لگانا، تہمت — 2۔ باندھنو = الزام

ق

غزل کب اُس کی نک سک کی پڑھی میں روبرو اس کے
جلے ہے جی مرا لوگوں کی ہی باتیں بنانے پر

پڑھے تھے شعر تو، ہاں، اس کا میں منکر نہیں ہوتا
نہ تھا منشا پر اُن کا اپنا حالِ دل سنانے پر

کب اس نازک کمر کا مصحفی مضموں میں باندھا تھا
کمر باندھی ہے بدگویوں نے کیوں میرے ستانے پر

144

آسودگانِ خاک کے عالم کی سیر کر　کیا چپ پڑے ہیں مجلسِ ماتم کی سیر کر
کیا تعزیوں پہ سینہ زنی ہو رہی ہے ہائے　ماتم گراں کے ماہِ محرّم کی سیر کر
اک قرصِ ماہ کے نظر آتے ہیں سو ہلال　عارض پہ اُس کے طرۂ پُر خم کی سیر کر
میری نگاہ اس کے رخ و زلف پر ہے لیک　سینہ یہی کہے ہے کہ مُحرم[1] کی سیر کر
کہتا ہے جاں کنی میں مجھے دیکھ کر رقیب　اُس شوخ سے، اب اس کے ذرا دم کی سیر کر

اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ، بے نصیب
چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر

145

رکھتا ہے قدم ناز سے جس دم تو زمیں پر　کہتے ہیں فرشتے تجھے جے[2] عرشِ بریں پر
بس اِس میں ہی اپنا تو ذرا رہ گیا پردہ　عاشق نہ ہوئے ہم جو کسی پردہ نشیں پر
یاروں کی یہ مرضی ہے کہ ساتھ اُس کا نہ دیویں　یعنی تری فرقت میں جو کچھ ہو، سو ہمیں پر
گھوڑا وہ اُڑاتے ہی گیا خاک سے میری　تا گرد بھی اُڑ کر نہ پڑے دامنِ زیں پر

1۔ مُحرم = انگیا　2۔ جے کہنا = تعریف

کیا جانے تو کیا شے ہے کہ نادیدہ ترا رخ　جی لوٹ گیا ہے تری آوازِ حزیں پر
پاپڑ ہی میں بیلے ہیں سدا عشق میں اس کے　جب آنکھ پڑی ہے کسی طفلِ نمکیں پر
چقماق کے مانند جھڑی اُس سے پھر آتش　مارا میں دو ہنٹر[1] جو دلِ صبر گزیں پر
تسخیر میں اپنی ہے پری زاد کا عالم　ہے اسمِ محبت جو کُھدا دل کے نگیں پر
جب سیکڑوں خواہاں ہوں ترے چاہنے والے　عصمت کا گماں کیونکے رکھیں تجھ سے حسیں پر
قاصد نے دمِ نزع کہا کان میں میرے　اب وصل کا وعدہ ہے دمِ باز پسیں پر
اک کاسۂ سر نے یہ کہا راہ میں مجھ کو　ق　ناگہ جو نظر میری پڑی اُس کی جبیں پر
اے مصحفی ٹک دیکھیو قسمت کا لکھا ہائے
اب تک بھی میں رُلتا ہوا پھرتا ہوں زمیں پر

146

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چُرا کر　شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چُرا کر
یہ شمع کو لگا ہے جو چور رفتہ رفتہ　مجلس سے لے نہ جاوے اس کا لگن چُرا کر
ہونے دے خوش کسی کو، سچ کہہ تو کیا کرے گا　موجِ تبسّم اپنی، اے خوش دہن چُرا کر
ہم خوابہ[2] کون تیرا عیار تھا وہ ایسا　بازو سے لے گیا جو شب نورتن چُرا کر
کب مشک میں یہ بو تھی زلفوں کی تیرے اے گل　خوشبوئی لے گئی ہے بادِ خُتن چُرا کر
ہر داغِ نو میں اپنے پاتا ہوں اک تری سی　یہ ظلم لائے، پانی زخمِ کہن چُرا کر
دزدِ حنائے پا سے ہشیار رہیو، غافل!　یہ لے نہ جائے تیرا کفشِ چکن[3] چُرا کر
مفتوں کی اپنے تم نے تب ناز سے خبر لی　نبّاش[4] لے گئے جب اُس کا کفن چُرا کر
باندھا کریں ہیں کیا کیا، اے مصحفی برشتے[5]
مضمونِ تازہ میرے یہ ہم سخن چُرا کر

1۔ ہنٹر = کوڑا　2۔ ہم خوابہ = ساتھ سونے والا　3۔ کفشِ چکن = کامدانی کا جوتا
4۔ نبّاش = کفن چور　5۔ برشتے باندھنا = دون کی لینا

147

کس کو بھیجوں، کون لا دے یارِ جانی کی خبر　　خضر ہو تو دے کچھ آبِ زندگانی کی خبر

جس کے ہر اک عضو پر جی اپنا لوٹے جائے ہے　　ہائے اُس کو بھی نہیں اپنی جوانی کی خبر

بے قراری میں کوئی اے کاش یہ آ کر کہے　　"لے تری خاطر میں لایا ہوں فلانی کی خبر"

جی ہی جی میں جی رُندھا کرتا ہے اپنا رات دن　　ہمدموں کو کیا ہے اس دردِ نہانی کی خبر

جب قلق میں مار کر اپنے تئیں ہم مر گئے　　اُس کو تب پہنچی ہماری جاں فشانی کی خبر

پیار کی چتون سے اُس کی آنکھ مجھ پر پڑ گئی　　مجھ کو کب تھی اِس بلائے ناگہانی کی خبر

مصحفی تو روز اس کُو سے سرایاں[1] جائے ہے
اس کو بھی پہنچے ہے تیری شعر خوانی کی خبر؟

148

جی جائے ہے اپنا تو تری چال کے اوپر　　ظالم تو نظر کر مرے احوال کے اوپر

کیا فکر کروں چڑھتی ہی جاتی ہے سیاہی　　دن رات مرے نامۂ اعمال کے اوپر

سودائے جنوں ہے جو دو چند، اپنی یہ آنکھیں　　کیا جانے پڑیں کس کے خط و خال کے اوپر

کیا خون میں ڈوبا ہوا آتا ہے وہ قاتل　　کیجو نظر اس پیرہنِ آل کے اوپر

رکھتے ہیں جو سینے میں سکت زخمِ ستم کی　　وہ تیغ تری روکیں ہیں کب ڈھال کے اوپر

اک لطف سے خالی نہیں پیتے ہوئے قلیاں　　یہ دانت کا رکھنا ترا مُنہنال کے اوپر

کس کس کی اجل آئی ہے اس بزم میں دیکھیں　　خوں کتنوں کے ہوں اس شفقی شال کے اوپر

نامہ جو جفاؤں کا تری باندھ دیا ہے　　ہے ظلم کبوتر کے پر و بال کے اوپر

بے وجہ نہیں سوکھ کے کانٹا ہوا، شاید　　عاشق ہے مہِ نو تری خلخال کے اوپر

فصّاد میں دیوانۂ یک روئے نکو ہوں　　نشتر نہ لگانا مری قیفال[2] کے اوپر

1۔ سرایاں = گاتا ہوا　2۔ قیفال = ایک رگ جس سے خون نکالا جاتا ہے

گریہ کی یہ شدت ہے کہ اب ہجر میں اُس کے رہتی ہیں نت آنکھیں مری رومال کے اوپر
گُل کھانے کا مضموں میں جس خط میں لکھا تھا باندھا اُسے بازوے گُلی خال[1] کے اوپر
اے مصحفی اس کو بھی ہے اک حسن سے نسبت
وارفتہ ہیں تب تو اُمرا گال کے اوپر

149

آخر کو مصحفی نے دی جان تیری خاطر جی سے گزر گیا وہ، نادان تیری خاطر
لے تو تو پاس اپنے اس نے لگا رکھا ہے بھر کر سپاریوں کا دُلمیان[2] تیری خاطر
انساں ہے یا پری ہے، کیا جانیے تو کیا ہے دیتے ہیں جان لاکھوں انسان تیری خاطر
کیا کیا جفا سہی ہے اس نیم جاں پہ میں نے یہ جان میری تجھ پر قربان تیری خاطر
گر تو نہ ہو تو ہم کو کیا کام زندگی سے ہے سب یہ زندگی کا سامان تیری خاطر
اس شوق پر نظر کر لایا ہے آسماں سے چاندی کا مہ بنا کر گلدان تیری خاطر
گر سامنے تُو میرے کھاوے تو جان میری پکھرو[3]ٹے لے کے آؤں میں پان تیری خاطر
تو شعرِ مصحفی کو جی سے سنے تو پیارے
پڑھ جاؤں میں تو سارا دیوان تیری خاطر

150

کوہِ غم کا جو رکھا عشق نے سر پر پتھر دو قدم بھی نہ چلا ہم سے وہ بجّر[4] پتھر
نہ ہوا نرم مری گریہ و زاری سے کبھو ہے دلِ سخت ترا، اے بتِ کافر پتھر
خاک اس کوچے کی کیا معدنِ زر ہے جس سے نیاریے[5] رول کے لے جاتے ہیں کنکر پتھر
لے کے فرہاد نے چھاتی سے لگا اُس کو لیا نقشِ شیریں سے ہوا جب کہ مصوّر پتھر

1۔ گُلی خال = دیسی کبوتر کی ایک قسم 2۔ دولمیان = تھیلی، میانی 3۔ پکھروٹے = پکّے دیسی پان
4۔ بجّر = بھاری (روزمرہ) 5۔ نیاری = وہ لوگ جو سونے کی تلاش میں خاک چھانتے ہیں

سر پٹکتا ہوں، یہ ڈر ہے کہ نہ ہو جائے کہیں　　آستانے کا ترے، خوں سے مرے، تر پتھر
ہووے جس سنگ پہ جا کردہ، ترا نقشِ قدم　　چاہیے ہو سرِ شاہاں کا وہ افسر پتھر
فرشِ گل پر تُو وہاں سووے ہے، اور یاں پیارے　　تیرے دیوانے کا ہے بالش[1] و بستر پتھر
سینہ کوبی کے لیے ہم نے شبِ ہجر کے بیچ　　سنگِ خارا سے نہ دیکھا کوئی بہتر پتھر
ژالہ باری نہ سمجھنا تو ہمارے گھر پر　　ہم گنہگار ہیں جو پڑتے ہیں ہم پر پتھر
داغ چھاتی کے اُسے اُٹھ کے دکھاؤں پسِ مرگ　　کاش کھولے مری تربت کے وہ آ کر پتھر

مصحفی کے تئیں نیند آئے سو کیا خاک، میاں
خشت بالیں ہے تری کُو میں، تو بستر پتھر

151

رکھ کے چھاتی پہ جو اک مُکّے سے توڑے پتھر　　کیا عجب اُس کا اگر سر سے بھی پھوڑے پتھر
ٹھوکریں کھائے ہے ہر گام پہ واں پائے تلاش　　بس کہ اُس کُو میں پڑے رہتے ہیں روڑے پتھر
شکلِ رزمیہٗ عالم نہیں بت خانے سے کم　　ہیں سوار اس کے جو تصویر، تو گھوڑے پتھر
چرخِ دَوّار[2] نے یوں مجھ کو زمیں پر پٹکا　　جوں فلاخن[3] میں پھرا کر کوئی چھوڑے پتھر
زخمِ بیداد کی لذت سے اگر ہو آگاہ　　منھ کبھی دشنہ و خنجر سے نہ موڑے پتھر
میں جو چھاتی کو چھوا دخترِ رز کی، بولی　　ہے ترا ہاتھ تو سختی میں نگوڑے، پتھر
وادیِ عشق کی وہ راہ ہے طاقت فرسا　　کہ جہاں بیٹھے ہیں پکڑے ہوئے کوڑے پتھر
کیوں نہ ہو شیشۂ دل چُور مرے پہلو میں　　میں نے ایام جنوں کھائے تھے تھوڑے پتھر؟

اک غزل اور سن اے مصحفی تو مجھ سے کہ میں
خوب تر لعل و زمرّد سے ہیں جوڑے پتھر

152

مارے ٹکروں کے یہ جب تک کہ نہ توڑے پتھر　　دلِ سودا زدہ کب ہاتھ سے چھوڑے پتھر
مار ڈالا ہے مجھے سنگ دلی نے اُس کی　　میری بالین پہ رکھ دیجیو تھوڑے پتھر

1۔ بالش = تکیہ　2۔ دَوّار = چکر لگانے والا　3۔ فلاخن = غلیل کی طرح کا ہتھیار

دلِ عاشق پہ لگے جوں کفِ معشوق سے پھول — کبھی اس طرح سے شیشے کو نہ پھوڑے پتھر
عشق کی راہ میں یوں ہوتے ہیں فرسودہ درست — جیسے گھس گھس کے بنیں باٹ کے روڑے[1] پتھر
پنجہ پر شیر سے ہوتا نہیں کچھ اتنا کام[2] — آہنی پنجہ جو چاہے تو مروڑے پتھر
لوحِ خارا پہ الف[3] کے ہیں نشاں واں لاکھوں — میرے نالوں سے جہاں کھاتے ہیں کوڑے پتھر
بچیو مت تو پھڑی کی پھڑی[4] اے سنگ فروش — میرے مرقد کو بھی رکھ لیجیو تھوڑے پتھر
میں وہ دیوانہ نہیں دیکھ کے جس کی صورت — وادیِ نجد میں بھوں اپنے سکوڑے[5] پتھر

خونِ فرہاد چوئے[6] مصحفی اب بھی اُن سے
بے ستوں کے جو کوئی جا کے نچوڑے پتھر

153

مجتمع تھے جو مری خاک پہ تھوڑے پتھر — وہ بھی اِس فصل میں لڑکوں نے نہ چھوڑے پتھر
لشکرِ غم کی تعدّی کا کروں کیا شکوہ — جس نے سنگین محل صبر کے توڑے پتھر
سنگ باراں ترے دیوانے کو لڑکوں نے کیا — جس بیاباں میں، وہاں فرش تھے روڑے پتھر
گر کرے قہرِ خدا صورتِ نوعی تبدیل — مسخ ہو ہو کے بنیں آدمی، گھوڑے، پتھر
اس توقع پہ میں چاٹوں ہوں الونی بیل[7] کو — کذا کہ وہ آپ آ کے لحد کے مری جوڑے پتھر
طشت میں رنگِ حنا اُس سے چُوئے بعد از غسل — سنگِ[8] پا کا جو کوئی اُس کے نچوڑے پتھر
مجھ پہ احسان ہو یہ، عالمِ بالا سے اگر — آبگینے پہ فلک کے کوئی چھوڑے پتھر

1۔ باٹ کے روڑے = پتھر جو گھس کر گول ہو جاتے ہیں، اِن سے وزن کا کام بھی لیا جاتا تھا اس لیے تولنے کے واسطے ''باٹ'' استعمال ہوتا ہے۔ حالانکہ باٹ راستے کو کہتے ہیں۔ جیسے ''بارہ باٹ اٹھارہ پینڈے'' یا بٹ مار۔
2۔ پنجہ میں شیر کی تصویر بنانے سے کچھ نہیں ہوتا 3۔ الف ایک آلہ تھا جس سے لوہے پر صیقل کر کے آئینہ بناتے تھے 4۔ پھڑی کی پھڑی = سارا اسٹاک (پھڑ منڈی میں وہ جگہ جہاں ایسا سامان جیسے لکڑی، پتھر وغیرہ رکھے جاتے ہیں) 5۔ بھوں سکیڑنا = ناگواری کا اظہار مگر مصحفی سکوڑنا استعمال کیا ہے۔ روزمرہ بول چال میں یہ بھی شامل ہے 6۔ چُونا = ٹپکنا 7۔ الونی بیل وہ مسالا جو پتھر جوڑنے کے لیے بنایا جاتا تھا 8۔ سنگِ پا = وہ کھردرا پتھر جسے غسل کرتے ہوئے پیروں کا مَیل صاف کرتے ہیں

مصحفی عاشقِ صادق ہے تو مت عشق سے بھاگ
منھ کبھی آتشِ سوزاں سے نہ موڑے پتھر

154

سجدہ گاہ اپنی کیے راہ کے روڑے پتھر　　کعبہ و دیر کے میں چوم کے چھوڑے[1] پتھر
شیشۂ دل جو مرا شیخ نے توڑا تو وہیں　　جا کے مسجد کی میں دیوار کے توڑے پتھر
قصرِ لیلیٰ کے لیے نجد سے تُو اے مجنوں　　کیا ہو لے آوے اگر ناقے پہ تھوڑے پتھر
میں گر آہن ہوں مری جان، تو تُو مقناطیس　　چاہیے یوں کہ منھ آہن سے نہ موڑے پتھر
لے کے دل کو مرے، یوں اُس نے چھپا رکھا ہے　　جیسے پارس کا کوئی پا کے نہ چھوڑے پتھر
طرفِ بام میں اُس بت کے جو دیکھا تو وہیں　　اس نے دو تین مرے سر پہ بھی چھوڑے[2] پتھر

مصحفی راے پتھورا کے وہ ہیں اب بھی نشاں
تھے عمارت کے لیے اس نے جو جوڑے پتھر

155

دل لے گئے آنکھوں میں یہ تدبیر لگا کر　　آئے تھے جو کل سرمۂ تسخیر لگا کر
جب لگ نہ سکا دل کا مرے ان سے نشانا　　مژگاں تری بس رہ گئیں دو تیر لگا کر
ہے لاش پہ کشتے کی ترے طرفہ تماشا　　ہر ایک چلا جائے ہے شمشیر لگا کر
نالہ تو مرا عرش پہ جاتا نہیں لیکن　　لے جاتی ہے ساتھ اُس کو یہ تاثیر لگا کر
ہے دعویِ بیجا یوں ہی ناوک فگنوں کو　　فتراک سے لائے کبھی نخچیر لگا کر؟
کھلتا نہیں جب در تو چلے جاتے ہیں مردم　　آنکھوں سے ترا حلقۂ زنجیر لگا کر
یاد آئے ہے جب مجھ کو ترے پیار کا نقشا　　روتا ہوں گلے سے تری تصویر لگا کر
شب ہم سے جو روٹھے تو ہمیں چھوڑ کے باہر　　جا گھر میں الگ سو رہے، زنجیر لگا کر

1۔ پتھر چوم کے چھوڑنا = تیاگ دینا　2۔ یہ اگر ''جھوڑے'' ہے تو جھاڑے کی عوامی شکل ہو سکتی ہے

ہے کلکِ دبیراں[1] سے یہ تنخواہ میں کھٹکا پھر سود لگاویں گے یہ تحریر لگا کر

اے مصحفی دل پھُنکنے لگا رات سے میرا
کیا آگ گیا نالۂ شب گیر لگا کر!

156

جانے دیتا میں نہ تھا جس کو نظر سے باہر اب لگا رکھنے قدم شب کو وہ گھر سے باہر

یاد ہیں شوخی و بیباکی کے ایام، کہ تم کبھی غرفے سے نکلتے، کبھی در سے باہر

منھ سے پروانے کے نکلا بھی تو حی[2] اے شمع شعلہ جب اُس کے ہوا پھوٹ کے سر سے باہر

کس کا پیکاں یہ مرے دل میں لگا تھا یارب جو ہوا توڑ کے پہلو کو جگر سے باہر

قفل دروازے کو لگوائے تھے میں نے شبِ وصل یا الٰہی یہ گئی رات کدھر سے باہر

ہم تمھیں دوڑ کے کولی[3] میں نہ بھر لیویں گے نیمچہ جب تیئں نکلے گا کمر سے باہر

دلِ عُشاق سِناں نے تری یوں بیندھے[4] ہیں رشتہ سر کاڑھے[5] ہے جوں سلکِ گُہر سے باہر

گھر میں جاتے جو میں کل کھینچا تھا دامن اس کا اب نکلتا ہی نہیں وہ مرے ڈر سے باہر

کس کے آگے میں کہوں، کون کرے گا باور رات نکلا تھا جو اس دیدۂ تر سے باہر

لعل کا تکمہ ترا دیکھے تو خورشید کبھی سر نکالے نہ گریبانِ سحر سے باہر

مصحفی دلّی کو پھر کر جو نہ دیکھا ہم نے
کس گھڑی نکلے تھے اُس اُجڑے نگر سے باہر

157

گلے سے لگ، کہ مرے جی کا حال ہے کچھ اور میں جاں کو روؤں ہوں، تجھ کو خیال ہے کچھ اور

ملالتِ غمِ دنیا نہیں ملالتِ عشق کہ یہ ملال کچھ، اور وہ ملال ہے کچھ اور

فراقِ یار کو ہم عینِ وصل سمجھیں ہیں غلط کہا ہے کسی نے وصال ہے کچھ اور

1۔ دبیر = دفتر کے منشی، کلرک۔ کِلک = قلم۔ کھٹکا = اندیشہ 2۔ حَیّ (عربی) زندہ باد

3۔ کولی (بروزن قَولی) آغوش (روزمرّہ) 4۔ بیندھنا = موتی پرونا 5۔ کاڑھنا = نکالنا

قدم سنبھال کے رکھیو زمیں پہ، کہتا ہوں
سنو ہو جان، زمانے کی چال ہے کچھ اور

میں بے حیائی سے جیتا ہوں، ہجر میں تیرے
ہزار حیف تجھے احتمال ہے کچھ اور

اشارۂ خمِ ابرو ہے اُس کا از پئے قتل
شفق میں آج جو رنگِ ہلال ہے کچھ اور

تو آفتاب، نہ ہو روکش اُس کے چہرے سے
نظر تو کر کہ وہ حسن و جمال ہے کچھ اور

سہیل[1] سے اُسے نسبت میں دوں خدا نہ کرے
کہ اس کے سیبِ زنخداں کا حال ہے کچھ اور

ترے فراق میں اے، جان عاشقوں کے تئیں
سوائے خونِ جگر بھی حلال ہے کچھ اور؟

گدائے در ہے ترا مصحفی جو تُو پوچھے
تو بات بات میں اُس کا سوال ہے کچھ اور

158

واں شوقِ قتل رکھے ہے قاتل کو بے قرار
یاں زخم کی طپش دلِ بسمل کو بے قرار

کشتی لگی ہے آ کے یہ کس بحرِ حسن کی
جوں موج کر دیا ہے جو ساحل کو بے قرار

کیا جانے کیا صبا نے کہا آ کے کان میں
پاتا ہوں آج صاحبِ محمل کو بے قرار

یہ کون تھا کہ بیٹھ کے اک دم جو اُٹھ گیا
اتنے میں کر گیا سبھی محفل کو بے قرار

قاتل سے یہ کہو یہ تماشے کا وقت ہے
جاتا ہے کوئی چھوڑ کے بسمل کو بے قرار

موجِ نسیم، باغ سے آ آ کے تو نہ کر
زنداں میں صاحبانِ سلاسل کو بے قرار

کیا جانتے ہو منھ کے پھرانے کی تم ادا
تم نے کیا بھی ہے کسی مائل کو بے قرار

آئی نظر جو مجھ کو سوادِ دیارِ دوست ق
یوں اُس نے خرّمی سے کیا دل کو بے قرار

مارے خوشی کے جوں کوئی رہ گیر دور سے
ہو دیکھ کر سیاہیِ منزل کو بے قرار

ملنے کی اُس کے کیا کہوں، شب اُس نے مصحفی
دو باتیں کر کے اور کیا دل کو بے قرار

1۔ سُہیل = ایک ستارہ جسے انگریزی میں Canopus کہتے ہیں اور فارسی میں ستارۂ یمانی بھی

159

دل کی بیتابی کہے ہے در پر اُس کے جا کے گر
کر بہانہ شب کا، اور سردل[1] سے سر ٹکرا کے گر

جب تلک کنڈی نہ اندر سے کھلے، تو رہ کھڑا
تجھ کو گر ایسا ہی گرنا ہے تو در کھلوا کے گر

اُس کے کوچے میں جو جاؤں ہوں، کہے ہے مجھ کو عشق
ہے یہ گرنے کی جگہ، دانستہ ٹھوکر کھا کے گر

روبرو اُس کے ہی گر یو، یار کو آنے تو دے
آمد آمد میں دلا اس کی نہ تو گھبرا کے گر

تھرتھرا کر کانپنے لگ، غش کی صورت لے بنا
یعنی یوں حالِ تباہ اپنا اُسے دکھلا کے گر

دیکھ شاخِ سرو پر، قمری گلِ نو رستہ کو
جی میں کہتی ہے کہ تو اُس پر بھی پر پھیلا کے گر

یاد آتا ہے مجھے اُس مہ کا جب چاہِ ذقن
دل یہ کہتا ہے بس اب تو کنوئیں ہی میں جا کے گر

گرچہ گرنے کی جگہ ہے اُس کا کوچہ مصحفی
تا نہ چوٹ آوے ترے، ناداں قدم ٹھہرا کے گر

160

تیغِ قاتل جب علم ہو، مت دلا گھبرا کے گر
سیر ہے جاں سے تو زخم اُس کا تو کوئی کھا کے گر

موسمِ گل تب ہوئے کنجِ قفس سے ہم رہا
جب گئے پودے چمن میں خاک پر مرجھا کے گر

عجز سے تیرے پسیجے شاید اُس کا دل کبھی
اس کے پانو پر، دلا اک شب تو تنہا جا کے گر

باز گرتا ہے کبھی جوں صعوہ[2] و کنجشک پر
تُو بھی عاشق ہے تو یوں اس کو اکیلا پا کے گر

مار و عقرب کی جگہ گرچہ نہیں واں مصحفی
لیکن اُسکے آستاں پر ایک شب چلا کے گر

161

راتوں کو کیا پھرو ہو منھ پر نقاب لے کر
پچھتاؤ گے کسی کا ناحق عذاب لے کر

ہم انتظار میں یاں مر بھی چلے، وہاں سے
آتا ہے قاصد اب تک خط کا جواب لے کر

1۔ سردِل = دہلیز کا بالائی حصہ چوکھٹ 2۔ صعوہ = ممولا، چڑیا

جاتے ہی اُس گلی میں غش سا جو مجھ کو آیا طفلانِ اشک دوڑے ووں ہی گلاب لے کر

بسمل ہوں میں، کرومت زخمِ دگر کا صرفہ[1] مجھ نیم جاں کا جاؤ پورا ثواب لے کر

ابرِ سیہ نے مجھ کو گھیرا ہے گلستاں میں ساقی پہنچ شتابی، جامِ شراب لے کر

یہ دل ہے اب نکما، باقی نہیں کچھ اس میں تُو اس کو کیا کرے گا خانہ خراب لے کر

آنکھیں مری بھر آئیں، قاتل کی دیکھ صورت جب قتل کو وہ آیا تیغِ خوش آب لے کر

پردے زمیں کے ہر دم زیر و زبر رہیں گے ہم خاک میں گئے گر، یہ اضطراب لے کر

وہ زخم ہو کے ناسور اب ایک سُو ہوئے ہیں جن زخموں کا گئے تھے تم کل حساب لے کر

غفلت کدہ ہے دنیا، کچھ پوچھ مت تُو ناداں کیا کیا گئے نہ یاں سے تعبیرِ خواب لے کر

اب نام سے بھی میرے واقف نہیں وہ، جس کے طفلی میں، میں چلے تھا پیچھے کتاب لے کر

اے مصحفی سمجھ تو ناداں کہاں چلا ہے
سر پر پون[2] کی گٹھری مثلِ حباب لے کر

162

ہوا وہ گرم اُسی خط کا مدّعا پڑھ کر گئے تھے کل جسے میرے سب آشنا پڑھ کر

یہ سوزِ دل نے خبر مجھ کو دی تھی اے قاصد کہ اس نے آگ پہ نامے کو رکھ دیا پڑھ کر

یہ کیا ہے باندھے ہے اوروں کے نسخے جب عطار ہمارے نسخے کو رکھ دیوے ہے، دوا پڑھ کر

خدا کرے جو ترا سر دُکھے تو مجھ سے کہے کہ پھونک دے مرے ماتھے پہ کچھ دعا پڑھ کر

کٹا رقیب، جب اُس نے قلم تراش منگا ہمارے خط کا لفافہ جدا کیا پڑھ کر

رہا ہے سوچ وہ پہروں، کہ کس کا کشتہ ہے یہ مرے کتابۂ تربت کو بارہا پڑھ کر

تمھارے ساتھ میاں مصحفی ہیں جوق کے جوق[3]
مگر تم آئے ہو مجلس سے مرثیا پڑھ کر؟

1۔ صرفہ = کنجوسی 2۔ پون = ہَوا 3۔ جوق کے جوق = کثیر مجمع

163

ہے فرشِ زمیں پر جو یہ مہتاب کی چادر ساتھ ایسی صفائی کے نہیں آب کی چادر
خواب آوے سو کیونکر مجھے، بیتابیِ دل سے پہلو کے تلے ہے مرے سیماب کی چادر
شاید کہ کفن اُس کا کچھ اک خوں میں بھرا تھا دکھلاتی[1] ہے رینی[2] سی جو سہراب کی چادر
ہو سیر، اگر بادِ صبا منھ سے اُلٹ دے سوتے میں ٹک اُس ماہِ جہاں تاب کی چادر
تھی قبر پہ کُشتے کی ترے روزِ زیارت لوہو میں بھری سبزۂ سیراب کی چادر
ہم سوتے ہیں خاکسترِ گلخن کو بچھا کر ہے ہم سے غریبوں کی یہی خواب کی چادر
کیا خاک سے کُشتوں کی ترے آوے ہے، مجھ کو بھگواں[3] نظر آتی ہے جو سیلاب کی چادر
وابستہ ادرسے[4] کے نہیں مصحفی آزاد
تہمد کے لیے ہووے کسی ٹاٹ کی چادر

164

جو بات بناتا ہوں بگڑ جاتی ہے آخر مجھ پر مری باتوں سے شکست آتی ہے آخر
کچھ تو ہی مجھے دیکھ، نہیں سر کو جھکاتا دیکھا تو تری آنکھ بھی شرماتی ہے آخر
بدلی تری شمشیرِ سیہ تاب کی قاتل خوں مقتلِ عشاق پہ برساتی ہے آخر
تا چند اُٹھاؤں ستمِ گرمیِ مجلس انساں کی طبیعت نہیں گھبراتی ہے آخر؟
جس دشت میں ہے قیس کا مسکن، کششِ عشق ناقے کے تئیں کھینچ اُدھر لاتی ہے آخر
کیونکر کہوں، کہنے کو نہ سن بیہودہ گو کے بات اُس کی ترے دل میں جگہ پاتی ہے آخر
اے مصحفی ہوتا ہے جو کچھ قیس کے دل میں
لیلیٰ بھی زباں سے وہی فرماتی ہے آخر

1۔ دکھلاتی ہے = نظر آتی ہے 2۔ رینی = کسم کا رنگ جو کپڑے سے چُوایا جاتا ہے
3۔ بھگواں = رنگین 4۔ اُدرسہ = کپڑا

ڑ

165

تم کھڑے تھے جو کل کواڑ کی آڑ میں گیا تھا تمھیں بواڑ[1] سے تاڑ

گر چلے سیر کو تو اے لڑکے تجھ کو دکھلاؤں کوڑیوں کا جھاڑ

تیرے اک زخمِ تیغ میں قاتل میری چھاتی کے کھل گئے ہیں بواڑ

دیکھ مجنوں کو دور سے لیلیٰ گری ناقے سے اپنے، کھا کے پچھاڑ

وہ بیابانِ عشق ہے لق و دق[2] جس کو کہتے ہیں "بارہ دونی اُجاڑ[3]"

آفرین کوہ کن کی ہمت کو کیسا سر پر اُٹھا لیا ہے پہاڑ

انفعالِ گنہ نے میرے تئیں جیتے جی ہی دیا زمین میں گاڑ

دورِ عارض پہ یوں لگے ہے خط جیسے گردِ چمن ہوں کانٹوں کے جھاڑ

حاصل اب اُس گلی میں رہنے کا گر پڑا ٹوٹ سر پہ غم کا پہاڑ

رخنے مسدود ہو گئے سارے اور لیپی گئی دروں کی دراڑ[4]

مصحفی کھوٹ سے نصیبوں کے

میرے اُس کے رہا ہمیشہ بگاڑ

ز

166

اُس شوخ نے کیا ہے جو دستِ ستم دراز دستِ دعائے خلق ہے اب دم بدم دراز

یا رب، شبِ فراق تو کوتہ نہ ہو سکی ہوتی ہے جس طرح کہ شبِ وصل کم دراز

1۔ بواڑ = کواڑ کے دو تختوں کے بیچ کا شگاف 2۔ لَق و دَق = نہایت ویران

3۔ بارہ دونی اُجاڑ (روزمرّہ) نہایت ویران 4۔ دراڑ = کواڑ کے شگاف

لکھنے لگے جو وصف تری زلف کا میاں — یوں چاہیے کہ ہاتھ میں لیوے قلم دراز
ماتم سرائے دل میں عجب دھوم دھام ہے — نالوں کے ہو رہے ہیں ہمارے علم دراز
فرشِ زمیں ہے خواب گہِ خسرواں تمام — ہیں ہرطرف یہاں کے وضحاک و جم دراز[1]
جب پا کے تیرے جی کی کہوں، ہاتھ ادھر تو لا — تُو بھی پھر اپنے ہاتھ کو کر اے صنم دراز
دہشت سے میں ہی ڈگ[2] نہیں دھرتا کہ مصحفی
فتنہ بھی اُس گلی میں رکھے ہے قدم دراز

167

ہاتھ میں رکھنے لگا جب سے وہ تلوار دراز — کُشتے کیا کیا نہ ہوئے بر سرِ بازار دراز
گوشۂ چشم میں کہتی ہے یہ کاجل کی دھنک — گر نہ دیکھی ہو تو دیکھو، شبِ بیمار دراز
سرو دیکھ اُس کی درازی کو دبے جاتے ہیں — گرچہ اتنا تو نہیں نخلِ قدِ یار دراز
ہے سلف کا یہ سخن ''شملہ بہ اندازۂ علم'' — شیخ جی رکھیے نہ اتنا سرِ دستار دراز
بے خبر بام پہ سوتا ہے تو کیا، اے غافل — اُٹھ کے ٹک دیکھ کوئی ہے پسِ دیوار دراز
دیکھیے کا ہے کو آئینہ جہاں کا، جس میں — چہرہ[3] بہتا ہو کبھی اور کبھو رخسار دراز
قصہ اک تیغ میں کوتاہ کیا تو نے مرا — کیا کہوں اور، تری عمر ہو اے یار دراز
چھوڑتی جاتی ہے زلف اس کی اسیروں کے تئیں — پانو میں باندھ کے ہر ایک کے اک تار دراز
تھا شبِ ہجر میں سر زانوے غم پر جس کا — آج پانو اس نے کیے گور میں ناچار دراز
کون سی بات میں اس شوخ نے کی کوتاہی — قد ہے جوں سروِ کلاں، زلف ہے جوں مار دراز
خونِ مقتول کی چھینٹیں نہ پڑیں تا اس پر — اس لیے ہاتھ میں رکھتا ہے وہ تلوار دراز
مصحفی صبح کو کیا واقعہ درپیش آیا
یہ شبِ ہجر نہ تھی اتنی تو اے یار دراز

1۔ کے = کیقباد، جم = جمشید ضحاک = ایک اساطیری بادشاہ 2۔ ڈگ دھرنا = قدم رکھنا (روزمرّہ)
3۔ اگر آئینے کا صیقل خراب ہوتا ہے تو اُس میں چہرے بگڑے ہوئے نظر آتے ہیں

168

کرتا ہے ہم سے گرگِ[1] فلک کج روی ہنوز
دن رات ہم ہیں اور وہی سگ دَوی[2] ہنوز

ہر چند اس کی چاہ میں جی کو کھپا دیا
ہم سے ادا ہوا نہ حقِ دوستی ہنوز

گر دیکھنا ہے تجھ کو تو جلد آ کہیں، کہ ہے
بیمارِ عشق کا ترے، آنکھوں میں جی ہنوز

اوروں نے آکے یاں زرِ وافر کیے حصول
ہم بیٹھے گھر میں کاٹتے ہیں مفلسی ہنوز

ہرگز گئی نہ شیخ سے خوے درندگی
یہ پیرِ سگ سیرَ[3] نہ ہوا آدمی ہنوز

کوے بتاں میں دل جو گیا سو گیا ہی ہائے
ہرگز کسی نے اُس کی نہ کی پیروی ہنوز

اوروں سے سب چلن ہیں مروت کے، کیا کہوں
اور ساتھ میرے بات نہیں راہ کی ہنوز

ہم رفتہ رفتہ راہ میں اُس کی گزر گئے
پیدا ہوئی نہ اس سے ہمیں رفتگی ہنوز

ہر چند کھل گئی ہے گرہ اُس کی زلف کی
پر مجھ کو اُس کے ساتھ ہے دل بستگی ہنوز

اسبابِ زندگی تجھے کیوں کر نکالیے
رنگِ ہواے دَہر تو ہے آتشی ہنوز

کیا جانے آئنے کو خوش آیا ہے کیا، کہ وہ
باندھے ہوئے ہے تیری طرف ٹکٹکی ہنوز

ہر چند سالِ عمر بہ خمسیں قریں ہوئے
جھگڑا نہ زندگی کا چکا مصحفی ہنوز

169

چمن کو آگ لگاوے ہے باغباں ہر روز
نیا بناؤں ہوں میں اپنا آشیاں ہر روز

عجب طلسم میں آکر پھنسے ہیں ہم، اے واے
وہی زمیں ہے، وہی کہنہ آسماں ہر روز

جنونِ عشق نے ہم کو کیا کبوتر باز
اُڑا کریں ہیں گریباں کی دھجیاں ہر روز

اُسی نگہ سے، کہ سو پردۂ حجاب میں ہے
جگر میں چبھتی ہے عاشق کے اک سناں ہر روز

نگاہِ بوالہوساں بس کہ گرد رہتی ہیں
بہارِ حسن کو ہوتی ہے یاں خزاں ہر روز

1۔ گرگ = بھیڑیا 2۔ سگ دَوی = کتے کی طرح ادھر اُدھر بھاگنا 3۔ سگ سیرَ = کتے جیسی خصلت والا

میں اپنے لختِ جگر کا نہ کیونکے ہوں ممنوں　　کہ رہتے ہیں مرے دامن میں گل فشاں ہر روز
رہے ہے وعدہ خلافی سے تیری، اے ظالم　　عجب بلا میں گرفتار میری جاں ہر روز
بخارِ دل کے نکلنے کے واسطے تا شام　　کھلا رہے ہے مرے گھر کا تابداں ہر روز
سگ اُس کا کھاوے ہے صَرفے سے لاشۂ عاشق　　نکال لے ہے لحد سے اک استخواں ہر روز
گلی میں اُس کی ہمارا نہیں ٹھکانا ہائے　　جھڑے ہے غیر کی خاطر نیا مکاں ہر روز

یہ کیا سبب ہے جو تو مصحفی نہیں چلتا
عدم کو جاوے ہے یاروں کا کارواں ہر روز

س

170

شوخیوں سے تری نکلی نہ مری خاک ہوس　　مل گئی خاک میں سب، اے بتِ چالاک ہوس
جن کو پابوس کی تھی، اے بتِ چالاک ہوس　　لے گئے وہ تری ٹھوکر میں تہِ خاک ہوس
مجھ کو سرگشتہ نہ کر اس کی تمنا میں بہت　　کس قدر ہے مری، اے گردشِ افلاک ہوس
گر کے اُس چاہِ زنخداں میں یہ دل ڈوب گیا　　لے گیا پَیرنے کی دل میں یہ پیراک ہوس
دھینگا مشتی میں تو اِس تن پہ ہوا سو ٹکڑے　　خوب نکلی تری، اے پیرہنِ چاک ہوس
رنگ شفتالو ہے جوڑے[1] کا ترے، کیا جانے　　جی سے کس کس کے نکالے گی یہ پوشاک ہوس
آج پھر تشنۂ بیداد ہے یہ زخمِ جگر　　کل نکال اس پہ گئے تھے کئی سفاک ہوس
منھ رگڑتا ہے ترے دامنِ زیں سے اپنا　　یوں نکالے ہے ترا بستۂ فتراک ہوس
سیلِ گریہ کا میں ممنوں ہوں کہ جس کی دولت　　بہہ گئی دل سے مرے جوں خس و خاشاک ہوس

مصحفی عشق و ہوس میں ہے بڑا فرق میاں
کوئی ہوتی ہے حریفِ نگہِ پاک ہوس؟

1۔ جوڑا = لباس

171

میری طرح سے یار نے میلا کیا لباس / پر کیا کہوں پھبا[1] اُسے کیا ملگجا[2] لباس

جوں انجلائے[3] شمع ہو فانوسِ کہنہ میں / رونق فزائے حسن ہے یوں تیلیا[4] لباس

گودڑ کا لعل کیوں نہ کہوں اُس کے حسن کو / میلا بھی جس پری کو لگے ہے بھلا لباس

ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اتاریے / پہنا کریں گر آپ اِسی وضع کا لباس

موقوف کچھ نہیں ہے سپید و سیاہ پر / لگتا ہے خوب رُو کو سبھی خوش نما لباس

ہے سر پہ اوڑھنی، ترے کافر یہ جھلملی / یا آکے تیرہ شب کا ہوئی ہے ہَوا لباس

پیرایہ دے کے حسن کا تیری شبیہ کو / نقاش بول اُٹھا کہ یہی اس کا تھا لباس

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی، تو عشق / بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

چھپ کر کے دیکھ تو بھی کسی ڈھب سے مصحفی
پہنا ہے آج یار نے تیرے نیا لباس

172

عید تو آکے مرے جی کو جلاوے افسوس / جس کے آنے کی خوشی ہو، سو نہ آوے افسوس

اپنی صورت وہ بناؤں ترے غم میں کہ مجھے / تو بھی دیکھے، تو مرے حال پہ کھاوے افسوس

دست رس ہو نہ ہمیں پانو تلک، اور شبِ عید / غیر مہندی ترے ہاتھوں کو لگاوے، افسوس

باغباں موسمِ گل میں تو لگا کر لوکا[5] / آشیاں بلبلِ شیدا کا جلاوے افسوس

فتنہ بیدار ہو جس پانو کی ٹھوکر سے وہ پانو / بختِ خوابیدہ کو میرے نہ جگاوے افسوس

ان دنوں میں کہ بہم چاکِ جگر ہوتے ہوں وصل / کوئی عاشق کا گریباں نہ سلاوے افسوس

بزمِ شاہاں میں جگہ مصحفیِ خستہ کی ہو
اور وہ مجلس میں تری بار نہ پاوے افسوس

1۔ پھبنا= زیب دینا، سجنا 2۔ ملگجا= ملا دَلا 3۔ انجلا= روشنی 4۔ تیلیا= میلا 5۔ لوکا= شعلہ، لپٹ

ش

173

سر کاٹ کاٹ اُس نے بنائے ہیں سنگِ فرش
مجلس کا اُس کی تب تو شہیدی[1] ہے رنگِ فرش

میں لیٹے لیٹے ضعف میں نالے جو شب کیے
کوتہ دمی[2] سے میری ہوئے وہ خدنگِ فرش

آنے کی آج اُس شہِ خوباں کے ہے خبر
فرّاش سے کہو، نہ کرے اب درنگِ[3] فرش

صیقل سے کم نہیں ہے تمامی کی وہ سنجاف
جو ہر خرامِ ناز سے چھیلے ہے زنگِ فرش

مہندی لگے یہ پانو تھے کس کے، کہ جس سے رات
آنکھیں کریں تھیں سیرِ بہارِ فرنگِ فرش

اہلِ سخن جھڑپتے[4] ہیں مجلس میں بیٹھ کر
مخصوص بلبلوں ہی کی خاطر ہے جنگِ فرش

صندل کے پانو ہوں جو مرے تو بھی مصحفی
سمجھے وہ اُن کو فرطِ نفاست سے سنگِ فرش

174

یوں زلف کے میں کی ہے ہر تار کی پرستش
ہندو کریں ہیں جیسے زنار کی پرستش

مقتول جو پڑے ہیں سر کو کٹا کٹا کر
کرتے ہیں سب تری ہی تلوار کی پرستش

تصویر کا تری ہے چسپیدہ جس پہ کاغذ
پہروں کریں ہیں ہم اُس، دیوار کی پرستش

آئینہ دار حق نے پیدا کیا ہے ہم کو
کرنے کو نیک و بد کے دیدار کی پرستش

زلفِ سیہ کو اُس کی یوں پوجتے ہیں عاشق
واجب ہے ہندوؤں پر جوں مار کی پرستش

دنیا سے حق پرستی جاتی رہی ہے بالکل
ہر ایک اب کرے ہے زردار کی پرستش

دل اپنا دلبروں کو ہم پوج بیٹھے، ہم سے
اب گل کی ہو سکے ہے، نے خار کی پرستش

ہم وے اسیر ہیں جو، چاکِ قفس سے برسوں
کرتے رہے ہیں حسنِ گلزار کی پرستش

1۔ شہیدی رنگ = سرخ 2۔ کوتہ دَمی = ہلکے سانس لینے سے 3۔ درنگ = دیر، تاخیر
4- جھڑپنا = بحث مباحثہ کرنا

شاعر تو یوں سبھی ہیں پر ہیں جو اہلِ بینش
کرتے ہیں مصحفی کے اشعار کی پرستش

175

ہے کس کو فکرِ عشق میں شعر و سخن کا ہوش　　شعر و سخن تو کیا، کہ نہیں تن بدن کا ہوش
پروانہ غرقِ لجۂ آتش ہے اس گھڑی　　نے شمع کی خبر ہے اُسے، نے لگن کا ہوش
جب روے خوش پہ اپنی نظر جا پڑے ہے، تب　　رہتا نہیں ہے کچھ ہمیں چشم و دہن کا ہوش
بیمارِ عشق غش میں بھی اونچا کرے ہے ہاتھ　　یعنی ہے اب تلک اُسے سیبِ ذقن کا ہوش
کپڑے نئے پہن کے جو آیا وہ شمع رو　　سج اُس کی دیکھتے ہی گیا انجمن کا ہوش
بالیں پہ روتے ہیں ترے بیمار کی سبھی　　رخصت ہے اُس کی، ہے کسے گور و کفن کا ہوش
اس رشکِ گل نے باغ میں جس دم قدم رکھا　　سُدھ گل کی باغباں کو رہی، نے چمن کا ہوش
جب پیرہن گلے سے اتارا میں اُس کے رات
اے مصحفی اُسے بھی نہ تھا پیرہن کا ہوش

ص

176

نوکِ مژگاں پر کرے ہے یوں دلِ صد پارہ رقص　　پھول گیندے کا کرے جوں بر سرِ فوّارہ رقص
گرد پھر پھر شمع کے پروانہ آخر جل گیا　　بس وہی ساعت کی ساعت کر چکا بیچارہ رقص
بوے پیراہن سے یوسف کے، جو آنکھیں کھل گئیں　　دیدۂ یعقوب میں کرنے لگا نظّارہ رقص
ایک جلوہ ہے وہ دشت و کوہ میں پرتو فگن　　جس کی جنبش میں بہم کرتے ہیں خارو خارہ رقص
شب جو میں آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا مصحفی
سامنے آنکھوں کے کرتے تھے مری سیارہ رقص

177

یوں ہوں گے تیرے چاہنے والے ہزار شخص ، لیکن نہ ہوگا مجھ سا کوئی جاں نثار شخص
بیتاب ہو گھر اُس کے جو میں شب گیا، مجھے کہنے لگا کہ تُو بھی ہے کیا بے قرار شخص
تم ان دنوں جو ہم سے چلے کج روی کی چال شاید ملا ہے تم کو کوئی مال دار شخص
پایا نہ ایک دن اُسے تنہا ہزار حیف گرد اس کے نت لگے ہی رہے پانچ چار شخص
ماتم میں فوتِ عمر کے روتا ہوں رات دن دنیا میں مجھ سا کم ہے کوئی سوگوار شخص
مجنوں کو یاد ناقۂ لیلیٰ کی آ گئی دیکھا جو دور سے کوئی محمل سوار شخص
پُتلا ہماری خاک کا جب ہو چکا درست نام اُس کا رکھا عشق نے کیا، بے قرار شخص
گر چشمِ دید وا ہو تو زیرِ زمیں ہنوز ہیں ہم کنارِ حسرت و غم بے شمار شخص

سنتے تھے مصحفی کا بڑا ہم تو طمطراق
دیکھا تو وہ غریب ہے اک خاکسار شخص

ض

178

ابر سدا لیوے ہے دیدۂ گریاں سے فیض پاٹ کو دریا کے ہے، میرے ہی داماں سے فیض
صاحبِ جود و سخا، ہوتے ہی آئے یہ لوگ کیوں نہ گداؤں کو ہو مطبخِ شاہاں سے فیض
زخمِ الم کا مزہ سمجھے نہ محمل سوار پاشنہ ریشوں[1] کو ہے خارِ مغیلاں سے فیض
مزرعِ دل گر مرا خشک رہا، گو رہے سبزۂ خط کو تو ہے چاہِ زنخداں سے فیض
سینے میں میرے دیا خون کا دریا بہا دل کو مرے یہ ہوا آپ کے پیکاں سے فیض
عالمِ بے فیض میں خلق ہوئے ہم، کہ ہے گبر سے کچھ فائدہ اور نہ مسلماں سے فیض

1۔ پاشنہ ریش = جس کی ایڑیاں زخمی ہوں

کہنے کو اے مصحفی گرچہ ہوں مورِ ضعیف
پر مجھے پہنچے ہے روز خوانِ سلیماں سے فیض

179

بندہ رکھتا ہے جس صنم سے غرض — وہ کہے ہے: رکھو نہ ہم سے غرض
جو ہے قسمت کا اپنی، پہنچے ہے — نہیں کچھ ہم کو بیش و کم سے غرض
مدح و ذم یار ہی کہاتے ہیں[1] — ورنہ تھی کس کو مدح و ذم سے غرض
یہیں یہ روگ لگ گیا ہم کو — ساتھ لائے نہ تھے عدم سے غرض
شعر کے فن میں، وہ یہ کہتے ہیں ق کچھ نکلتی ہے جن کی ہم سے غرض
مصحفی تجھ کو حق رکھے جیتا
ہے ہمیں تو ترے ہی دم سے غرض

ط

180

بے خودوں کو کششِ زلفِ گرہ گیر ہے شرط — جس طرح پیلِ سیہ مست کو زنجیر ہے شرط
آنکھ کھل جاوے تو یوسف سے کہوں میں اتنا — ''خوابِ بیداریِ عالم کی بھی تعبیر ہے شرط''
جی اُٹھے مردہ، گر آنکھوں میں بھی دم آیا ہو — پر ذرا اُس کو دکھانی تری تصویر ہے شرط
آہ کس کام کی وہ، جس میں اثر خاک نہ ہو — دوستو سچ تو یہ ہے آہ کو تاثیر ہے شرط
کون کہتا ہے تجھے کعبۂ دل کو نہ بنا — لیک بت خانۂ صورت کی بھی تعمیر ہے شرط
اے زباں لافِ سخن گوئیِ بے جا تا چند — دل فریبی کے لیے قوتِ تقریر ہے شرط
مرغِ دل تڑپے ہے، صیاد خبر لے اس کی — صیدِ غلطیدہ بہ خوں کے تئیں تکبیر ہے شرط
دوسرا وار لگانے میں نہ دوں گا اُس کو — میری اور اُس کی، دلا ایک ہی شمشیر ہے شرط

1۔ کہاتے ہیں (کہلواتے ہیں) (عوامی)

وصل تقدیر میں ہووے گا تو ہوگا، لیکن
مصحفی تھوڑی بہت تیری بھی تدبیر ہے شرط

181

گر اُس نے کی نہ خون سے بسمل کے احتیاط
کرتا ہے یہ تو دامنِ قاتل کی احتیاط

آیا جو ناقہ دیکھ کے مجنوں کو وجد میں
پھر ہوسکی نہ اُس سے تو محمل کی احتیاط

طغیانِ اشک نے مری پلکیں بھی دیں بہا
سچ ہے کہ ہو نہ موج سے ساحل کی احتیاط

جب ہوں ہزاروں ناوکِ ناز اُس کے سامنے
پھر کیونکے کرسکوں میں بھلا دل کی احتیاط

کُشتے کے تیرے ڈھیر[1] پہ ہے پاسباں ضرور
تو ایک شب تو کیجیو اِس گِل[2] کی احتیاط

منزل کی اور مقام کی دیوے گا وہ سمجھ
آگے خدا کے ہاتھ ہے منزل کی احتیاط

اُس سنگ دل کو دوش دوں کیوں، سچ ہے مصحفی
لیلیٰ نے کی نہ کاسۂ سائل کی احتیاط

ظ

182

اپنا تو اُس کے ساتھ گیا زندگی کا حظ
جب یار ہی نہ ہووے تو کیا زندگی کا حظ

کل خضر سے جو اُس کی ملاقات ہوگئی
بولا کہ اب ملا ہے ذرا زندگی کا حظ

رہنے دے میری خاک کو اُس کُو میں اے صبا
برباد دے نہ بہرِ خدا زندگی کا حظ

رکھ کر مرے لبوں پہ لب اپنے، وہ خواب میں
کہتا ہے اب تو تجھ کو ملا زندگی کا حظ

جب شاہدِ شباب نے عزمِ سفر کیا
رخصت ہو اس کے ساتھ چلا زندگی کا حظ

درپے رہے ہے اپنی ہی اوقات کے فلک
رکھتے ہیں ورنہ شاہ و گدا زندگی کا حظ

1۔ ڈھیر = قبر 2۔ گِل = مٹی

جب تک کہ ہم جوان تھے، تھا ساتھ مصحفی ق خوباں کے چاہنے کا مزہ زندگی کا حظ
اب قافلے سے اُن کے ہم آگے نکل گئے کوسوں ہی دور ہم سے رہا زندگی کا حظ

183

ہوئے نہ وصل کی دولت سے ہم کبھی محظوظ جو رفتہ رفتہ ہوا ہے تو مدّعی محظوظ
کل اُس نے عکس کا اپنے جو لے لیا بوسہ تو جی ہی جی میں ہوئی کیا ہی آرسی محظوظ
میں تجھ سے اور تو کیا چاہتا ہوں، اے گُلِ تر کرے ہے مجھ کو تری خشک آشتی[1] محظوظ
مزہ تو دیکھ، کہ اب تک بھی خاکِ مجنوں کو کرے ہے ناقۂ لیلیٰ کی ہمرہی محظوظ
اگرچہ زخمِ نخستیں نہ کارگر آیا ہوا میں کھا کے ولے زخمِ آخری محظوظ
نہ تڑپے کیونکے وہ بستر پہ پھر، کہ عاشق کو شبِ فراق کی کرتی ہے بے کلی محظوظ
نہ ہووے عشق سے نسبت درست یاں جس کی ق کرے نہ اس کے تئیں شعرِ نسبتی[2] محظوظ
مجھے تو اُس کا ہی عالم پسند آتا ہے ہوا ہوں جب سے بہ اشعارِ فارسی محظوظ
ترے کلام سے ہے نسبتی کو کیا نسبت
مقام اپنے میں ہے تو ہی مصحفی محظوظ

ع

184

چشم سے ہوتے ہیں جب آنسو رواں وقتِ وداع دیکھ کر روتا ہے مجھ کو آسماں وقتِ وداع
یہ نصیحت ہے کہ میں بے اختیاری گر کروں تھام لیجو مجھ کو تم اے دوستاں وقتِ وداع
باغ میں چھوڑا نہ اپنا خاک بھی اُس نے نشاں رات بلبل نے جلایا آشیاں وقتِ وداع
اک جگہ رہنے پہ سچ معلوم کچھ ہوتا نہیں عشق عاشق کا کرے ہے امتحاں وقتِ وداع

1۔ خشک آشتی = روکھی دوستی 2۔ نسبتی تھانیسری (شاعر فارسی)

تو اُدھر جاتا ہے اور ہے روح کی رخصت اِدھر　　کچھ تو کہہ لے مجھ سے اے آرامِ جاں وقتِ وداع

یار جاتا ہے سفر کو، آئے ہیں ملنے کو لوگ　　کیا کروں میں اپنا حالِ دل بیاں وقتِ وداع

اس ادا سے اور تم دل کو نشانہ کر گئے　　مانگتا تھا مجھ سے کیا تیر و کماں وقتِ وداع؟

بے حواسی نے یہ گھیرا ہے کہ ہرگز مصحفی
کام کرتی ہی نہیں اپنی زباں وقتِ وداع

غ

185

دکھلائے بام پر جو وہ رخ شام کو فروغ　　پھر کیا ہو آفتابِ لب بام کو فروغ

منھ اُس کا لال ہووے ہے غصے میں جس گھڑی　　دیتا ہے اور عارضِ گلفام کو فروغ

زلف و رخ اُس صنم کو دیا ہے خدا نے وہ　　رونق ہے جس سے کفر کو، اسلام کو فروغ

رنگِ کفک نے تیرے یہ دریا میں آگ دی　　جس سے رہا نہ کچھ شفقِ شام کو فروغ

دی طیش کھا کے اُس نے جو گالی جلی بھُنی　　اُس دم ہوا کچھ اور ہی دشنام کو فروغ

کیا مے کشی کا فائدہ، کوٹھے پہ جب نہ ہو　　مہتابِ چاردہ سے مے و جام کو فروغ

نامہ ہَوا میں جائے ہے جلتا ہوا مرا　　طالع نے کیا دیا ہے مرے نام کو فروغ

طاؤسِ باغ اگرچہ نہیں مَیں پہ مصحفی
داغوں سے میرے ہے قفس و دام کو فروغ

186

روشن کروں میں گر، شبِ غم آہ کا چراغ　　بجھ جاوے آسماں پہ وُہیں ماہ کا چراغ

محتاجِ شمع کب ہے شبستانِ عاشقاں　　روشن رہے ہے یاں دلِ آگاہ کا چراغ

ڈرتا ہوں بادِ دامنِ خوباں سے بجھ نہ جائے　　یہ دل کہ بن رہا ہے سرِ راہ کا چراغ

کیا چمکے حسنِ زُہرہ ترے رخ کے سامنے بے نور ہے وہ جیسے شبِ ماہ کا چراغ
ہے گھر میں اپنے، آہ سے کچھ اور روشنی منعم کے گھر میں گو کہ جلے جاہ کا چراغ
خالِ ذقن سے اس کے زنخداں کو ہے فروغ از بس وہ بن رہا ہے لبِ چاہ کا چراغ
تا حشر گُل نہ ہو دلِ پُر داغ مصحفی
روشن چراغ[1] کی ہے یہ درگاہ کا چراغ

187

وصل کی شب گو کہ گُل ہو گھر ہمارے کا چراغ حسن کی آتش سے روشن ہے نظارے کا چراغ
شمع پر پروانہ گر کر جل گیا افسوس ہے بجھ گیا پل مارتے کیسا بچارے کا چراغ
کر کے صدقے رکھ دیا دل یوں میں اُس کی راہ میں جیسے چوراہے میں رکھتے ہیں اُتارے[2] کا چراغ
شعلہ افروزیِ دل کو جنبشِ مژگاں ہے شرط جیسے ہو محتاج تنکے کے اشارے کا چراغ
لعل کا تکمہ قبائے آسمانی پر تری یہ فروزاں ہے کہ جیسے قطب تارے کا چراغ
انتظارِ صبح گُل ہونے میں کرتا ہی نہیں ہے چراغِ زندگی گویا شرارے کا چراغ
ظرفِ سالم کر بہم، گر چاہتا ہے نورِ قدس قابلِ روغن نہ ہو ٹوٹے کنارے کا چراغ
میں جو دل کا منھ کیا اس کی طرف بولا وہ شوخ ”خوش نہیں آتا مجھے ایسا اِجارے[3] کا چراغ“
بے قراری جو دلِ پُر داغ میں رہنے لگی
بن گیا اے مصحفی آخر وہ پارے کا چراغ

188

آئی جو سوختہ سے کبھی مجھ کو بوے داغ پھر دل میں میرے گرم ہوئی آرزوے داغ
ہرگز متاعِ درد سے خالی نہیں رہا اے گُل بہ رنگِ لالہ مرا چار سوے داغ
گُل کھائے ہے بہارِ رخِ گُل رخاں پہ روز اِس دستِ سوختہ کو بھی کتنی ہے خوے داغ

1۔ حضرت شیخ نصیرالدین محمود اودھی چراغ دہلی (وفات 18 رمضان 757ھ)

2۔ اُتارا = صدقہ، آسیب کو دور کرنے کا عمل 3۔ اجارے کا چراغ = مانگا ہوا

مثلِ کباب آگ ہے اب اُس کے پشت و رو جس دل نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا روے داغ
غیر از قتیلِ ناوکِ بیداد مصحفی
سینے میں میرے کون کرے جستجوے داغ

189

شبِ فراق میں کم ہے رواجِ شمع و چراغ کہ یاں بہ داغِ الم ہے رواجِ شمع و چراغ
یہ تیرے نور سے عالم ہوا ہے جلوہ فروش کہ تا بہ دیر و حرم ہے رواجِ شمع و چراغ
زمینِ کوے بتاں سر بسر ہے نورانی کہ واں قدم بہ قدم ہے رواجِ شمع و چراغ
بن آہ و داغ کے یاں سے نہ جا کہ کہتے ہیں بہ تیرہ راہِ عدم ہے رواجِ شمع و چراغ
شہابِ ثاقب و تابندہ مہ مجھے نہ دکھا فلک، بہ مجلسِ غم ہے رواجِ شمع و چراغ
نہ خدمت ایک ہو شمع و چراغِ خانہ کی کہ بزمِ شہ میں بہم ہے رواجِ شمع و چراغ
ہوا ہے نورِ سخن مصحفی کا یہ روشن
کہ تا دوات و قلم ہے رواجِ شمع و چراغ

190

وہ دلِ روشن کہ تھا سارے زمانے کا چراغ گور پر میری بنا ہے اب سرہانے کا چراغ
لختِ لختِ دل میں ہے عکسِ فروغِ داغِ عشق کیوں نہ میں اس کو کہوں آئینہ خانے کا چراغ
یوں جلاتا ہے مرا دل، قشقۂ رنگیں ترا جیسے عاشق ہو پتنگے کے جلانے کا چراغ
باہر اندر خانۂ دل کے نہ ہو کیوں روشنی کیونکہ داغِ غم ہے اس کے آستانے کا چراغ
تیر افگن ہیں ستارے شب کو نت دل پر مرے بخت نے اس کو بنایا ہے نشانے کا چراغ
لختِ دل کو کھوئیو مت ہاتھ سے اے چشمِ تر کیونکہ سب کہتے ہیں اس کو ہی ٹھکانے کا چراغ
داغِ دل سے کیوں نہ تسخیرِ پری رویاں کروں حاضراتِ جن پہ قادر ہے سیانے[1] کا چراغ
دیر میں وہ دل بتوں کی کھائے ہے اب ٹھوکریں جو شبِ حج تھا حرم کے آستانے کا چراغ

1۔ سیانا = سفلی عملیات کرنے والا

داغِ دل جلتا ہے یوں سینے میں میرے ساری رات　جوں خزانے پر رہے روشن خزانے کا چراغ
زندگی کو مصحفی لازم پڑا ہے سوزِ عشق
بن بجھے ہرگز نہیں آرام پانے کا چراغ

191

اس نے پانوؤں کو لگائی جو حنا چار طرف　شعلہ اک گل کے خیاباں کو لگا چار طرف
پھر جو سوچا تو مرے دل میں مکاں تھا اس کا　ڈھونڈتا جس کو میں اک عمر پھرا چار طرف
سیرِ گلشن کو نہ جا جان کہ رنگِ گل سے　آتشیں ہو رہی ہے آج ہوا چار طرف
ناچ ناچے ہے تو جس دم کہ صنم خاطر کا　لوگ جی سے تجھے دیتے ہیں دعا چار طرف
آئے تب ناز سے پامال مجھے کرنے بتاں　سبزہ تربت سے مری جب کہ اُگا چار طرف
اُس کے کوچے میں جہاں چاہے وہاں سر کو جھکا　سجدہ کعبے میں ہے مومن کو روا چار طرف
مصحفی نے جو نکالی یہ زمینِ تازہ
وہیں شور اس کی فصاحت کا پڑا چار طرف

192

شانہ کرتا ہے جو تقریرِ پریشانیِ زلف　ظاہرا خط کو ہوئی خدمتِ دیوانیِ زلف
اے صبا جائے تو میری بھی طرف سے کم وبیش　کیجیو آج ذرا سلسلہ جنبانیِ زلف
کبھی شبگیر[1] کا شب کو وہ ارادہ نہ کرے　خال و رخسار ترا، گر نہ ہو میدانیِ زلف
اس کو کیا کام ہے اس سے، میں بڑا حیراں ہوں　شانہ کس واسطے کرتا ہے نگہبانیِ زلف
ہم گرفتارِ بلا رکھتے ہیں کب یہ طالع　وقت خوش اُسکا، ہوا پھنس کے جو زندانی زلف
طرفہ اقلیمِ محبت میں یہ ہے رسم کہ ہائے　چھوٹتا عید کے دن بھی نہیں زندانیِ زلف
مصحفی کیونکے میں اُس کو خطِ ترسا لکھوں
ہے شکستِ دلِ عاشق خطِ پیشانیِ زلف

1۔ شبگیر = رات کا سفر

193

صیغۂ شعر سے باہر ہوں جو کم ظرف کے حرف　پھر وہ کس کام کے، ہوں نحو کے یا صرف کے حرف

سچ ہے یہ بحرِ معانی کے جو غواص ہیں یاں　موج کی سطر سے لیتے ہیں اٹھا ژرف [1] کے حرف

اشکِ رنگیں کی مرے رخ پہ ہیں یوں تحریریں　زرد کاغذ پہ ہوں جوں خامۂ شنجرف کے حرف

طرف کے حرف تو تب ہوں کہ لکھے طرف پہ ہوں　ہوں جو بر گردِ کلہ کیو نکے وہ ہوں طرف کے حرف

الف اللہ سے ہے نقشِ دوائر کا وجود　اور یہ سب ہیں نکالے ہوئے اس حرف کے حرف

شیخ ٹخ گو [2] کی طرف مصحفی ہوتی ہے بلا
نخ نخی [3] شعر ہیں سب اُس کے تو ہیں برف کے حرف

ق

194

تھا جو فرقت میں تری تشنۂ خنجر عاشق　کیا شبِ ہجر ٹٹولا کیا بستر عاشق

حسنِ انسان سے افزوں ہو اگر حسنِ پری　ہووے جن کا ہے کو پھر آن کے اُس پر عاشق

اتنا مغرور بہ خوبی ہے کہ پروا نہ کرے　سامنے اس کے جو مر جائے تڑپ کر عاشق

ہاتھ سے اپنے تو دے غیر کو سبزے [4] کا جو جام　پی کے مر جائے نہ کیوں زہر کا ساغر عاشق

طفل جو طالعِ مجنوں پہ ہوا پیدا، وہ　جب جواں ہووے ہے، ہوتا ہے مقرر عاشق

عکس کو اپنے وہ بت دیکھ کے آئینے میں　ہنس کے کہتا ہے کہ کیا تو بھی ہے مجھ پر عاشق

مصحفی قصۂ داؤد سے ظاہر ہے یہ بات
حسن وہ شے ہے کہ ہو جس پہ پیمبر عاشق

195

آ گیا دیکھتے آنکھوں کے دن اور رات میں فرق　ہو گیا پھر مری اور اُس کی ملاقات میں فرق

1۔ ژرف = گہرائی، دقتِ معنی　2۔ ٹخ گو = مہمل بے مصرف باتیں کرنے والا
3۔ نخ نخی = ڈھیلے ڈھالے　4۔ سبزہ = بھنگ

وعدۂ وصل کیے تو نے سراسر جھوٹے　　خوب سوچا میں تو نکلا تری ہر بات میں فرق
زندگانی کا جو تھا چین وہ مطلق نہ رہا　　تیرے جاتے ہی بس آیا مری اوقات میں فرق
جی میں کیا آئی یہ اس کے جو وہ یوں روٹھ رہا　　مجھ سے کس روز ہوا اُس کی مدارات میں فرق
ہم سے شاعر جو تعب کھینچیں ہیں، موجب ہے یہی　　اس زمانے کے امیروں کی ہے نیّات میں فرق
اور موسم میں جدا مجھ سے رہو تم، تو رہو　　پر، مری جاں نہ کرو موسمِ برسات میں فرق

مصحفی کر نہ عبث شکوۂ ایامِ فراق
اگلی نسبت تو بہت ہے ترے حالات میں فرق

ک

196

رفتار تری جب نہ ہوئی غوررس[1] کبک　　صیاد نے پھینکا، ہے زمیں پر قفسِ کبک
یہ قہقہہ کس مست کا یاد آئے ہے اس کو　　کرتا ہے جواب سینے میں تنگیِ نفسِ کبک
صیاد اُسے اس قدِ رعنا کے برابر　　دو گام تو چلنے دے کہ نکلے ہوسِ کبک
ٹھوکر کی ادا میں مجھے شاگرد کر اپنا　　رفتار سے تیری ہے یہی ملتمسِ[2] کبک

اے مصحفی آوے جو وہ مہ پارہ چمن میں
دیکھ اس کے تئیں چھپنے لگے ماہ، پسِ کبک

197

بہارِ گل میں کیا ہم نے جب گریباں چاک　　بہ رنگِ گل گئے جامے کے تا بہ داماں چاک
کوئی تو جا کے کہے اُس قمیص پوش سے یہ　　کرے ہے پیرہنِ صبر پیرِ کنعاں چاک
مہِ دو ہفتہ بھی کٹ جائے، چھوڑ کر منھ پر　　کرے جو بالوں کو اپنے وہ ماہِ تاباں چاک

1۔ غوررس= پوری نقل　2۔ ملتمَس= درخواست

زبس کہ آ کے جنوں میں کیا ہے میں، پرزے — بہ رنگِ گل مرے جامے میں ہیں پریشاں چاک
نہیں وہ غنچہ کہ سو جا سے سینہ ریش نہ ہو — بہارِ گل نے کیے ہیں زبس کہ ارزاں چاک
پھٹیں تھے لاکھوں گریباں اُنھوں کے ہاتھوں سے — جب آستینوں میں رکھتے تھے نازنیناں چاک

علاج دردِ دل اپنے کا تو بہ نشتر کر
کہ گلٹی پھوڑے کا اے مصحفی ہے درماں چاک

198

نالوں سے میرے آگ نکلتی ہے اب تلک — تربت کی میری خاک بھی جلتی ہے اب تلک
ہندوستاں نمونۂ دشتِ بلا ہے کیا — جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک
دیکھا تھا ایک دن تری طرزِ خرام کو — موجِ نسیمِ صبح سنبھلتی ہے اب تلک
نظارہ باز، دید بھی گل کا اُڑا گئے — نرگس چمن میں آنکھ ہی ملتی ہے اب تلک

اُس رخ کا دورِ خط[1] بھی ہے حسن وصفا وہی
اے مصحفی نگاہ پھسلتی ہے اب تلک

199

سینے کا اُٹھان دیکھیو ٹک — یارو یہ جوان دیکھیو ٹک
کیا چلتی ہے گالیوں میں فرفر — کافر کی زبان دیکھیو ٹک
کیا آئے ہے جھومتا نشے میں — اس کیفی کی آن دیکھیو ٹک
پھولی ہے شفق میں شام گویا — یہ مسّی و پان دیکھیو ٹک
کچھ اور ہے اُس سوا جہاں میں؟ — اے اہلِ جہان دیکھیو ٹک
ہے قیس کے ساتھ فوجِ طفلاں — دیوانے کی شان دیکھیو ٹک
مانندِ جرس ہے کوئی پیچھے — سرگرمِ فغان دیکھیو ٹک

واماندہ یہ مصحفی نہ ہووے
اے راہروان دیکھیو ٹک

1۔ دَورِ خط = خطِ رخسار آنے پر بھی

200

آوٴ جی ہم کھپا کریں کب تک — جی ہی جی میں رُندھا[1] کریں کب تک
یہ نہ آیا تمھارے جی میں کبھی — کہ ہم اس سے حیا کریں کب تک
اے شبِ ہجر تو ہی منصف ہو — شمع آسا جلا کریں کب تک
بیٹھ رہتے ہیں اب تُو ہو ناچار — تیری خاطر پھرا کریں کب تک
آج تو ہم قفس سے اُڑتے ہیں — انتظارِ صبا کریں کب تک
تو ہی کہہ تیری بے وفائی پر — صبر، اے بے وفا کریں کب تک
ہوگئی جوں قلم زبان تو شق — وصفِ زلفِ دوتا کریں کب تک
کبھی تو بھی کسی کا کہنا مان — ہم ترا ہی کہا کریں کب تک

مصحفی آستیں رکھ آنکھوں پر
ان سے دریا بہا کریں کب تک

201

برسات میں رکھے ہے فلک کیا صفا کا رنگ — آبی نظر پڑے ہے سراسر ہوا کا رنگ
کس کس کا خوں ہے اس سے کیا تو نے بے شعور — جو ہو گیا سیہ تری تیغِ جفا کا رنگ
رنگِ کفک تو تھا ہی، یہ کرتا ہے مجھ کو قتل — اے نازنیں صنم یہ تری پشتِ پا کا رنگ
کیا ہی یہ بادل اُٹھتے ہیں تہ سی لیے ہوئے — ہے کس کے عکسِ رخ سے گلابی ہوا کا رنگ
ظالم کا ہاتھ صاف نہیں اس قدر ہوا — کرتا ہے مشقِ خوں ابھی اُس کی حنا کا رنگ
بادل اُٹھے ہیں کیا ہی دھواں دھار اس گھڑی — ہے کیا مزے پہ دیکھ تو، ساقی گھٹا کا رنگ

1۔ رُندھنا = گھٹن

ہے خاک لطف نشۂ ہستی کی سیر کا　　آنکھوں میں جب تلک کہ نہ چھلکے فنا کا رنگ
ماتم میں کس کے آج ہوئے ہیں سیاہ پوش　　ہے نیل گوں جو اِس نگہِ سرمہ سا کا رنگ
کس تازہ گل نے آ کے کیا باغ میں خرام　　چہرے سے اُڑ گیا جو نسیم و صبا کا رنگ
میں لغو بولوں حق میں ترے، کیا دہن و لے　　کچھ تو عیاں کرے ہے یہ فرشی رِدا[1] کا رنگ

گل اپنی میرزائی کو اک دم میں بھول جائے
دیکھے جو مصحفی وہ مرے میرزا کا رنگ

202

دیکھا ہے کس کے ہاتھ کی بھیگی حنا کا رنگ　　بھگواں کیا ہے جس پہ شفق نے رِدا کا رنگ
سرخیِ چہرہ اپنی بہ زردی بدل ہوئی　　وہ ابتدا کا رنگ تھا، یہ انتہا کا رنگ
غصے میں سرخ دیکھ کے، اے بت ترا عذار[2]　　بولا فرشتہ، ہے یہی قہرِ خدا کا رنگ
چھلّے طلا کے، اُس کی جو پوروں میں ہیں پھنسے　　کیا ایک ہو گیا ہے انھوں سے طلا کا رنگ
گل بازیاں[3] رہیں ہیں اُسے ساتھ غیر کے　　ہے ان دنوں یہ اُس بتِ نا آشنا کا رنگ
پرتو سے حسنِ لالہ ستاں کے عجب نہ جان　　اس فصلِ گل میں گر شفقی ہو گھٹا کا رنگ
ہے خاک لطف، نشۂ ہستی کی سیر کا　　آنکھوں میں جب تلک کہ نہ چھلکے فنا کا رنگ[4]
رنگِ حنائے پا کے اثر سے عجب نہ جان　　اے گل جو لالہ گوں ہو ترے نقشِ پا کا رنگ

چوسر ہے مجھ کو اُس گلِ رعنا سے مصحفی
مارا پڑا ہے جس سے نسیم و صبا کا رنگ

203

اس گلشنِ پُر خار سے مانندِ صبا بھاگ　　وحشت یہی کہتی ہے کہ زنجیر تڑا بھاگ
گرتے تھے خریدار کب اس طرح سے اس پر　　پانووں سے ترے لگتے ہی مہندی کو لگا بھاگ[5]

1۔ رِدا = چادر 2۔ عذار = رخسار، گال 3۔ گلبازی = پھولوں سے کھیلنا، (یا چھلّے سے داغ لگوانا = گل چھلّے)
4۔ یہ شعر غزل نمبر 201 میں بھی موجود ہے 5۔ بھاگ لگنا = نصیب جاگ اُٹھنا، خوش قسمت ہونا

شوخی کہوں کیا تیرے تصور کی، کہ ہے ہے — شب سامنے آ کر مرے آگے سے گیا بھاگ
جب کبکِ دری دیکھے ہے رفتار کو اس کی — کہتا ہے یہی جی میں "یہ رفتار اُڑا بھاگ"
زاہد جو ہوا کر کے وضو حوض پہ قائم — اک رند کو سوجھی کہ تو اب اس کو گرا بھاگ
ٹھہرا جو ذرا بحرِ محبت پہ میں جا کر — آئی لبِ ساحل سے یہی اس کے صدا "بھاگ"

اے مصحفی ہے مارِ فلک رہزنِ مردم
تو بھاگ سکے اس سے تو از بہرِ خدا بھاگ

ل

204

ترسا نہ مجھ کو، کھینچ کے تلوار مار ڈال — گر مار ڈالنا ہے تو یک بار مار ڈال
عاشق جو تیری زلف کا ہو اُس کو تو صنم — لے جا کے تیرہ شب، پسِ دیوار مار ڈال
کبکِ دری کے لاکھ قفس ہوں جہاں دھرے — دکھلا کے اُن کو شوخیِ رفتار مار ڈال
کچھ ہم نے تیرے ہاتھ تو پکڑے نہیں میاں — گر جانتا ہے ہم کو گنہگار، مار ڈال
صیاد تجھ کو کس نے کہا تھا کہ فصلِ گل — مجھ کو قفس میں کر کے گرفتار مار ڈال
جو جاں بہ لب ہو حسرتِ دیدار میں تری — دکھلا کے اس کو جلوۂ رخسار مار ڈال
سودائیانِ عشق کا جھگڑا چکا کہیں — لے جا کے ان کو برسرِ بازار مار ڈال
تیغ و کمند مانگ کر ابرو و زلف سے — ق — عاشق بہت ہوئے ہیں جفا کار، مار ڈال

گر یہ بھی ہو سکے نہ تو کہتا ہے مصحفی
دو چار کر لے قید میں، دو چار مار ڈال

205

مجھ سیہ بخت کا دم آنکھوں میں لایا کاجل — چشمِ بد دور میاں تم نے لگایا کاجل

گرمیِ خواب سے تیری یہ ہوا اُس کو قلق — کہ تری چشم سے باہر نکل آیا کاجل

تب تو تاپشتِ پلک ہے کہ خوشی کے مارے — تیری آنکھوں میں پری رُو نہ سمایا کاجل

صبح سوتے سے جو اُٹھا تو یہ عیاری دیکھ — آنکھیں مل مل کے ہتھیلی سے چھڑایا کاجل

نہیں آنکھوں کی سپیدی میں یہ تل کاجل کا — مردمِ چشم نے ظاہر ہے چُرایا کاجل

لائی ہے نرگسِ شہلا تری آنکھوں کے لیے — اپنی کجلوٹی[1] میں پھولوں کا بسایا کاجل

گھل گئے دیکھتے ہی ہم اُسے اولے کی طرح — اس نے ٹھنڈک کو جو آنکھوں میں گھلایا کاجل

میری آنکھوں سے جو یاں تیل ڈھلا نزع کے وقت — اس نے واں رو کے سب آنکھوں سے چھڑایا کاجل

بس کہ تسخیرِ نکویاں مجھے منظور رہی — ق — آئی جب رات دوالی کی لگایا کاجل

اور سحر اس کی بھی خدمت میں گیا، آنکھوں سے[2] — گر سُنا میں، کسی سیانے نے بنایا کاجل[3]

مصحفی دل جو لگا اس سے چپکنے میرا
کس نے یہ پیار کی چتون سے دکھایا کاجل

206

دستِ معشوقِ سیم تن کا گل — یوں شگفتہ ہے جوں چمن کا گل

کھول بندِ قبا ہی تو اپنے — وا ہو تا غنچۂ دہن کا گل

میرے سینے پہ داغِ غم تو نہ جان — ہے کسی کے یہ چت لگن[4] کا گل

اب تلک بے ستوں میں گرتا ہے — ہر طرف خونِ کوہ کن کا گل

مصحفی لکھنؤ میں کیا مری قدر
اس خرابے میں ہوں میں بن کا گل

م

207

جب کبھی پڑتی ہے اُس حسن کی تصویر پہ چشم — خمِ ابرو سے نظر آتی ہے شمشیر پہ چشم

1۔ کجلوٹی = کاجل کی ڈبیا 2۔ آنکھوں سے = بہ سرو چشم 3۔ طلسماتی کاجل جو عمل تسخیر کے لیے بناتے تھے 4۔ چت لگن = دل لگنا، عشق

لطف کیا ہے مجھے اس باغ میں رہنے کا کہ یاں　　مثلِ نرگس ہے مری آٹھ پہر تیر پہ چشم
حال کیا سمجھے وہ زنداں کے گرفتاروں کا　　نہ پڑی جس کی کبھی حلقۂ زنجیر پہ چشم
جیسے سنبل پہ کوئی پھول دھرے نرگس کا　　یوں دھری ہے مری اس زلفِ گرہ گیر پہ چشم
کر کے بند آنکھیں وہیں بیٹھ گیا رستے میں　　اک مسافر کی پڑی تھی، ترے نخچیر پہ چشم

مصحفی تیر دوسار[1] اُس کا میں دیکھا دل میں
پڑنے پائی نہ مری دیدۂ زہ گیر[2] پہ چشم

208

اب دیکھیے ذرا تیشۂ فولاد کا عالم　　شیریں کو دکھائے کوئی فرہاد کا عالم
ہے نیل کا کٹرہ[3] بھی کوئی طرفہ مرقّع　　نکلے ہے سدا جس سے پری زاد کا عالم
صنعت سے عیاں ہوتی ہے صانع کی فراست　　تصویر میں دیکھے کوئی بہزاد کا عالم
کیوں کر نہ ترے گرد پھرے بادِ بہاری　　ہے قد کی لچک میں تری شمشاد کا عالم
کچھ قیدِ علائق سے نہیں اُس کو سروکار　　عالم سے جدا ہے دلِ آزاد کا عالم
گلگشتِ چمن کا نہ رہے ہوش بھی تجھ کو　　دکھلاؤں گر اپنے دلِ ناشاد کا عالم
گر زمزمہ بنیاد کیا[4] میں نے قفس میں　　ہو جاوے گا دشمن مرے صیاد کا عالم

اے مصحفی ہو جاوے غزل اور بھی رنگیں
ہر شعر میں ہو جس کے پری زاد کا عالم

209

ٹک دیکھیو اُس حسنِ خدا داد کا عالم　　مکھڑے کی صفا، اور یہ بیداد کا عالم
ہر چند سراپا ہے ترا خوب، پہ کافر　　نقشے میں ترے نکلے ہے اِستاد کا عالم[5]
اقلیمِ جنوں کا میں کیا سیر، نہ پوچھو　　واں ایک ہے ویرانہ و آباد کا عالم
نقشے سے ترے حسن و رخ و خط کے عیاں ہے　　چھپتا ہے کوئی خامۂ اُستاد کا عالم

1۔ دوسار = آر پار، ترازو ہونا 2۔ زہ گیر = کمان کا وہ حصہ جس پر انگوٹھا رکھ کر کماں کھینچتے ہیں
3۔ نیل کا کٹرا = دہلی کے چاندنی چوک میں ایک قدیم محلّہ 4۔ بنیاد کیا = شروع کیا
5۔ اِستاد کا عالم = یعنی کھڑا نقشہ

پائین[1] کو اُس کے جو شطِ[2] اشک رواں ہے　　آنکھوں میں مری نکلے ہے بغداد کا عالم
جب کر کے مجھے قتل وہ مقتل سے پھرا ہو　　اس دم کوئی دیکھے مرے جلاد کا عالم
اے بانگِ جرس سچ ہے، ترا حوصلہ کتنا　　لاوے تو کہاں سے مری فریاد کا عالم
آنکھیں جو مری سرخ ہیں، بے وجہ نہیں ہیں　　اِس راہ سے گزرا ہے پری زاد کا عالم
دل ٹوٹ گیا، ہم سے کڑا ہو کے جو بولا　　اِس شیشۂ نازک میں ہے فولاد کا عالم

کیوں کر نہ کہے تازہ غزل مصحفی آخر
ہے شعر کا عالم بھی تو ایجاد کا عالم

210

تھا عشق کی آتش سے زبس سینہ مرا گرم　　خوں فصد کا نکلا تو مری، لیک بلا گرم[3]
ہے فرش دوانوں کا ترے خارِ مغیلاں　　خاکسترِ گلخن پہ وہ کرتے نہیں جا گرم
چک پھیریاں[4] لے لیکے ہنساتی ہے گلوں کو　　ہو نکلی ہے کیا دیکھیو، کم بخت صبا گرم
مدفوں ہیں جہاں کشتے تری برقِ نگہ کے　　کہتے ہیں کہ رہتی ہے زمیں واں کی سدا گرم
نالوں کو مرے سن کے ہوئی سرد وہ دم میں　　ہر چند کہ تھی بلبلِ بستاں کی نوا گرم
جب با رخِ افروختہ وہ بام پر آیا　　خورشیدِ قیامت سرِ یک نیزہ ہوا گرم
آنا ہے تو جلد آ، نہیں ہوتا ہے یہ ٹھنڈا　　اب تک تو ہیں بیمار کے تیرے کفِ پا گرم

اے مصحفی اب ایک غزل اور سنا دے
اس میں تو کوئی قافیہ تجھ سے نہ بندھا گرم

211

یا، اس نفسِ سرد کی تھی سینے میں جا گرم　　یا لب سے نکلتے ہی گیا روے ہوا گرم
جاڑے کی تعب[5] اتنی نہ معلوم ہو مجھ کو　　آوے جو بغل میں مری وہ تنگ قبا گرم

1۔ پائین = نیچے　2۔ شط = دریا　3۔ بلا گرم = حد درجہ گرم　4۔ چک پھیریاں لینا = چکر لگانا، منڈلانا　5۔ تعب = سختی، مشقت

پرسش نہ ہوئی ایک کی ہر چند ہمیشہ کوچے میں ترے حشر کا ہنگامہ رہا گرم
ٹانکا تو نہ ٹوٹا ہو کوئی زخمِ جگر کا پہلو کے تلے کچھ مجھے لوہو سا لگا گرم
یاں بیٹھ گئے ہیں ترے بیمار کے جبڑے[1] واں کرتے ہیں تجویز طبیب اُس کو دوا گرم
اس گل نے شرارت میں زبس پانو رکھا ہے کہتا ہے مرے تلووں کو لگتی ہے حنا گرم
صیاد ٹک آرایشِ زندان و قفس کر ہے سوے اسیراں خبرِ بادِ صبا گرم
سنتے ہو میاں مصحفی، آخر تو بکے ہو
ایک اور بھی پڑھ بیٹھو غزل، اس سے سوا گرم

212

ہم کرنے نہ پائے تھے چمن میں ابھی جا گرم جو آئی اُٹھانے کو ہمیں ہو کے صبا گرم
پھولوں کا، چھڑک کر کے اُسے کیجیے پنکھا نازک ہے وہ اتنا کہ لگے اُس کو ہوا گرم
عارض نے ترے حسن کی چوری جو لگائی خورشید نے کھانے کو قسم کولہ[2] کیا گرم
میں زخمِ جگر اس کو دکھایا تو مزہ دیکھ لے منہ سے اُگال اُس نے وہیں اُس پہ رکھا گرم
برداشت جو سردی کی نہیں، ہاتھوں کو اپنے سینک آگ پہ کرتا ہے وہ جاڑے میں حنا گرم
لے قیس خبر، محملِ لیلیٰ تو نہ ہووے اس دشت سے آتی ہے کچھ آوازِ درا گرم
جلتے ہوئے دیکھا تھا مجھے خواب میں اُس نے دہشت سے جو چونکا، تو بھڑک کر کے اُٹھا گرم
رہنے پہ جو مسجد کے مری شیخ کی بگڑی وہ مجھ پہ ہوا گرم تو میں اُس پہ ہوا گرم
جو دیکھ مجھے ساتھ ترے، لپٹے ہے مجھ سے میں جی میں رُندھوں ہوں کہ یہ کیوں آج ملا گرم
شوخی نے کفک کی اُسے چالاک کیا ہے اس ڈھنگ سے کاہے کو ترا پاشنہ[3] تھا گرم
ہے ایک تو گھنگرو میں لچک قہر کمر کی پھر تس پہ قیامت ہے یہ ہر جنبشِ پا گرم
ہر عضو مٹکتا ہے پڑا شوخی کے مارے ہے ایک سے اک اُس بتِ کافر کی ادا گرم

1۔ نزع کی حالت میں جو علامتیں ظاہر ہوتی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بتیسی بند ہو جاتی ہے۔
2۔ کولہ (بروزن مَولا) = پہلو، مگر یہاں کولہ بروزن ڈولہ کوئلہ کا مخفف ہے، یعنی ''اگنی پریکشا'' کے لیے تیار ہو گیا
3۔ پاشنہ = ایڑی

اے مصحفی خاموش کہ قائل ہوں میں تیرا
احسنت ہے، مجلس کو بہت تو نے کیا گرم

213

جلادی کی یاں شان ہے، کو مہر و کجا رحم دیوے دلِ بے رحم کو اُس بت کے خدا رحم
گر سامنے پتھر کے میں کہتا ہوں غم اپنا رو دیوے ہے وہ بھی مرے احوال پہ کھا رحم
یارو طلبِ رحم کروں کس سے میں ہے ہے ہے آپ سے غافل وہ ابھی سمجھے ہے کیا رحم
دم ہچکیاں لے لے کے وہ جب توڑے ہے اپنا اُس دم ترے بیمار پہ کھاتی ہے قضا رحم
اُڑ جائے گا رنگ اس کا نہ اس طرح گلے لگ کر گل کی نزاکت پہ ٹک اے بادِ صبا رحم
گو مصحفیِ خستہ ملا خاکِ سیہ میں
کیا غم ہے تجھے، کھائے میاں تیری بلا رحم

214

حور پاوے ہے کب اس جلوہ گری کا عالم تیرے جُوڑے میں جو نکلے ہے پری کا عالم
لختِ دل کو مرے آج اشک لیے جاتا ہے دیکھیو اس کی ذرا نامہ بری کا عالم
صحو اور سُکر میں رہتے ہیں تبھی تو فقرا کیونکہ عالم ہے عجب، بے خبری کا عالم
شب مگر رہ گئی تھوڑی، جو نظر آتا ہے ہر ستارے میں چراغِ سحری کا عالم
کوئی ناظر ہو تو ہر لختِ جگر میں میرے صاف نکلے ہے عقیقِ جگری کا عالم
آنکھیں نرگس نے جھکا دی ہیں خجالت سے میاں دیکھ آنکھوں کی تری کج نظری کا عالم
مصحفی اور بھی کچھ لکھ کہ قلم میں تیرے
اس گھڑی ہے روشِ کبکِ دری کا عالم

215

بھولتا ہے کوئی اُس جلوہ گری کا عالم گوٹ[1] میں تھا جو دوپٹے کی پری کا عالم

1۔ گوٹ = دوپٹے کے کنارے کی بیل، کناری

چاک پیراہنِ گل میں ہیں ہزاروں لیکن کب وہ پاتا ہے مری جامہ دری کا عالم
دیکھیں یہ آہ اثر کرتی ہے اپنی کس دن اب تلک تو ہے وہی بے اثری کا عالم
میرزایانِ صفاہاں کی کمر ٹوٹ گئی دیکھتے ہی تری اس چارزری[1] کا عالم
دل کو چھیلے ہے چھری سے کوئی جیسے ظالم ہائے رے ہائے تری کج نظری کا عالم
یاں خبر لینے کو آیا ہے مسیحا میری اور اب تک ہے وہاں بے خبری کا عالم
مصحفی کو کہیں دیکھو تو لے آنا کہ میاں
سخت مشتاق ہے اُس رہ گزری کا، عالم

216

کہتے ہیں کچھ بھی اس صنمِ نازنیں سے ہم روٹھے ہیں اپنے ہی دلِ اندوہ گیں سے ہم
ہم کو مکانِ قیس کا ملتا نہیں پتا پوچھیں یہ جاکے کون سے صحرا نشیں سے ہم
صورت شبِ وصال کی اُٹھتے ہی وقت صبح جاتے ہیں بوجھ آپ کی چینِ جبیں سے ہم
کوچے میں اس کے اپنا گزر کیا ہوا کہ بس جیتے ہی جی گزر گئے دنیا و دیں سے ہم
بے خانمانی اپنی کرے اُس کا جی اچاٹ اک اور کو لگا کے جو لاویں کہیں سے ہم
کاش آ کے میری خاک پہ لڑکوں سے وہ کہے آؤ چلیں گھسیٹتے دامن یہیں سے ہم
دلی میں اپنا تھا جو کچھ اسباب رہ گیا اک دل کو لے کے آئے ہیں اُس سرزمیں سے ہم
فتراک سے بندھے ہے سر اپنا تو تب بھی جان آنکھوں کو ملتے ہیں ترے دامانِ زیں سے ہم
گریے سے تو ملی ہمیں فرصت نہ مصحفی
آنکھوں کو پونچھتے ہی رہے آستیں سے ہم

217

غیر کو جائے ہے ہمراہِ نشانی پیغام اور ہم رہتے ہیں مشتاقِ زبانی پیغام

1۔ چارزری = زردوزی کی قسم Brocaded

ہم نے بھیجا تو ہے اُس گل کو زبانی پیغام　　پر یہ ڈر ہے نہ کرے اس پہ گرانی پیغام
میرے ہوتے ہے روا، کون سے مذہب میں بھلا　　بھیجنا غیر کو، اے دشمنِ جانی پیغام
گرچہ آنکھیں نہیں اُس شوخ کی ملتیں مجھ سے　　پر چلا جائے ہے نظروں میں نہانی پیغام
''اپنی تصویر جو کھنچوانی ہے تو جلد آؤ''　　اس کو لکھ لکھ کے یہی بھیجے ہے مانی پیغام
ہم جواں ہوتے ہی اک تازہ جواں پر مر گئے　　کہ اجل کا ہمیں لائی تھی جوانی پیغام
نہ لکھا خط میں مرا نام کہ رسوا میں نہ ہوں　　اُس نے بھیجا تو بہ ایں قاعدہ دانی پیغام
دل میں تقریر جو قاصد کے اثر کرتی ہے　　کس نے بھیجا تھا بہ ایں سحر بیانی پیغام
مصحفی اُس کے تغافل نے تو مارا ہم کو　　ق　　سچ ہے کب بھیجے ہے وہ یوسفِ ثانی پیغام
ہاں مگر اپنی طرف سے کوئی آ کر کہہ دے　　''کہ ترا آمدہ از پیشِ فلانی پیغام''

218

اُس گلی میں جو ہم کو لائے قدم　　پانو پڑتے ہی لڑکھڑائے قدم
وائے قسمت میں رہ گیا پیچھے　　اور رفیقوں نے جلد اُٹھائے قدم
ہر قدم پر ہے لاش کشتے کی　　اب کہاں اُس گلی میں جائے قدم
تیرے کوچے سے آئے جو، اُن کے　　اپنی آنکھوں سے میں لگائے قدم
اشکِ خونی سے میرے اُس کُو میں　　نخلِ مرجاں ہیں نقش ہائے قدم
کاروانِ عدم کدھر کو گیا　　مطلق آتی نہیں صدائے قدم
پیش تر منزلِ فنا سے نہیں　　ق　　وادیِ ما و من میں جائے قدم
مصحفی سالکانِ عشق کا ہے
ایسی منزل پہ انتہائے قدم

ن

219

پھول لالے کے نہ اس خاک سے جم نکلے ہیں　　یہ کئی لختِ جگر ہو کے بہم نکلے ہیں

جان کو جیسے نکالے ہے کوئی قالب سے — کیا بری طرح ترے کوچے سے ہم نکلے ہیں
یاں تو وحشت نہ کر اب، اے دلِ دیوانہ ٹھہر — کہ زیارت کو تری اہلِ حرم نکلے ہیں
پیچ پر پیچ ہیں اور بل پہ ہے بل، چین پہ چین — کچھ نئی طرح کے اُس زلف میں خم نکلے ہیں
ہوگیا ہے سرِ رہ شورِ قیامت برپا — گھر سے باہر جو وہ دو چار قدم نکلے ہیں
اُس کا بیمار مُوا جب تو وہ بولا، اس کے — کیا بری طرح سے آخر کے یہ دم نکلے ہیں
ہیں دمِ تیغ پہ یہ دیدۂ حیرت زدگاں — پھول نرگس کے جو برنوکِ قلم نکلے ہیں
لٹ کے منزل سے کوئی یوں تو نہ آیا ہوگا — جس طرح چھوڑ کے ہم شہرِ عدم نکلے ہیں
ایسی آزردگی کیا تھی ہمیں، اُس کوچے سے — پھر نہ آنے کی جو ہم کھا کے قسم نکلے ہیں
یہ سیہ پوش شبِ ہجر کی آہیں ہیں مری — تو کہے تعزیہ داروں کے علم نکلے ہیں

جس بیابانِ خطرناک میں اپنا ہے گزر
مصحفی قافلے اُس راہ سے کم نکلے ہیں

220

خوش طالعی میں شمس و قمر دونوں ایک ہیں — دن رات کا تو فرق ہے، پر دونوں ایک ہیں
خواہی میں رووَں لختِ جگر، خواہ اشک صرف — آنکھوں میں میری لعل و گہر دونوں ایک ہیں
دیجور[1] میں کسے ہے سپید و سیہ کا فرق — زندانیوں کو شام و سحر دونوں ایک ہیں
کہنے کو گرچہ ہاتھ جدا ہیں مرے و لے — ہونے کو اُس کا طوق و کمر[2] دونوں ایک ہیں
خواہی تو چشمِ چپ سے در آ، خواہ راست ہے — آنے کو گھر میں دل کے یہ در دونوں ایک ہیں
جو قلزمِ فنا کا مسافر ہوا اُسے — بادِ مراد و موجِ خطر دونوں ایک ہیں

میں جل رہا ہوں ان کے تو ہاتھوں سے، کچھ نہ پوچھ
اے مصحفی یہ دیدۂ تر دونوں ایک ہیں

1۔ دیجور = گھنگھور اندھیرا 2۔ کمر = پٹکا

221

اگر چہ دل تو ہمیں تم سے کچھ عزیز نہیں
پہ کیا کرو گے کہ ایسی تو کچھ یہ چیز نہیں

ہوا ہے دستِ جنوں کا مگر کرم اس پر
ہمارے جامے میں باقی جو اک بریز[1] نہیں

ہم ایک دم میں دو عالم کو بخش دیتے ہیں
اگر چہ ہم کو تصرف بہ یک پشیز[2] نہیں

تو اس سے حسن میں دہ چند ہے خدا کی قسم
کہوں میں کیونکے کہ حورا[3] تری کنیز نہیں

تمھارے سامنے کیا مصحفی پڑھے اشعار
بھلے بُرے کی تو اب تک تمھیں تمیز نہیں

222

تم گرم ملے ہم سے نہ سرما کے دنوں میں
پیش آئے بہ گرمی بھی تو گرما کے دنوں میں

جب آئی خزاں ہم کو کہا "باغ چلو ہو؟"
پوچھا نہ کبھی سیر و تماشا کے دنوں میں

نے غرفے سے جھانکا نہ کبھی بام پر آئے
پنہاں رہے تم حسنِ دل آرا کے دنوں میں

جی ہی میں رکھی اپنے، میاں جی سے جو اُبچی
کچھ ہم نے کہا تم سے تمنا کے دنوں میں؟

لکھ لکھ کے اُسے یاروں نے دیوان بنایا
کچھ کچھ جو بکا کرتے تھے سودا کے دنوں میں

دل اپنا اُلجھتا تھا تبھی، جن دنوں پیارے
تھی زلف تری طرۂ لیلیٰ کے دنوں[4] میں

مفلس ہوئے اے مصحفی افسوس کہ ہم نے
پیدا نہ کیا یار کو پیدا[5] کے دنوں میں

223

بن دیکھے جن کے پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہے جو اُن سے برسوں جدائیاں ہوں

ہے روزِ پنج شنبہ تو فاتحہ دلا دے
گھر تیرے کشتگاں کی روحیں نہ آئیاں ہوں

1۔ بریز = دھاگا، ریشہ 2۔ پشیز = کوڑی، بہت کم قیمت سکہ 3۔ حُوراء = حُور کا واحد
4۔ دنوں میں = حال میں (روزمرہ) 5۔ پیدا کے دنوں میں = اچھے دنوں میں

شب وصل کی گر آوے تو میرے اُس کے اس شب — باتوں میں قصے نکلیں، جھگڑے لڑائیاں ہوں

کیا شک ہے بانکپن میں اُس خانہ جنگ کی کچھ — ابرو کی جس نے منہ پر تلواریں کھائیاں ہوں

شب مَیں لہو ہلوکا[1] اُس تیغ زن کے ہاتھوں — ایسا نہ ہو کہ مجھ پر موٹھیں[2] چلائیاں ہوں

آئینہ دیکھنے میں میری طرف کو پھر جائے — ناگہ منہ اس کا تو کیا قدرت نمائیاں ہوں

گر خاک سے ہماری پُتلا کوئی بناوے — تیری دعا میں اس کی اُٹھی کلائیاں ہوں

ہم نامِ عشق لیتے جی ہاریں کیا ستم ہے — اور دمبدم ادھر سے صبر آزمائیاں ہوں

اے مصحفی سکت[3] کی اب اک غزل تو لکھ جا
دست و قلم میں تیرے گر کچھ سمائیاں[4] ہوں

224

خطرہ رہے، گر اس سے دو دن جدائیاں ہوں — آنکھیں نہ واں کسی سے اُس نے لڑائیاں ہوں

مشکل ہے اُس کا بچنا، جس کشتۂ وفا پر — مژگاں کی جنبشوں نے چھریاں چلائیاں ہوں

گجرے کے بوجھ سے پھر کیونکر لچک نہ کھاویں — شاخِ سمن سے نازک جب وہ کلائیاں ہوں

دیوار و در کے رخنے، بے نُور ہو رہے ہیں — آئینے سے نہ اُس نے آنکھیں لڑائیاں ہوں

کیوں ہاتھ سے مرے تم کھینچو ہو ہاتھ اپنا — میں وہ نہیں جو مجھ سے کچھ بے ادائیاں ہوں

سفاک کیوں نہ ہووے وہ تُرکِ غمزہ جس کی — مژگاں کی پرچکوں[5] نے باڑیں چلائیاں ہوں

کانوں پہ اب وہ لوٹے، یوں بے کلی سے جس نے — ہاتھوں سے تیرے چھڑیاں پھولوں کی کھائیاں ہوں

ہم چور دل کا اپنے کیوں کر کہیں نہ اُس کو — آنکھیں ملا کے جس نے نظریں چُرائیاں ہوں

کیا جانے رشک ہم کو اے مصحفی رہے پھر
سارے جہاں سے اُس کی جب آشنائیاں ہوں

1۔ ہلوکا = اُگلا 2۔ موٹھ = لکڑی کے سرے پر لگی شام 3۔ سکت = ڈھنگ 4۔ سمائی = صلاحیت، قدرت 5۔ پرچک = جھپک

225

طور پر اپنے کسی دن بھی خور و خواب ہے یاں؟ ، زندگانی کا بھلا کون سا اسباب ہے یاں

چاہِ سیماب سے سیماب جو جوشاں ہے ہنوز میں سمجھتا ہوں کہ مدفوں کوئی بیتاب ہے یاں

خمِ ابرو کی ترے کیوں کے نہ تعریف کروں اس سے بہتر بھی کوئی تیغِ سیہ تاب ہے یاں؟

مقتلِ عشق کی بھی کیا ہی ہے جائے کھٹکی[1] کہ نہ سر اور نہ سجدہ ہے نہ محراب ہے یاں

میری تربت کے تو آنگن میں نہ ٹھہرا اک دم یہ ترے جی میں نہ آیا شبِ مہتاب ہے یاں

کشتگاں کو تری شمشیر یہی کہتی ہے کیجیے اس پہ قناعت، تو دمِ آب[2] ہے یاں

اس کو بھی گر نہ فلک دیکھ سکے، چُر والے اور تو کیا ہے، پریشانی کا اسباب ہے یاں

اعتبارات ہیں یہ ہستیِ موہومی کے فی الحقیقت تو کوئی خاں ہے نہ نوّاب ہے یاں

خاک تربت کی مری دیکھ چمکتی، احباب جی میں کہتے ہیں مگر معدنِ سیماب ہے یاں

کیا خطِ عاشق و معشوق کو کوئی سمجھے کچھ کنایت سی ہے، آداب نہ القاب ہے یاں

مصحفی آپ ہی ہم قتل ہیں اپنے ہاتھوں
ورنہ کیں خواہ تو رستم ہے نہ سہراب ہے یاں

226

ہم تو اُس کوچے میں گھبرا کے چلے آتے ہیں
دو قدم جاتے ہیں، پھر جا کے چلے آتے ہیں

ہم کو اے شرم ٹک اب اُس کی طرف جانے دے
حال اپنا اُسے دکھلا کے چلے آتے ہیں

دن کو زنہار ٹھہرتے نہیں ہم اُس کو میں
رات کو ملنے کی ٹھہرا کے چلے آتے ہیں

1۔ کھٹکی = کھوٹی، نرالی (عوامی) 2۔ دم آب = پانی کا گھونٹ

وہ ادا کشتہ ٹھہرتا نہیں پھر مقتل میں
لاش کو جس کی وہ ٹھکرا کے چلے آتے ہیں

میں بھروسے ہی میں رہتا ہوں، تری زلفوں میں
یار میرے مجھے پھنسوا کے چلے آتے ہیں

وہ جو ملتا نہیں ہم اُس کی گلی میں دل کو
در و دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

جاتے ہیں کوچے میں ہم اُس کے تو واں غیر کو دیکھ
پھر نہ آنے کی قسم کھا کے چلے آتے ہیں

قیدی مر جاتے ہیں جب آپ کبھی زنداں کے
قفل دروازے کو لگوا کے چلے آتے ہیں

چھوٹتے ہیں جو اسیرانِ قفس گلشن میں
کیا ہی پُرشوق سے پھیلا کے چلے آتے ہیں

غیر جب وصل کا کرتا ہے سوال اُن سے تو وے
کیسے محجوب ہو، دم کھا کے چلے آتے ہیں

رہروانِ سفرِ بادیۂ عشق، اے وائے
قافلے راہ میں لٹوا کے چلے آتے ہیں

میں تو سمجھا تھا بجھاویں گے کچھ آنسو تفِ[1] دل
یہ تو اور آگ کو بھڑکا کے چلے آتے ہیں

ساتھ میّت کے مری وہ نہیں چلتے دو قدم
بس وُہیں نعش کو اُٹھوا کے چلے آتے ہیں

دل کی بیتابی سے جاتے تو ہیں ہم اس کُو میں
لیک اِس جانے سے پچھتا کے چلے آتے ہیں

1۔ تف بہ معنی سوزش استعمال کیا ہے

بدرقہ گر نہیں احباب، تو پھر کیوں پسِ مرگ
تا بہ منزل مجھے پہنچا کے چلے آتے ہیں
مصحفی کے تئیں دیکھیں ہیں جو وہ کشتہ پڑا
پاس جاتے نہیں، شرما کے چلے آتے ہیں

227

یار ہیں چیں بر جبیں سب، مہرباں کوئی نہیں
ہم سے ہنس کر بولنے والا یہاں کوئی نہیں
قسمت اک شب لے گئی مجھ کو جو باغِ وصل میں
دیکھتا کیا ہوں کہ اُس کا باغباں کوئی نہیں
گھر کے دروازے سے تب باہر رکھے ہے وہ قدم
دیکھ لے ہے جب، قریبِ آستاں کوئی نہیں
برق گلشن میں پڑی کس کے تبسم سے صبا
جو نہ جھلسا ہووے ایسا آشیاں کوئی نہیں
وائے ناکامی کہ فریادی ہیں ہم اُس شہر میں
جز خموشی داد رس اپنا جہاں کوئی نہیں
صبح ہوتے خوابِ غفلت سے جو چونکے ہم تو ہائے
آنکھ کے کھلتے ہی دیکھا، کارواں کوئی نہیں
اے دلِ بے جرأت[1] اتنی بھی نہ کر بے جرأتی
جز صبا اُس گل کا اس دم پاسباں کوئی نہیں
دو گھڑی مل بیٹھیں ہم تم ایک دم جو چین سے
ہائے زیرِ آسماں ایسا مکاں کوئی نہیں
میں جو پوچھوں ہوں ترے گھر میں بھی آتا ہے کوئی؟
یوں کہے ہے پھیر کر منھ میں زباں "کوئی نہیں"!
منھ اُٹھائے جاتے ہیں یوں دشتِ غربت میں چلے
نابلد ہیں سب ہی ہم میں، راہ داں کوئی نہیں
"ٹھہریو ٹک ٹھہریو" کی آئے ہے آواز سی
دیکھیو پیچھے تو آج اے ہمرہاں کوئی نہیں
خواب گہ سے کیا اُڑا کر لے گئی اُس کو صبا
اور سب زیور ہے اُس کا، عطرداں کوئی نہیں
مصحفی کیا خاک ہم شعر و سخن پر جی لگائیں
شاعری یہ کچھ ہے لیکن قدرداں کوئی نہیں

228

گھر میں باشندے تو اک ناز میں مر جاتے ہیں
اور جو ہمسائے ہیں آواز میں مر جاتے ہیں

1۔ بے جرأت = بزدل

کبک و طاؤس کو چلتا ہے تو ٹھہرا کے تو ہم　　تیری رفتار کے انداز میں مرجاتے ہیں
مژدہ اے یاس، کہ یاں کنجِ قفس کے قیدی　　یک بیک موسمِ پرواز میں مرجاتے ہیں
ہیں ترے رمزِ تبسم کے ادا فہم جو شخص　　جنبشِ لعلِ فسوں ساز سے مرجاتے ہیں
لب ہلانے نہیں پاتا وہ کہ ہم نادیدہ　　بس وہیں بات کے آغاز میں مرجاتے ہیں
توسنِ ناز کو پھینکے ہے وہ جس دم سرپٹ　　لوگ کیا کیا نہ تگ و تاز میں مرجاتے ہیں

مصحفی دشتِ بلا کا سفر آسان ہے کیا
سیکڑوں بصرہ و شیراز میں مرجاتے ہیں

229

یوں رو رو اُس گلی میں دن رات کاٹتے ہیں　　رستے میں جوں مسافر برسات کاٹتے ہیں
سیبِ ذقن پہ اُس کے جن کو نہیں رسائی　　بس دیکھ دیکھ اُس کو وہ ہات کاٹتے ہیں
کرتے ہیں زندگی کیا ہم خاک، اُس گلی میں　　نت زیرِ تیغ بیٹھے اوقات کاٹتے ہیں
ہوتا ہے جو چمن کی رونق یہ باغباناں　　آخر اُسی شجر کو ہیہات کاٹتے ہیں
اک حال ہو تو یارو اُس کا بیاں کریں ہم　　کیا کیا نہ عاشقی میں حالات کاٹتے ہیں
ہے زیرِ تیغ اپنی جوں شمع زندگانی　　سو بار سر کٹے ہے، تب رات کاٹتے ہیں

میں جن کو بات کرنا، اے مصحفی سکھایا
ہر بات میں وہ میری اب بات کاٹتے ہیں

230

یوں ہے ڈلک[1] بدن کی اُس پیرہن کی تہ میں　　سرخی بدن کی جیسے جھلکے بدن کی تہ میں
پردے کو خاک کے بھی ٹک جھانک تو تو ناداں　　اک زور انجمن ہے اس انجمن کی تہ میں
غربت میں یوں جو مجھ کو آوارہ کر کے مارا　　جائے لحد نہ تھی کیا خاکِ وطن کی تہ میں

1۔ ڈلک = بدن کی جھلک

ہر سنگ پارہ اُس کا کرتا ہے لعل پیدا خوں کس کا منجمد ہے کوہِ یمن کی تہ میں
یاروں کو ہے وصیت، جاے جوابِ نامہ تصویر اُس کی رکھ دیں میرے کفن کی تہ میں
صدقے گیا میں اس کے، نامے میں جس نے مجھ کو زلفوں کے بال بھیجے رکھ کر شکن کی تہ میں
افتادہ لاکھ حسرت پائیں میں سر بُریدہ جب غور کر کے دیکھا چاہِ ذقن کی تہ میں
ریخوں[1] سے رنگِ پاں یوں مربوط ہے کہ گویا ہے گل کی پچی کاری برگِ سمن کی تہ میں
احوالِ مصحفی پر شب شمع ایسی روئی
جو آبِ گریہ پہنچا اُس کے لگن کی تہ میں

231

بخت اُن کے جو اُسے گھر میں بلا سکتے ہیں نہ بلا سکتے ہیں ہم، اور نہ جا سکتے ہیں
حوصلہ مقتضی اِس کا نہیں، ورنہ ہم لوگ سیلِ خوں چاہیں تو آنکھوں سے بہا سکتے ہیں
اُن کی ساعد پہ تو گل دے کے ثبات ان کا نہ دیکھ ہاتھ جو شانے تلک اپنا جلا سکتے ہیں
ٹھٹھ کی ٹھٹھ[2] اتنی چلی آتی ہے یہ کاہے کو لوگ اتنے تری مجلس میں سما سکتے ہیں؟
ہے اگر عرضِ تمنا کی زباں[3] لال، تو ہو اُس کو ہم حالِ پریشاں تو دکھا سکتے ہیں
سانگ وہ بن نہیں آتا ہے کہ تو جس سے ملے یوں جو ہم چاہیں تو سو سانگ بنا سکتے ہیں
ماہ و خورشید سپر رکھ کے پھریں گو منھ پر تیغِ ابرو کا کوئی وار بچا سکتے ہیں
خواہشِ بوسہ پڑی خون ہو، دل ہی دل میں یہ سخن منھ پہ ترے ہم کوئی لا سکتے ہیں
فتنے دنیا میں اُٹھائے تھے جنھوں نے وہ لوگ سر بھی اب گور کی بالیں سے اُٹھا سکتے ہیں؟
خانۂ چرخ اگر کہنہ ہوا ہے، نہیں ڈر ہم تو آہوں کے ستوں اُس کو لگا سکتے ہیں
مصحفی اور بھی پُر درد غزل اک پڑھ کر
اب کے ہم چاہیں تو مجلس کو رُلا سکتے ہیں

1۔ ریخیں = دانتوں کے درمیان کی لکیریں 2۔ ٹھٹھ کی ٹھٹھ = کثیر مجمع (روزمرہ)
3۔ زباں لال ہونا = گونگا ہونا

232

نہ تو ہم سوزِ غمِ عشق چھپا سکتے ہیں　اور نہ جوں شمع سر اپنا ہی جلا سکتے ہیں
جی میں آتا ہے کہ اب اُن کی کروں شاگردی　بر سرِ رحم جو اُس شوخ کو لا سکتے ہیں
منھ دکھانا نہیں آتا تمھیں، ہم نے دیکھا　آپ بس آنکھ ہی روزن سے دکھا سکتے ہیں
چھوڑ دے گر ہمیں صیاد، تو ہم موسمِ گل　ستمِ رشتہ بپائی بھی اُٹھا سکتے ہیں
آگے پھر فصلِ بہار آتی ہے، یاروں کو کہو　اب سلا لیویں گریباں جو سلا سکتے ہیں
تو چھپے جا کے فلک پر تو ترے جوئندہ　نردباں[1] بامِ فلک کو بھی لگا سکتے ہیں
رات گو تھوڑی ہے، سوجائے جو وہ مستِ شراب　بختِ خوابیدہ کو ہم اب بھی جگا سکتے ہیں
ہم کو گر رخصتِ گلگشت نہیں عید کے دن　درِ زنداں پہ تو ہم دھوم مچا سکتے ہیں

مصحفی قصد کریں ہم، تو انھی قافیوں میں
پھر بھی زور آوریِ طبع دکھا سکتے ہیں

233

آپ نظروں میں اگر دل کو چُرا سکتے ہیں　ہم بھی تاڑ[2] آنکھوں میں چور اپنا بتا سکتے ہیں
ہم سے بگڑے جو کبھی رہ میں وہ بے پیچ تو ہم　باتیں سو ان کے بگڑنے کی بنا سکتے ہیں
گر تو ساون کی جھڑی باندھ دے، اے ابرِ مژہ　پھر میں دیکھوں تو بھلا کیونکے وہ جا سکتے ہیں
اُٹھ کے مجرا تجھے کرتے، پہ ترے کشتۂ ناز　بالشِ[3] تیغ سے کب سر کو اُٹھا سکتے ہیں
ہم سے گر اُن کی تواضع نہیں ہوتی کچھ اور　زیرِ شمشیر بھلا سر تو جھکا سکتے ہیں
خانۂ بازیِ طفلاں ہے یہ اپنا تن و توش　خاک میں ہم اسے اک دم میں ملا سکتے ہیں
رقصِ بسمل نہیں آتا تو ترے غرقہ بہ خوں　شفقِ شام کا عالم تو دکھا سکتے ہیں

مصحفی کرتے ہیں غیبت جو مری بعضے شخص
منھ پہ جز حرفِ خوشامد کوئی لا سکتے ہیں؟

1۔ نردبان = سیڑھی　2۔ آنکھوں میں تاڑ کر = قیافے سے　3۔ بالش = تکیہ

234

ہے، میاں صاف چمن، خانۂ ماتم تجھ بن
لگ کے ہر گل کے گلے روتی ہے شبنم تجھ بن

کر کے زخمی تو مجھے سونپ گیا غیروں کو
کون رکھے گا مرے زخم پہ مرہم تجھ بن؟

جلد آ جلد کہ اعضا میں نہیں کچھ باقی
اِن کی صحبت ہی ہوئی جاتی ہے برہم تجھ بن

اس رہائی سے تو ہم کو وہ اسیری تھی بھلی
ہیں عجب پیچ میں، اے کاکلِ پُرخم تجھ بن

بس کہ پایا نہ تجھے تعزیہ خانوں میں کہیں
ہم کو روتے ہی کٹا ماہِ محرّم تجھ بن

حالِ دل کس سے کہوں اپنا میں، اے خانہ خراب
کہ نہیں درد کا میرے کوئی محرم تجھ بن

در و دیوار کے لگ لگ کے گلے روتا ہوں
یاد کر کر میں شبِ وصل کا عالم تجھ بن

غمِ دوری سے تری غنچہ ہی پُر خون نہیں
شاہدِ گل نے بھی کھلوایا ہے سیلم تجھ بن

کوہ و صحرا میں سراسیمہ لیے پھرتا ہے
چین دیتا ہی نہیں دل مجھے اک دم تجھ بن

مصحفی ہوش میں آیا نہیں اب تک پیارے
اُس کی وحشت ہے وہی، اور وہی عالم تجھ بن

235

دھڑک دھڑک دل کرتا ہے جب اُس کے در تک جاتے ہیں
اک دیدار کی خاطر ہم بھی کیا کیا تعب اُٹھاتے ہیں

راتیں کالی جن کی خاطر جاگ جاگ میں کاٹی تھیں
روزِ سیہ کی سن کے مرے وہ گھر میں رات جگاتے[1] ہیں

کس نے ستایا ہے یہ ہم کو، جو ہم آگے ہر اک کے
منہ سے کریں ہیں غم کا بیاں، اور آنسو بہتے جاتے ہیں

آ نکلے ہے گھر وہ ہمارے جب تب ہو کر بے طاقت
اُٹھ کر اُس کے مکھڑے پر ہم آپ اسپند جلاتے ہیں

1۔ رات جگانا = رت جگا، خوشی منانا

سنتے نہیں فریاد ہماری راہ روانِ ملکِ عدم
قافلے کے پیچھے ہم اُن کے کتنے ہی چلّاتے ہیں

شمس و قمر نے دیکھ لیا کیا اُس کے گورے مکھڑے کو
کوٹھے پر دن رات پڑے جو چیل سے[1] وہ منڈلاتے ہیں

ہاتھ جلانے والوں کو اُن لوگوں سے کیا نسبت ہے
دیکھ کے تیری چھاتی کو جو چھاتی پر گُل کھاتے ہیں

دیکھیں تو کیوں کر وہ کافر در تک اپنے نہ آوے گا
اب کے ہولی میں ہم بھی بوڑھے کا سانگ بناتے ہیں

اہلِ نصیحت جتنے ہیں ہاں اُن کو سمجھا دیں یہ لوگ
میں تو ہوں سمجھا سمجھایا، مجھ کو کیا سمجھاتے ہیں

جن کی شانِ تغافل میں یاں جی ہی گئے ہیں کتنے الجھ
دیکھو ٹک بے پروائی، واں بال ہی وہ سلجھاتے ہیں

مصحفی میرا نام بھی کوئی لیوے ہے گر ان کے حضور
ہائے رے طالع کی خوبی وہ اُس سے بھی شرماتے ہیں

236

اُس نازنیں کی باتیں کیا پیاری پیاریاں ہیں
پلکیں ہیں جس کی چھریاں آنکھیں کٹاریاں ہیں

اس بات پر بھلا ہم کیوں کر نہ زہر کھاویں
ہم سے وہی رکاوٹ، غیروں سے یاریاں ہیں

ٹک صفحۂ زمیں کے خاکے پہ غور کر تُو
صانع نے اس پہ کیا کیا شکلیں اُتاریاں ہیں

دل کی تپش کا اپنی عالم ہی کچھ جدا ہے
سیماب و برق میں کب یہ بے قراریاں ہیں

ان محملوں پہ آوے مجنوں کو کیوں نہ حسرت
جن محملوں کے اندر دو دو سواریاں ہیں

جاگا ہے رات پیارے تُو کس کے گھر جو تیری
پلکیں انیندیاں ہیں، آنکھیں خماریاں ہیں

1۔ چیل سے منڈلانا (روزمرہ) = پھیرے لگانا، کاوے کاٹنا

نومید ہیں بظاہر گو وصل سے ہم اس کے دل میں تو سو طرح کی امیدواریاں ہیں

کیا پوچھتا ہے ہمدم احوال مصحفی کا
راتیں اندھیریاں اور اختر شماریاں ہیں

237

لاکھوں نزاکتوں سے بھرے ہاتھ پانو ہیں اُس رشکِ گل کے سائے دھرے ہاتھ پانو ہیں

سویا جو فرش پر میں برابر تو کیا ہوا اب تک تو میرے تجھ سے پرے ہاتھ پانو میں

لا قتل گہ میں اس کو، مری کہتی ہے قضا پہچان تو یہ کس کے ارے ہاتھ پانو ہیں

آتا ہے کس شہید سے کشتی لڑے، بتا ظالم جو تیرے خوں میں بھرے ہاتھ پانو ہیں

کاٹا ہے مارِ زلف نے کس سبزہ رنگ کے
جو ایسے مصحفی کے ہرے ہاتھ پاؤں ہیں

238

گوشۂ چشم سے جب اُس کی نگاہیں نکلیں راست چپ تھے جو کھڑے اُن سے بھی آہیں نکلیں

رفتہ رفتہ جو وہ مہ بام پر آنا سیکھا روزنِ غرفہ کھلے، سیکڑوں راہیں نکلیں

میں یہ سمجھا تھا کہ میں ہی تجھے چاہوں ہوں فقط ایک عالم کی میاں تجھ پہ تو چاہیں نکلیں

لشکرِ آہ نے جس دم علم آرائی کی باندھ صف اُس کی بھی مژگاں کی سپاہیں نکلیں

مصحفی ہو گئی بس عام گرفتاریِ دل
جب سے اِس عہد میں جالی کی کلاہیں[1] نکلیں

239

خواب میں دیکھے تھا میں، ہے اُس کا داماں ہاتھ میں
کھل گئی جو آنکھ تو پایا گریباں ہاتھ میں[2]

1۔ جالی کی کلاہیں = برقع کا وہ ڈزائن جس میں چہرے پر جالی ہوتی تھی

2۔ اصغر گونڈوی سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

کیا قیامت ہے کہ رکھتے ہی مری تربت پہ پانْو
لے اُٹھا دامن کو وہ سروِ خراماں ہاتھ میں

جزو و کل کی کچھ نہیں استاد کو رہتی خبر
لے کے جب پڑھتا ہے وہ جزوِ ''گلستاں'' ہاتھ میں

صبح تک خوابِ پریشاں ہی مجھے آئے نظر
رات تھی شانے کے وہ زلفِ پریشاں ہاتھ میں

کافری میں بھی مسلمانی نکالی واہ واہ
ڈال کر کافر نے اک تسبیحِ مرجاں ہاتھ میں

چاہیے تو یوں کہ خسرو کی جگہ شیریں رکھے
جاے دستنبو[1] ترا سیبِ زنخداں ہاتھ میں

شب جو ہولی کی ہے، مَلنے کو ترے مکھڑے سے جان
چاند اور تارے لیے پھرتے ہیں افشاں ہاتھ میں

کیا ادا سے آوے ہے دیوانہ کر کے سیرِ باغ
پھول کانوں میں، تو ہیں خارِ مغیلاں ہاتھ میں

پایۂ تختِ سلیماں کا ہے شاعر مصحفی
ہے اُسی کے خاتمِ دستِ سلیماں ہاتھ میں

240

میں کون ہوں کہ منعِ تمناے دل کروں — یوں چاہیے، الگ ہو تماشاے دل کروں
لکھنے لگوں جو نامہ اُسے، چاہیے مجھے — ووں ہی میں اس کی طرف سویداے دل کروں
قیمت کہے جو نیم نگہ دل کی، میں بھلا — تکرار اُس سے کیونکے بہ سوداے دل کروں
اپنی خوشی سے دل کو دیا ہوں میں جس کے ہاتھ — میرا یہ منھ ہے اُس سے تقاضاے دل کروں؟

1۔ دستنبو = (ہاتھ میں لے کر پھول سونگھنے کا) چھوٹا گلدستہ

ہر شب شبِ فراق میں کہتا ہوں میں یہی اُس شب بچوں تو صبح مداواے دل کروں
گر دل دیا میں اُس کے تئیں مصحفی دیا
میں وہ نہیں کہ عشق میں پرواے دل کروں

241

اوکھے[1] سے ہم جو گا ہے ڈھب پا کے بولتے ہیں تو کیا یہ زلفوں والے بل کھا کے بولتے ہیں
لگ بیٹھتا ہوں میں بھی چوکھٹ سے اُس کی کیسا جس وقت پاس در کے وہ آ کے بولتے ہیں
آہستہ بولنے کو گر میں کہوں ہوں اُن سے تو ضد سے میری دونا چلّا کے بولتے ہیں
رہتی ہے اُن کو پہروں اوروں سے ہم زبانی کچھ سامنے مرے ہی شرما کے بولتے ہیں
پیارے لگیں ہیں جی سے الفاظ اُن کے مجھ کو جس دم کہ ناز سے وہ اِٹھلا کے بولتے ہیں
سودائی سا بکے ہے کیا مصحفی تو ناداں
ہشیار، بات جی میں ٹھہرا کے بولتے ہیں

242

بلبل کا آشیانہ جس دن جلا چمن میں کہتے ہیں آتشیں تھی اُس دن ہوا چمن میں
کنجِ قفس کے قیدی کہتے ہیں یوں بہ حسرت خوش حال اُن کا جن کی آئی قضا چمن میں
چلنے کے وقت از بس کانٹوں پہ اُس کو کھینچا پھٹ پھٹ کے میرا دامن رہ رہ گیا چمن میں
سبزے کے روندنے کو جاتی ہے خلقِ عالم گر آپ بھی چلیں تو ہے اک فضا چمن میں
ہے یہ زمیں شگفتہ اے مصحفی گلوں کو
اک اور بھی غزل تو کہہ کر سنا چمن میں

243

بالوں کا رات کس کے جُوڑا کھلا چمن میں جو مشک بُو ہے اب تک موجِ ہوا چمن میں

1۔ دو گھروں کے درمیان دیوار میں چھوٹا سا روزن

شلوارِ گل بدن پر غنچوں کے بس کھلی ہے وہ دو قدم چلے تھے دامن اُٹھا چمن میں

سوندی کی بو گلوں سے آتی ہے آج مجھ کو کیا جانے کون آ کر شب رہ گیا چمن میں

کیا کیا گلوں میں باہم سرگوشیاں ہوئی ہیں کل وے گئے تھے سر سے صندل لگا چمن میں

لگ لگ گلے سے گل جو ہوتے تھے صبح رخصت شبنم کے آنسوؤں سے طوفان تھا چمن میں

باہر سے لے گیا تھا ساتھ اپنے مجھ کو وہ گل کیا ہو گیا ہے لیکن نا آشنا چمن میں

لاکھوں قفس دھرے ہیں لاگلبنوں کے نیچے صیاد کی بندھی ہے اب تو ہوا چمن میں

بلبل کہے ہے، اے گل مت چہرہ آتشیں کر باندھا ہے آشیانہ میں نے نیا چمن میں

سیرابیِ گلوں سے آتی ہے بوے وحشت پانوؤں کا کس کے پھوٹا یہ آبلا چمن میں

سیرِ چمن کی لذت کیا جانے مصحفی وہ
جس کے نہ پانو رکھتے کانٹا لگا چمن میں

244

بھرا تھا نون[1] تاروں نے مرے ہر زخم کاری میں شبِ ہجراں کٹی ہے کیا کہوں کس بے قراری میں

بہ شدت ان دنوں درباں پہ قدغن ہے تو گو ہووے سرِ رہ جا ملیں گے اس سے ہم اک دن سواری میں

رہے گنتے جو ہم تا صبح اُس کی مانگ کے موتی ہمیں تو وصل کی شب بھی کٹی اختر شماری میں

نہ دینا بادۂ پُرزور، ساقی تجھ کو کہتا ہوں نہیں، کچھ منھ سے جاوے گا نکل بے اختیاری میں

دمِ خنجر رہا ٹوٹ آخر اُس قاتل کا پہلو میں یہ پھل پایا، عزیزو ہم نے اس کی دوست داری میں

صراحی دار آنسو عاشقوں نے اُس پہ ٹانکے ہیں نہیں یہ گوکھرو گوٹے[2] کے دامن کی کناری میں

رہا ہے قافلے سے دور شاید قیسِ وامانده جو لیلیٰ سر پٹکتی جائے ہے اپنا عماری میں

دلا، نومید مت ہو وصل سے اُس کے کہ عاشق کو مزے ہیں سو طرح کے عالمِ امیدواری میں

کیا ہے گم بہت میاں مصحفی اب آپ کو تم نے
نہیں جو ساتھ ہوتے تم سواری میں شکاری میں

1۔ نون = نمک 2۔ گوکھرو اور گوٹا لباس کی سجاوٹ میں استعمال ہوتا ہے

245

دم لے ہے جو قاتل کی دیوار کے سائے میں　آخر وہیں بیٹھے ہے تلوار کے سائے میں
غش آ جو گیا ہے تو، کرتی ہے صبا پنکھا　بیٹھا تھا وہ گل اک دم گلزار کے سائے میں
خالِ تہِ زلف اُس کا یوں ہے کوئی جوں بیٹھے　خورشید کی گرمی سے جی ہار کے سائے میں
شیریں کو خبر کیا ہے فرہاد کی حالت سے　ناچے ہے وہ دیوانہ کہسار کے سائے میں
اے سروِ سہی یاں ہے جو کبک سو فتنہ ہے　چھپتا ہے وہ تیری ہی رفتار کے سائے میں
سر شیخ کا، اے یارو کیونکر نہ رہے بھاری　مدت سے یہ آیا ہے دستار کے سائے میں
یوں اشک کا قطرہ ہے زیرِ مژہ پوشیدہ　شبنم ہو جھکائے سر، جوں خار کے سائے میں
خورشیدِ قیامت جب یا رب ہو سرِ نیزہ　جا دیجو مجھے اُس دم، مختارؐ کے سائے میں

اے مصحفی گلشن تک جانا نہ ہوا ورنہ
واں جی تو میں بہلاتا اشجار کے سائے میں

246

مکھڑے پہ بال بکھرے اُس گل کے ہر سحر میں　شب باشیوں سے اُس کی ہم تو بھی بے خبر ہیں
نے خط لکھوں میں اُس کو، نے وہ جواب بھیجے　پر بند ہیں کبوتر، بے کار نامہ بر ہیں
مژگاں تک آتے آنسو رہ گئے ہیں سَو جا　کس طرح تھک نہ جاویں لڑکے یہ نو سفر ہیں
ناحق کی ہے یہ تہمت کب میں نے اُس کو چاہا　جو چاہنے کے میرے چرچے جدھر تدھر ہیں
جوں خربزے کی قاشیں، کھاتے ہیں غم کے ہاتھوں　چھریوں کی نوکوں پر یاں، نت پارۂ جگر ہیں
جلوے حباب کے سے دیتے ہیں ان میں آنسو　گویا کہ میری آنکھیں دُکانِ شیشہ گر ہیں
اک جلوہ ہے کہ جس نے بے چین کر رکھا ہے　ہر چند لاکھ جلوے پوشیدہ از نظر ہیں
جن پردگی زنوں[1] نے دیکھا نہ تھا در اپنا　وہ گردشِ فلک سے روزی کو در بدر ہیں

1۔ پردگی زن = پردہ نشین

اک اور بھی غزل اب اے مصحفی سنا دے
اس بحر کے قوافی اکثر شگفتہ تر ہیں

247

مشتاقِ سیرِ گلشن آویں نہ اب، کدھر ہیں؟ کیا کیا گل اور بوٹے اپنی بہار پر ہیں
لالے کے کھیت میں یوں حیراں کھڑے ہیں تجھ بن گویا کہ بحرِ خوں میں ہم غرق تا کمر ہیں
کس طرح ہاتھ میرا پانو تک ان کے پہنچے دیوار کے تلے میں، وے اپنے کوٹھے پر ہیں
تعویذِ بازواُن کے آنکھوں سے میں لگائے یہ جان کر کہ میرے یہ پارۂ جگر ہیں
دے کھول درِ قفس کا صیاد باد کے رخ مشتاقِ سیرِ گلشن اپنے بھی مشتِ پَر ہیں
یہ چشم ہیں کہ یارب ناسور، جن کے ہاتھوں کُہنی تک آستینیں لوہو سے تربَتر ہیں
اُس سنگ دل کے دل میں اب تک نہیں سرایت آنسو تو بے اثر تھے، نالے بھی بے اثر ہیں
چوکھٹ پہ جن کی میں نے رورو کے رات کاٹی سنتا ہوں صبح کیا وہ مہماں کسی کے گھر ہیں
آوارہ مصحفی نے دیوان کب کیا جمع
اوراق منتشر تھے سو وہ بھی اب کدھر ہیں؟

248

جو میں نے خم بہ تہِ تیغِ ناز کی گردن تو اُس نے کوٹھے سے دوں ہی دراز کی گردن
گلے میں حلقے پڑے ہنسلیوں کے تیری ہیں پھنسے نہ ان میں کسی عشق باز کی گردن
اسی پہ، آدمِ خاکی کا یہ جو پُتلا ہے غرور کا ہے سر اور حرص و آز کی گردن
مرے بھی ہاتھ حمایل تو کیجیو نقاش جو کھینچے اُس بتِ جادو طراز کی گردن
رہا تھا بیٹھ میں مدت سے سر بہ زانوے غم تری ہی تیغ نے پھر سرفراز کی گردن
یہ جی میں آوے ہے دریا میں خوب غوطے دوں پکڑ کے اُس صنمِ آب[1] باز کی گردن

1۔ آب باز = پانی سے کھیلنے والا

تو میرے سامنے بیٹھا ہے آہ تس پر بھی　　پھری ہوئی ہے تری احتراز[1] کی گردن
ملا نہ اس کا خریدار مجھ کو جب کوئی　　تری ہی تیغ کو میں نے نیاز[2] کی گردن
جو پاک ہو وہ کرے مصحفی پرستشِ عشق
جھکے ہے سجدے میں کب بے نماز کی گردن

249

میں مر گیا ٹلے مری چھاتی کی سل کہیں　　پیوند ہو زمیں کا الٰہی یہ دل کہیں
نسبت پھر اُس سے کیا مہِ داغی کو دیجیے　　سارے بدن میں جس کے نہ ہو ایک تل کہیں
بارہ[3] وفاتیں بیسویں چھڑیاں[4] ہیں سو جگہ　　اے خانماں خراب جو ملنا ہے مل کہیں
دیکھا ہے جب سے تجھ کو رہے ہے یہی خیال　　گھر لیجیے کرائے ترے متصل کہیں
بلبل تُو آشیاں تو بنا چل کے باغ میں　　واں ہم بھی آ رہیں گے ترے متصل کہیں
اے ناخنِ تصورِ ابروے یار دیکھ　　دل بن رہا ہے آبلہ، جاوے نہ چھِل کہیں
قاصد گیا ہے زور ہی باغ و بہار میں　　سروِ چمن کی طرح نہ ہو پا بہ گِل کہیں
آتے ہو آنکھیں نیچی کیے میرے سامنے　　ظاہر ہے اس سے یہ کہ ہوئے ہو خجل کہیں
میں نامِ عشق پھر جو لیا، دل نے یوں کہا　　آگے سے میرے دور ہو نامنفعل[5] کہیں
بلبل کے آشیاں کا مجھے آئے ہے خیال　　آتش چمن میں ہووے ہے جب مشتعل کہیں
کیا کیا گل اس چمن میں ہیں سرگرمِ اختلاط　　اے غنچۂ فسردۂ دل تو بھی کھِل کہیں
غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گو کہ مصحفی
جوں نقشِ پا تو اپنی جگہ سے نہ ہل کہیں

250

ہے انگوٹھی کا تری اک تو نگینا رنگیں　　تس پہ کرتا ہے ستم اور یہ مینا رنگیں

1۔ احتراز = بچنا، کنارہ کشی　2۔ نیاز کی = پیش کی　3۔ بارہ ربیع الاول (میلاد النبیؐ) کے جلسے
4۔ شاہ مدار کی چھڑیاں　5۔ نامنفعل = بے شرم، ڈھیٹ

خون کرتا پھرے ہے ماہِ محرم میں وہ طفل
ہے پڑا اُس کے گلے میں جو کلاوا رنگیں

لگ اُٹھے رشک سے پیراہنِ گل کو آتش
نظر آوے اُسے لاہی کا جو کُرتا رنگیں

جی میں آتا ہے کہ گل کھایئے آنکھوں پہ صنم
لے ترے ہاتھ سے مینے کا وہ[1] چھلا رنگیں

ہے کمر بستہ مرے خون پہ تیرا ساعد
جب سے ڈالا ہے یہ تعویذ کا ڈورا رنگیں

اے پری بامِ فلک کو بھی لگا دے آتش
اب کے پہنچوں[2] میں پہن کر کے تو جوڑا[3] رنگیں

دیکھنے جاؤں ہوں جب لالۂ خودرو کی بہار
کوسوں آتا ہے نظر دامنِ صحرا رنگیں

اشکِ گل رنگ کی کیا قدر ہو بازار کے بیچ
مول پاتا نہیں، ہوتا ہے جو ہیرا رنگیں

روز اُٹھ اُٹھ کے میاں سوئے فلک جاتا ہے
خاک سے تیرے شہیدوں کی بگولا رنگیں

تختۂ نہر میں ہے لالہ ستاں کی یہ بہار
ہووے جوں عکسِ شفق سے کبھی دریا رنگیں

دن چھپے جایئے مقتل سے مرے، تو گھر کو
کیونکہ دامن ہے میاں خون سے تیرا رنگیں

گرچہ تھی عشرتِ دہ روزہ حنائے سودہ
ہم نے اس میں نہ کیا ہاتھ بھی اپنا رنگیں

مصحفی ختم ہے تجھ پر ہی یہ اندازِ سخن
شعر اس طرح کا کوئی نہیں کہتا رنگیں

251

اوروں سے سنیں اُس بتِ عیار کی باتیں
کیں بیٹھ کے ہم سے نہ کبھی پیار کی باتیں

کرتے تھے بہم کبکِ دری کنجِ قفس میں
جوڑے ہوئے سر کو، تری رفتار کی باتیں

قابو میں تم آئے ہو مرے، وصل کی شب ہے
اب پیش نہ جاویں گی یہ انکار کی باتیں

کیوں بادِ صبا باغ کو جاتے ہوئے تو بھی
سنتی نہ گئی مرغِ گرفتار کی باتیں

سنتا ہے یہ ہر اک کی تمھارے لیے، اک دن
تم بھی تو سنو اپنے گنہگار کی باتیں

صیاد کو کیا مرغِ گرفتار خوش آیا
کرتا تھا قفس میں وہ چمن زار کی باتیں

کچھ منھ سے نہیں کہتے ہم اُس کوچے میں جس پر
ہر روز سنا کرتے ہیں دو چار کی باتیں

1۔ مینے کا چھلا = جس پر مینا کاری کی گئی ہو 2۔ پہنچوں میں = کلائی میں 3۔ جوڑا کڑوں کا

طوبیٰ کے تلے بیٹھ کے ہم لوگ کریں گے   جنت میں ترے سایۂ دیوار کی باتیں

شیریں کے ثنا خواں ہیں بہم خسرو و فرہاد
میاں مصحفی کچھ تم بھی کرو یار کی باتیں

252

جی کو کیا میں فرض کہ اُس سے جدا کروں   دل ایک ہوگیا ہو تو پھر اس کو کیا کروں

بیمار دل جدا ہے اُدھر، میں اِدھر جدا   اُس کا کروں علاج کہ اپنی دوا کروں

ظالم خدا کے واسطے تو بھی کبھی تو بول   باتوں کو مدعی کی میں کب تک سنا کروں

پہچانتے ہیں اُس کی گلی کے تو سب مجھے   کس کس سے میں ستم زدہ یارب چھپا کروں

نا نامہ بر کی واں ہے رسائی کہ میں غریب ق   لکھ لکھ کے نامہ ہاتھ اسی کے دیا کروں

نے واں سے آسکے کوئی مجھ تک کہ گاہ گاہ   اُس کی زبانی اُس کی خبر سن لیا کروں

دن رات مصحفی مجھے رہتا ہے اب یہ سوچ
ڈھونڈوں وسیلہ کس کا، کسے آشنا کروں؟

253

ہے یہ وہ درد کہ جس کا کوئی چارا ہی نہیں   واں لڑی آنکھ جہاں اپنا گزارا ہی نہیں

ہوگئے حشر بھی پر تربتِ عاشق پہ تری   آج تک آکے کوئی شخص پکارا ہی نہیں

تو پھرا ہم سے تو پھر کیونکے جییں ہم اے وائے   منھ پھرانا تو ترا ہم کو گوارا ہی نہیں

ڈھیلے پیچوں کی اُسے بالوں کے کیا سدھ جس نے   اب تلک پیچ کو پگڑی کے سنوارا ہی نہیں

دست و پا کیا کوئی جاں باختہ مارے اس میں   بحرِ الفت کا جو دیکھا تو کنارا ہی نہیں

کچھ بدآموز نے اس سے نہ لگائی ہو کہ ہائے   آج وہ آنکھ وہ چشمک وہ اشارا ہی نہیں

وعدۂ وصل زبانی ہے میں کیوں کر مانوں   ہاتھ پر ہاتھ تو اُس شوخ نے مارا ہی نہیں

جس نے کل دی تھی مجھے یادِ دُرِ گوش اُس کی   آج کی رات فلک پر وہ ستارا ہی نہیں

مصحفی کیونکے سبک بار گنوں اپنے تئیں
بارِ ہستی تو میں سر پر سے اُتارا ہی نہیں

254

اک دن ہوئی جو اس سے ملاقات راہ میں　　کرلیں میں جی کو تھام کے دو بات راہ میں
میں اُن مسافروں میں ہوں، اِس چشم تر کے ہاتھ　　گھر سے نکل کے ہو جسے برسات راہ میں
تکیہ گلی میں اُس کی بنا کر، رہا میں بیٹھ　　القصہ کٹ گئی مری اوقات راہ میں
نکلے ہے بچ کے مجھ سے کہ یہ جانتا ہے وہ　　چھیڑا کرے ہے مجھ کو یہ بذات[1] راہ میں
جس رات وعدہ اس نے سرِ راہ کا دیا　　بیٹھا رہا میں صبح تک اُس رات راہ میں
جی جس کو چاہتا تھا اُسی سے ملا دیا　　دل کی کشش نے کی یہ کرامات راہ میں
میں بھی لپٹ کے اُس کے لیے بوسے خوب سے　　اک رات بن گئی جو مری گھات راہ میں
بازاری اُس کے کیونکے نہ پیچھے پڑیں کہ وہ　　کرتا گیا ہر اک سے اشارات راہ میں
پھر پھر کے پیچھے دیکھ مجھے اُس نے یوں کہا　　اتنا بھی لگ نہ چل تو مرے سات[2] راہ میں
آخر تو ہم چلیں گے چمن تک تمھارے ساتھ　　بوسہ تو کوئی کیجے عنایات راہ میں

مت کر سفر تو عشق کی وادی کا مصحفی
دیکھے گا ورنہ سیکڑوں آفات راہ میں

255

نے اُنس کے خواہاں ہیں، نے پیار کے بھوکے ہیں　　ہم لوگ ہیں بازاری، دیدار کے بھوکے ہیں
اک زخم میں عاشق کو جو سیر کرے جاں سے　　ہم لوگ بھی اُس کی ہی تلوار کے بھوکے ہیں
کھانے کو ہوا ہم کو گلزار میں آنے دے　　اے صاحبِ گلشن ہم گلزار کے بھوکے ہیں
دیوار میں جس گھر کی ہوں چاروں طرف رخنے　　ہم گرسنہ چشم[3] ایسی دیوار کے بھوکے ہیں

1۔ بذات = بدذات (عوامی)　2۔ سات = ساتھ (عوامی)
3۔ گرسنہ چشم = جس کی آنکھیں کچھ دیکھنے کو ترستی ہوں

لیلیٰ کا جو ناقہ ہے کھاتا ہے وہ پتّے ہی ہر چند کہ یہ ناقے سب خار کے بھوکے ہیں
ٹک کوہ کے دامن میں اے سروِ خراماں چل واں کبکِ دری تیری رفتار کے بھوکے ہیں

اے مصحفی مودی کو لوں ٹوک تو وہ مجھ سے
کہتا ہے کہ ہاتھی بھی سرکار کے بھوکے ہیں

256

آتشِ غم میں نہ کچھ میں ہی جلا جاتا ہوں دل بھی سینے میں کہے ہے کہ پھُنکا جاتا ہوں
کل جو آیا تھا ترے گھر سے عیادت کو مری آج اُس شخص کی میں لینے دوا جاتا ہوں
میری برگشتہ نصیبی پہ نظر کیجو کوئی اس کے کوچے تلک آکر میں پھرا جاتا ہوں
دل کی بیتابی سے حالت ہے یہ میری اِس سال کہ قفس کو بھی لیے ساتھ اُڑا جاتا ہوں
کل بھی اس بات پہ کھائے تھے طمانچے میں نے آج اُس کوچے سے پھر رو بہ قفا[1] جاتا ہوں
سیکڑوں ہوتے ہیں سیراب تری تیغ سے ہائے اور میں تشنۂ یک زخم رہا جاتا ہوں
لاغری دیکھ کر اپنی میں مہِ نو کی طرح ناتواں بینیِ مردم سے چھپا جاتا ہوں
دستگیری نہیں کرتی ہے مری اُس کی تیغ اور میں خون کے دریا میں بہا جاتا ہوں
دل جو گھبرائے ہے میرا تو میں وحشت کے سبب اُٹھ کے کوسوں ہی بیاباں کو چلا جاتا ہوں
فائدہ اور گر اس کوچے میں آنے کا نہیں نقشِ پا سے ترے آنکھیں تو لگا جاتا ہوں

کچھ میں شاعر نہیں اے مصحفی ہوں مرثیہ خواں
سوز پڑھ پڑھ کے محبوں کو رُلا جاتا ہوں

257

چاہنے والے ترے، میرے سوا اور بھی ہیں میں نہیں ایک گرفتارِ بلا، اور بھی ہیں
جیسے گل تو نے دیے تھے مجھے لاکر، ویسے پھول اُس باغ میں، اے بادِ صبا اور بھی ہیں؟
میں ہی جوں لالہ نہیں داغ بدل ہوں تجھ بن کشتہ و سوختۂ رنگِ حنا اور بھی ہیں

1۔ رو بقفا = اُلٹا پھر کر، اُلٹے پانو

خواہشِ وصل کروں اُس سے تو چتون میں کہے یاں اِسی درد کے جویائے دوا اور بھی ہیں
بوسہ مجلس میں لیا تھا جو ترا، تو ہی نہیں مجھ سے اِس بات پہ دو چار خفا اور بھی ہیں
کر چکے قتلِ اسیراں وہ تو غمزے نے کہا ابھی زنداں میں کئی حلقہ بہ پا اور بھی ہیں
مصحفی گوہرِ اشک اپنا جو بھیجوں اُس پاس
تو وہ خوش ہو کے کہے مجھ سے: لے آ اور بھی ہیں؟

258

اشک جس وقت کہ مژگاں پہ رواں ہوتے ہیں دل کے جوہر مری آنکھوں سے عیاں ہوتے ہیں
کیا ہوا، دے[1] میں جو سودازدگاں پیر ہوئے جب بہار آتی ہے یہ لوگ جواں ہوتے ہیں
شور و شر ہے جو ترے کوچے میں دیوانوں کا حشر کے روز یہ ہنگامے کہاں ہوتے ہیں
چاند سے جن کے چمکتے ہوئے چہرے ہیں یہ لوگ کیونکے اس خاک کے پردے میں نہاں ہوتے ہیں
کشورِ عشق کی کیا رسم ہے الٹی کہ یہاں باغ سرسبز در ایامِ خزاں ہوتے ہیں
تو وہاں غیر سے ہم خوابہ ہے، اور ہجر کی شب صدمے کیا کیا نہ مری جان پہ یاں ہوتے ہیں
قتل گو مجھ کو کیا، لیک ذرا غور تو کر شہر میں کیا ترے اوصاف بیاں ہوتے ہیں
مت مجاذیب[2] سے لگ چل، کہ یہ ہے حضرتِ ہند یاں کے عریاں بدناں سیف زباں[3] ہوتے ہیں
مصحفی فکر نہ کر اپنے تو مٹ جانے کا
لاکھ صورت کے محبت میں زیاں ہوتے ہیں

259

ہیں گلے اُس کے میں چاندی کی کئی زنجیریں ان دنوں اُس نے گھڑائی[4] ہیں نئی زنجیریں
پائے لیلیٰ میں جو خلخالِ طلا ہووے تو کیا یہ پری پانو کہاں اور یہ بڑی زنجیریں
اس قدر دعویِ رفتار، تو بس چل نکلا تیرے پانو میں پڑیں کبکِ دری زنجیریں

1۔ دَے = خزاں کا مہینا 2۔ مجاذیب = مجذوب کی جمع 3۔ سیف زباں = جن کی زبان سے جو نکل جائے وہ ظہور میں آ جائے 4۔ گھڑائی ہیں = گھڑوائی ہیں (عوامی)

یہ جو وحشی سے کئی ہیں ترے زنداں میں اسیر
سَیر ہووے جو تُڑوا جائیں سبھی زنجیریں

اُس کے ساعد کے گلو گیر ہی رہتے ہیں سدا
کبھی توڑے، کبھی تعویذ، کبھی زنجیریں

تیرے دیوانہ گیسو کے لیے، فصلِ بہار
جس طرف دیکھیے، جاتی ہیں گھڑی زنجیریں

جب دوانے کی ترے لاش بہی دریا میں
کیسی لہروں کی گئیں ساتھ لگی زنجیریں

مصحفی کب میں گرفتاری سے آزاد ہوا
وہی طوق اور وہی غل [1] اور وہی زنجیریں

260

ہے مئے گلگوں کی تیرے یہ گلابی ہاتھ میں
یا دلِ پُرخوں ہے میرا، اے شرابی ہاتھ میں

دیکھنے کو جلوہ تیرے حسن کا، شب آسماں
ماہ سے رکھتا ہے روشن ماہتابی ہاتھ میں

جو نکل آیا وہ مہ گھر سے بوقتِ نیمروز
مہرِ تاباں لے کے دوڑا آفتابی ہاتھ میں

آستیں اُس نے جو کہنی تک چڑھائی وقتِ صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

وائے ناکامی کہ دیوے سستیِ طالع چھڑا
دامن اس کا آئے گر با صد خرابی ہاتھ میں

کس کی دعوت تھی فلک پر رات، میں حیران ہوں
ماہ کے اب تک ہے فرنی [2] کی رکابی ہاتھ میں

لگتے ہیں لختِ جگر سے یوں یہ مژگاں چشم پر
جوں کبابوں کی رکھیں سیخیں کبابی ہاتھ میں

آئنے سے کیوں کے منھ موڑے ابھی وہ مصحفی
حسن کی اُس کے ہے فردِ انتخابی ہاتھ میں

261

سیرِ گلشن کو جو مانندِ صبا جاتا ہوں
دیکھ کر گل کی نزاکت کو موا جاتا ہوں

جا ملے اپنے رفیقوں سے جو تھے گرم رواں [3]
میں ہی اک قافلے کے پیچھے رہا جاتا ہوں

تیرہ بختی کا برا ہووے کہ جس کے باعث
مثلِ خورشید میں بدلی میں چھپا جاتا ہوں

1۔ غل = لوہے کا طوق، پٹا 2۔ فرنی = کھیر 3۔ گرم رَو = تیز چلنے والے

اُس طرف سے تو لگاوٹ کی نہیں ایک بھی بات　　نہیں معلوم کہ پھر کیوں میں لگا جاتا ہوں
صبح کے وقت میں در پر ترے کر کے نالے　　تجھ کو کیا، سارے محلے کو جگا جاتا ہوں
کیا خبر ہے مجھے واماندوں پہ واں کیا گزری　　میں تو یاں قافلے کے بیچ چلا جاتا ہوں
باغباں کام ہے کیا مجھ کو ترے گلشن سے　　پھرتے پھرتے کبھی ادھر بھی میں آجاتا ہوں
تیری رفتار سے کہتا ہے یہی کبکِ دری　　اِس طرف دیکھ میں مانی میں ملا جاتا ہوں

مصحفی گر دلِ سامع نہ رُکے مجھ سے تو یار
اس سے بہتر غزل اک اور سنا جاتا ہوں

262

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں　　کچھ اِس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں
کوچے سے نکل کر میں ترے نالہ کروں گا　　معلوم ہوا اب مجھے، تاثیر نہیں یاں
جس روز سے جوں خامہ زباں اپنی میں کاٹی　　اُس روز سے تحریر ہے، تقریر نہیں یاں
سودائے جنوں نے مجھے آ دشت میں گھیرا　　افسوس ہے اس وقت میں زنجیر نہیں یاں
بیٹھا ہوں میں خوش محفلِ عریاں بدنوں میں　　صد شکر گریبان تو گلو گیر نہیں یاں
ہم جاویں جو ہر روز گھر اُس کے تو سناوے　　کیوں آتے ہو؟ کچھ آپ کی جاگیر نہیں یاں
معمورۂ دل میں جو ہوا کل گزر اس کا　　یوں دیکھ کے بولا کہ وہ تعمیر نہیں یاں
یہ کس کے لیے آپ نے تلوار سجی ہے　　ایسا تو کوئی قابلِ تعزیر نہیں یاں
مانی کو میں نقشا تو ذرا اس کا دکھاتا　　افسوس کہ اس دم تری تصویر نہیں یاں

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا
سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

263

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کفِ پا کا لے لوں　　رنگ ہونٹوں پہ تری تازہ حنا کا لے لوں

قتل کرنے میں مرے اتنی شتابی کیا ہے ٹھہرا اے بت میں ذرا نام خدا کا لے لوں
میں دعا عرش پہ بھیجوں ہوں بہ امیدِ قبول نالہ چاہے ہے اثر میں ہی دعا کا لے لوں
ضعف اتنا ہے کہ پہنچوں نہ میں گلزار تلک ہاتھ میں ہاتھ نہ تا بادِ صبا کا لے لوں
اشک آوارہ کی گر ٹک بھی مدد ہووے تو میں ملک قبضے میں سب اس ارض و سما کا لے لوں
مصحفی میری تمنا ہے یہی اب تو سدا ق کہ خواصی[1] کو جو عہدہ امرا کا لے لوں
تختِ طاؤس پہ جس دم ہو سلیماں کا جلوس مورچھل ہاتھ میں میں بالِ ہما کا لے لوں

264

صورتِ بت سے دکھاتی ہے پری پتھر میں صنعِ حق کرتی ہے جب جلوہ گری پتھر میں
تیشہ فرہاد نے مارا تھا جہاں سر پہ، وہاں اب تلک پاتے ہیں لوہو کی تری پتھر میں
قدر و قیمت کو جلائے وطن اے دوست ہے شرط مول پاوے نہ عقیقِ جگری پتھر میں
صبح خیزانِ شبِ غم سے تڑپنا، غافل کام کرتی ہے دعائے سحری پتھر میں
شہرہ اُس تک جو تری سنگ دلی کا پہنچا رگِ خارا نے بھی اک آہ بھری پتھر میں
کھینچ لیتا ہے جو آہن کے تئیں مقناطیس کششِ دل کی ہے تاثیر ذری پتھر میں
مصحفی دیکھ، کہ کہتی ہے یہی جستِ شرر
حسن وہ شے ہے کرے پردہ دری پتھر میں

265

گِل کا پُتلا قضا کے ہاتھ میں ہوں ہوں، پر امرِ خدا کے ہاتھ میں ہوں
وہ ہی واقف ہے میری کِل کِل سے سچ عجب آشنا کے ہاتھ میں، ہوں
ہوں تو گٹھری پوَن کی مثلِ حباب لیکن آب و ہوا کے ہاتھ میں ہوں
کوزہ ہوں آبِ صاف کا لیکن ڈر ہے اتنا، فنا کے ہاتھ میں ہوں
ہوں میں رنگِ حنا کا طائر لیک کوئی رنگِ حنا کے ہاتھ میں ہوں؟

1۔ خواصی = بادشاہ کے ذاتی خدمت گار خواص کہلاتے تھے

حامل اِس خاک کی ہے اور ہوا　نہ نسیمِ و صبا کے ہاتھ میں ہوں
اک طرف ابتدا ہے تھامے مجھے　ق　اک طرف انتہا کے ہاتھ میں ہوں
اِسی صورت سے ہو کے جسمِ عریض　انتہا، ابتدا کے ہاتھ میں ہوں
ہوں اجابت تو مصحفی، پر میں
صبح دم کی دعا کے ہاتھ میں ہوں

266

سو ڈھنگ ہیں چوری کے تری چشمِ سیہ میں　لیتا ہے، چُرا دل کو تو عاشق کے نگہ میں
ہرچند کہ تقویٰ تو بڑی چیز ہے زاہد　پر کیا کہوں میں تجھ سے، جو لذت ہے گنہ میں
وہ ماہ، کہ دلدادۂ صورت ہوں میں جس کا　برقع کو لپیٹے کبھی مل جائے ہے رہ میں
ڈرتا ہوں کہ اُودھر کو اکیلا یہ گیا ہے　گھِر جائے نہ دل ناز و کرشمہ کی سپہ میں
وہ مہ نظر آتا جو نہیں مجھ کو، تو ہے ہے　بیتابیِ دل ہوتی ہے دونی شب مہ میں
خورشید لگایا ہے میاں کر کے مقرض　سنجاف[1] تمامی کی نہیں تیری کلہ میں
مرغِ دلِ بسمل پہ تو ٹھوکر نہ لگانا　آیا ہے تڑپ کر ترے دامن کی پنہ[2] میں
تالب سے نہ لوں تیرے میاں سیکڑوں بوسے　اپنی تو تسلی نہ ہو پنج و شش و دہ میں
اس سوچ کا دیوانہ ہوں تیری میں کہ تجھ کو　اب تک ہے تأمل مرے احوالِ تبہ میں
ان قافیوں کا اور ہوا مصحفی رتبہ
جب میں یہ غزل جا کے پڑھی مجلسِ شہ میں

267

کون سی شکل ہے دِس جس کے خریدار نہیں　عاشق کے کوئی یاں اب تو سزاوار نہیں
جو ملے غیر سے، اور ہم سے بھی گرمی رکھے　ایسی گرمی ہمیں واللہ کہ درکار نہیں

1۔ سنجاف تمامی کی = لچکا　2۔ پنہ = پناہ کا مخفف (جیسے نگاہ کا نگہ)

کہیو لیلیٰ سے صبا، دشت میں مجنوں کو ترے
سایۂ بید کم از سایۂ دیوار نہیں

تیری زلفوں کے تصور میں جو رہتا ہوں مدام
کون سی شب ہے کہ مجھ پروہ شبِ تار نہیں

رخنۂ دل سے تجھے جھانکیں ہیں ہم گھر بیٹھے
خانۂ غیر میں گو رخنۂ دیوار نہیں

لیٹ کر آنکھیں وہ موندے ہے تو میں بھی اُس دم
سادگی دیکھ، کہ سمجھوں ہوں یہ بیدار نہیں

اُٹھے لذت بھی، اگر دیجیے بیداری میں
خواب میں بوسہ تو لینا مجھے درکار نہیں

مجھ کو کیا کام کہ اِس کوچے میں جاؤں اے دل
تُو گرفتار ہے، کچھ میں تو گرفتار نہیں

سو شکایت ہیں مرے دل میں بھری تجھ سے میاں
پر کروں کیا کہ کوئی قابلِ اظہار نہیں

مصحفی حسن کو یاں زر کی ہے دل سے چاہت
خوبرو کیونکے ملیں مجھ سے، میں زردار نہیں

268

کون ہے وہ جو تری چشم کا بیمار نہیں
کون ہے وہ کہ ترا رفتۂ رفتار نہیں

محشر و وعدۂ دیدار کی کہہ اور سے شیخ
روزِ محشر بھی میاں وعدۂ دیدار نہیں

رشتۂ ہستیِ موہوم کا یہ طولِ امل
مجھ سے پوچھو تو کم از رشتۂ زنار نہیں

پھول سب جھونک میں دامن کی بجھے جاتے ہیں
باغباں قہر خدا کا ہے یہ رفتار نہیں

سب طرح سے دلِ بیمار ہے جن کا اُس کو
اک سوا تیرے نہ ملنے کے کچھ آزار نہیں

گرم ہے نالہ کشی پر جو نوا سنجِ چمن
کون سا دم ہے کہ شعلہ سرِ منقار نہیں

خاکِ تودہ میں مرے دل کے، کماں ابرو، ہائے
کون سا تیرِ ستم تا لبِ سوفار نہیں

کچھ کہا چاہیں ہیں ہم تم سے پہ کیا خاک کہیں
مدعا اپنا جو ہے قابلِ اظہار نہیں

جلد لے مصحفی اپنے کی خبر، ورنہ میاں
دیر کی تو نے جو ٹک بھی، تو یہ بیمار نہیں

269

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن
نے موے پری ایسے، نہ یہ حور کی گردن

ساعد میں نہ مچھلی تھی تری، بلکہ نہاں تھی وہ ہاتھ میں ماہیِ سقنقور[1] کی گردن

یوں مرغِ دل اُس زلف کے پھندے میں پھنسا ہے جوں رشتۂ صیّاد میں عصفور[2] گردن

دل کیونکے تری جعد کا پھر اس پہ نہ پھسلے صانع نے بنائی تری بلّور کی گردن

اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی، مزہ ہے اور دوسرے میں ساقیِ مخمور کی گردن

ہر چند میں جھک جھک کے کیے سیکڑوں مجرے پر خم نہ ہوئی اُس بتِ مغرور کی گردن

کیا جانیے کیا حال ہوا صبح کو اُس کا ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

یوں زلف کے حلقوں میں پھنسا مصحفی اے وائے
جوں طوق میں ہووے کسی مجبور کی گردن

270

صیّاد دبا رکھے ہے جوں چیل کی گردن اک مور مسل ڈالے ہے یاں پیل کی گردن

قوّت کا یداللہ[3] کی میں قائل ہوں جو دم میں ڈالے ہے وہیں توڑ گراں ڈیل[4] کی گردن

جوں شمع گریباں سے میں تب سر کو نکالا جب سوزِ جگر نے مرے تحلیل کی گردن

دعوے پہ فضیلت کے کوئی اپنی نہ جاوے یاں تیغ تلے ہے سرِ تفضیل کی گردن

گردن کو تری شمع سے دوں کیونکے میں نسبت یعنی یہ نہیں شمع کی تمثیل کی گردن

یوں خصم بھی خم ہوتے ہیں مجھ سے بہ تأمّل جوں سجدۂ آدم میں عزازیل کی گردن

اپنی تو تری تیغِ سیہ تاب سے قاتل شرمندہ نہیں ایک خطِ نیل کی گردن

کیا بارِ عبادت کو اُٹھاوے گا وہ زاہد ہے آپ ہی شاکی ترے مندیل کی گردن

اے مصحفی ہے تیری طبیعت کا وہ کعبہ ق جس کعبے میں سرکش ہے ابابیل[5] کی گردن

1۔ ماہی سقنقور = ریگ ماہی، سوسمار (Skink) 2۔ عصفور = چڑیا 3۔ یدُ اللہ = حضرت علی بن ابی طالبؓ 4۔ گراں ڈیل = بھاری بھرکم جسم والا (روزمرہ) 5۔ ابابیل عربی میں صرف جُھنڈ کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم کی سورۃ الفیل میں طیراً ابابیل آیا ہے اِس کا مطلب ہے پرندوں کے جُھنڈ۔ مگر اب ایک خاص پرندے کو ابابیل کہنے لگے جو جُھنڈ بنا کر رہتے ہیں

کچھ اس کا تعجب نہیں گر حکمِ خدا سے غربال[1] ہو یاں فیل کا سر، فیل کی گردن

271

کل زیبِ سناں تھی ترے محبوس کی گردن آج اُس پہ ہلاتے ہیں سب افسوس کی گردن

یہ رنگِ سیہ تاب ہے اُس تیغ کا جس کے قبضے پہ فدا کیجیے طاؤس کی گردن

گردن کے بل اس کُو میں گرا کٹ کے مراسر مشتاق تھی از بس کہ زمیں بوس کی گردن

یوں قبضۂ چوبیں ہے صفاہانی[2] پر اُس کی جوں رود[3] سے نکلے ہے کبھی سوس[4] کی گردن

سرکش کوئی تلوار سے ڈرتے ہیں، نہ ہووے گل گیر سے خم شعلۂ فانوس کی گردن

ڈرتا ہوں کہ آہن کا ہے طوق اُس کے گلے میں لاوے نہ کبودی[5] ترے محبوس کی گردن

دیکھوں تو میں کب تک مری آنکھوں سے رہے گی چولی میں چھپی عشق کے ناموس کی گردن

آنگن میں پلنگ اپنا نہ بچھوا تو، مبادا دیوار سے نکلے کسی جاسوس کی گردن

لڑکا وہ نہ ہوتا تو کوئی اُس کی گلی میں یوں کھیلتی پھرتی مرے جاسوس کی گردن

جوں مرغ کا لڑتے میں نکل جائے ہے لوٹن[6] رکھتی ہے یہ دھج حاسدِ مایوس کی گردن

افسوس بہ دربارِ سلیمانِ فلک قدر محروم ہو سجدے سے شہِ روس کی گردن

اِس در کا وہ رتبہ ہے جہاں رگڑے ہے ماتھا وجدان میں آ کر سرِ کاؤس[7] کی گردن

تلوار نکالے جو وہ ہیجا[8] میں کمر سے باریک تر از مو ہو، شہِ طوس[9] کی گردن

اے مصحفی دعویٰ ہے جہاں گیری کا تجھ کو
چل باندھ بھی لے صاحبِ قاموس[10] کی گردن

1۔ غربال = چھلنی 2۔ صفاہانی = تلوار 3۔ رود = دریا 4۔ سُوس = ناکا

5۔ کبودی = نیلاہٹ 6۔ لوٹن = (مرغبازی کی اصطلاح) اکڑ 7۔ کاؤس (کیکاوس) بادشاہ کا نام

8۔ ہیجا = جنگ 9۔ طوس = ایران کا قدیم شہر، مشہد کے نزدیک

10۔ قاموس، عربی زبان کی مشہور لغت القاموس المحیط جس کا مؤلف محمد بن یعقوب بن ابراہیم فیروز آبادی شیرازی متوفی 20رشوال 817ھ/1414ء ہے۔[معجم المولفین 118/12]

272

یہ کہوں کیوں کے ملاقات کا مقدور نہیں
دل پھنساواں کہ جہاں بات کا مقدور نہیں

تجھ سے ملنے کو مرے کیونکے چھڑادیوے رقیب
وہ تو کیا ہے، کسی بد ذات کا مقدور نہیں

جھوٹ کیوں بولتے ہو مجھ سے کہ فرصت کم ہے
آؤ تو کیا، تمھیں اک رات کا مقدور نہیں

ایسی مجلس میں گزر اپنا ہوا ہے کہ جہاں
بات تو کیا کہ اشارات کا مقدور نہیں

کیا قیامت ہے کہ وہ سامنے بیٹھا ہے مرے
اور مجھے حرف و حکایات کا مقدور نہیں

آفتیں اور جو چاہے تو فلک ہم پر بھیج
پر ہمیں عشق کی آفات کا مقدور نہیں

نذر کر جان ہی اک دن تو انھیں تحفے طریق
مصحفی گر تجھے سوغات کا مقدور نہیں

273

آہ اس ساتھ کہاں بیٹھ کے دو بات کروں
اتنی جا ہو کہ جہاں بیٹھ کے دو بات کروں

بس اسی بات میں ہو جائے ہے وہ مجھ سے خفا
غیر کے پاس جہاں بیٹھ کے دو بات کروں

مدعی مشورۂ وصل ہی سمجھیں اُس کو
گر کسی سے میں یہاں بیٹھ کے دو بات کروں

ہووے گلگشت سے فرصت، تو روش پر کوئی دم
میں بھی، اے غنچہ دہاں بیٹھ کے دو بات کروں

اُس سے ملنے کا ہے اے مصحفی مقدور کہاں
یوں اگر چاہوں تو ہاں بیٹھ کے دو بات کروں

274

اے آں کہ معارض ہو مری تیغِ زباں سے ق تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن
ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک سے پُتلا
گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن

میں لفظِ سقنقور[1] مجرّد نہیں دیکھا
ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

1۔ سقنقور= ریگ ماہی (جسے یونانی دواؤں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے) انگریزی میں Skink

لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں — کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن؟

گردن کہ صراحی کے لیے وضع ہے ناداں — بے جا ہے خُمِ بادۂ انگور کی گردن

اس سے بھی میں گزرا، غلطی اور یہ سنیے — باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن؟

کافور سے مطلب ہے مرا اُس کی سفیدی — ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن

کافور تو میّت کا اُسے سمجھے یہ ایں عقل — اور آپ جو پھر باندھے تو مغفور کی گردن

یہ لفظ مشدّد ہی درست آیا ہے، تجھ سے — خم ہوتی ہے کوئی مری بلّور کی گردن

اتنی نہ تمیز آئی تجھے، ربط بھی کچھ ہے؟ — ہر قافیے میں تو نے جو منظور کی گردن

یوں سیکڑوں گردن تو گیا باندھ، پہ اے وائے — سوجھی نہ تجھے حیف کہ مزدور کی گردن

جو گردنیں میں باندھی ہیں، لا تجھ کو دکھا دوں — تو مجھ کو دکھا دے شبِ دیجور کی گردن

گردن کے تئیں چاہیے اک شکل کشیدہ — خم کر کے سمجھ ٹک سرِ مغرور کی گردن

مضمون وہ میرا ہی ہے، گو اور طرح سے — باندھے تو گماں اپنے میں رنجور کی گردن

گر قافیہ پیائی ہی منظور تھی تجھ کو — تو باندھی نہ کس واسطے مقدور کی گردن؟

لاکھوں ہی معانی کو کیا قتل پر افسوس — سوجھی نہ تجھے دستۂ ساطور[1] کی گردن

منصف ہو تو پھر نام نہ لے دعوے کا ہرگز — یہ بوجھ اُٹھا سکتی نہیں مور کی گردن

منظور ہے گر نیش زنی تجھ کو، تو باللہ — باندھے نہ گر اب خانۂ زنبور کی گردن

ٹوٹے ہوئے نَیچے کی طرح میرے قلم سے — جاتی ہے پچک شاعرِ مغرور کی گردن

انصاف تو کر آپ بھی کہ اک تیغ میں کیسی — میں کاٹ کے دعوے کی ترے دور کی گردن

کھڑاگ[2] یہ گایا پہ ترے ہاتھ نہ آئی — افسوس کہ اِس تان پہ طنبور کی گردن

سوجھا نہ تجھے ورنہ بتاتا تو اُسی دم — ناسور[3] کی بتّی کو بھی ناسور کی گردن

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے — جھکتی ہے جہاں مار کی اور مور کی گردن

1۔ ساطور = قصاب کی بڑی چُھری (Chopper) 2۔ کھڑاگ = بے تکا بھونڈا

3۔ ناسور کی بتّی = بتّی جس میں دوا لگا کر ناسور میں رکھا جائے

وہ شاہِ سلیماں کہ اگر تیغِ عدالت　ٹک کھینچے تو دو ہو، ڈ ہیں فغفور کی گردن
جس سر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دستِ نوازش　اُس سر کے لیے تکیہ ہو پھر حور کی گردن
اِس در کا جو سجدہ انھیں منظور نہ ہوتا　ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی گردن
اے مصحفی خامش یہ سخن طول نہ کھنچ جائے
یاں کوتہ ہی بہتر سرِ پُر شور کی گردن

275

ملگجے کپڑوں میں دُونا نظر آتا ہے وہ حسن　ماہ کو ابرِ غباری میں چھپاتا ہے وہ حسن
کاش ابھی کپڑے نہ بدلے وہ پری چہرہ صنم　کیونکہ کچھ مجھ کو انھی کپڑوں میں بھاتا ہے وہ حسن
خس کو اس طرح سے کب کاہ رُبا کھینچے ہے　جیسے دل کو مرے کھینچے لیے جاتا ہے وہ حسن
شعلۂ شمع سے جس طرح کہ ہو گریۂ شمع　اپنی گرمی کو دکھا مجھ کو رُلاتا ہے وہ حسن
کون سے رنگ کی اب اُس کے میں تعریف کروں　آہ سو رنگ سے کچھ جی کو جلاتا ہے وہ حسن
میں یہ حیراں ہوں کہ ہے مجھ سے ہی کیا لاگ اُسے　سیلِ خوں کیوں مری آنکھوں سے بہاتا ہے وہ حسن
مثلِ آئینہ صفا ہوتی ہے اور اُس کی دو چند　آپ کو جوں جوں کدورت میں چھپاتا ہے وہ حسن
سوگ کپڑے نہ بدلنے کا تو کافر کے نہ پوچھ　خاک میں آپ کو کیا، ہم کو ملاتا ہے وہ حسن
زردیِ رنگ دکھا تیرگیِ بخت کے ساتھ　ہم سیہ بختوں کو بیمار بناتا ہے وہ حسن
خواب میں بھیس بدل آئے ہے سو سو ڈھب سے　خاکساری پہ مری زہر جو کھاتا ہے وہ حسن
تیلیا کپڑے نہیں، کچھ یہ خدا کا ہے غضب　جس سے عالم کے تئیں آگ لگاتا ہے وہ حسن
مصحفی سامنے آنکھوں کے ہے تصویر اُس کی
ان دنوں مجھ کو اسی طرح ستاتا ہے وہ حسن

276

بیٹھا ہوں بے قرار سرِ رہ، سنبھل کہیں　کافر خدا کے واسطے گھر سے نکل کہیں

مطلب یہ اپنے کیونکے صنم تجھ کو پایئے وعدہ ہے تیرا آج کہیں اور کل کہیں
یہ جو فقط رہی ہے ملاقات راہ کی ایسا نہ ہو کہ اس میں بھی آوے خلل کہیں
سمجھا ٹک اپنی زلف اور ابرو کو، کیا حصول کرتے پھریں مڑوڑ کہیں اور بَل کہیں
دیکھ آویں ٹک بہار میں دامانِ کوہ و دشت جوشِ جنوں کہے ہے یہی مجھ کو چل کہیں
معمول ہو محبتِ عالم میں بے قرار دیکھا نہ ہم نے آج تک ایسا عمل کہیں
تو اس کے آگے بولے ہے لکنت سے مصحفی
ڈرتا ہوں تیری بات نہ ہو چل[1] بچل کہیں

277

کھلی دیکھیں کبھی جو نرگسِ شہلا کی واں کلیاں
غزالوں نے مری تربت سے آ کر انکھڑیاں ملیاں
تلاشِ قیس میں لیلیٰ نکل کر گھر سے یوں بولی
گیا شاید وہ صحرا کو جو سونی لگتی ہیں گلیاں
کہیں کیا اب تلک صدمہ ہے دل پر جی ہی جانے ہے
اُٹھائی ہیں شبِ فرقت میں جو جو ہم نے بے کلیاں
کہوں کیا میں ذرا پریوں کا جھنڈ ان کو ملکتا تھا
کنہیا کی طلب میں گوالنیں مدھ بن کو جب چلیاں
گئے ہیں کوٹ[2] کھائی پھاند ہم دشتِ محبت میں
غرض مشہور ہیں مجنوں صفت اپنی بھی پابلیاں[3]
تڑپ بجلی کی یا چھٹنا قلم[4] کا اس کو کب پہنچے
جو ہیں نالے میں بیتابِ شبِ ہجراں کی اچپلیاں

1۔ چل بچل = بےٹھکانے، پراگندہ (روزمرہ) 2۔ کوٹ کھائی = کوبڑ کھابڑ علاقہ
3۔ پابلیاں = تیز قدمی، اچپلاہٹ 4۔ قلم = نری (آتشبازی) 5۔ اُچپلیاں = شوخیاں، اُچھل کود

شب ایسی شمع کے شعلے نے مجلس میں شرارت کی
کہ پروانے ہوئے راکھ اور فانوسیں کئی جلیاں

میں اب تک مصحفی لختِ جگر آنکھوں سے روتا ہوں
شب اُس نے خواب میں دی تھیں سپاری کی کئی ڈلیاں

278

تم خفا ہم سے بہت تھے یہ خبر کرتے ہیں — لو مبارک ہو تمھیں، ہم بھی سفر کرتے ہیں
دست و پا کانپنے لگتے ہیں ہمارے کیسے — ڈرتے ڈرتے جو ہم اس کُو میں گزر کرتے ہیں
جی دھڑکتا ہے کہ کیا جانے نکل آوے کون — چوری چوری جو کبھی، جا پسِ در کرتے ہیں
گھر سے اپنے جسے کل تم نے نکالا تھا میاں — آج ہمسائے اُسے شہر بدر کرتے ہیں
یوں تو کس طرح تو قابو میں ہمارے آوے — فرصتِ وقت پہ ہم لوگ نظر کرتے ہیں
روزِ فرقت کو کبھی لاویں ہیں رو رو کے بہ شام — گہ شبِ ہجر کو مر پچ[1] کے سحر کرتے ہیں
پوچھتا کیا ہے تو احوال ہمارا ہمدم — الغرض جیتے ہیں، اوقات بسر کرتے ہیں

مصحفی چِت[2] سے اُترتی ہی نہیں وے زلفیں
اُن کا ہی ذکر ہم اب دو دو پہر کرتے ہیں

279

جب لگے کھینچنے ہر خارِ بیاباں دامن — کیوں نہ ہو صورتِ صد چاک، گریباں دامن
شوق کو کیا کہوں اپنے، کہ ہوا سخت میں رات — کھینچ کر اُس بتِ کافر کا پشیماں دامن
دیکھ کر دست درازی کے مرے عالم کو — صورتِ تختۂ آئینہ ہے حیراں دامن
گرچہ دانتوں سے بھی اُس شوخ نے کاٹا لیکن — ہاتھ سے میرے نہ چھوٹا کسی عنواں دامن
کیا کروں میں جو ابھی ٹوٹ پڑے دل پہ مرے — باندھ کر اپنی کمر سے صفِ مژگاں، دامن
تو نے کس مضطربِ محض کو مارا ہے کہ ہے — آج، اے شوخ ترا خون سے افشاں دامن

1۔ مر پچ کے = ہزار دشواری سے 2۔ چِت = نگاہ

جستجو میں ترے دیوانے کی صحرا صحرا سنگریزوں سے بھرے پھرتے ہیں طفلاں دامن
میں چلا وادیِ مجنوں کو، تو وحشت نے مرا ہاتھ سے اپنے نہ چھوڑا کئی میداں دامن
کیا غضب ہے، کہ قدم رکھتے ہی تربت پہ مری لے اُٹھا ہاتھ میں وہ سروِ خراماں دامن
صورتِ شعلۂ جوالہ نظر آتا ہے رقص کے وقت ترا، اے مہِ تاباں دامن
اور بھی گریہ کر و ٹک کہ وہ سب تر ہو جائے ابھی کچھ خشک ہے، اے دیدۂ گریاں دامن
غم میں پروانے کے روتی ہے کھڑی ساری رات منھ پہ فانوس سے لے شمعِ شبستاں دامن
کس کی مژگاں کے تصور میں چلا تھا کہ ہوا اس بیاباں سے مرا وقفِ مغیلاں دامن
میں ہوں وہ کشتۂ مغضوب[1] کہ لاشے سے مرے راہ چلتے ہیں بچا، گبر و مسلماں، دامن
وادیِ نجد میں دیکھا تو فقط مجنوں کا سائباں تھا بہ سرِ گورِ غریباں دامن

مصحفی چاک گریباں نہ کروں میں جب تک
ہاتھ آتا ہے کوئی یار کا آساں دامن

280

ہوں گے، ہوئے بھی، ہم سے ہزاروں زمانے میں آیا نہیں کبھی خلل اس کارخانے میں
جائے گل آگ کھلنے لگی آشیانے میں ہے طرفہ سوز مرغِ چمن کے ترانے میں
دل میں نگہ دوسار ہے پھر کیونکے ہو جدا یہ تیر ہو گیا ہے ترازو نشانے میں
ہم وے اسیر ہیں کہ جو نادیدہ روے گل رکھتے تھے اشتیاقِ قفس آشیانے میں
فوارہ چشم کا نہ ہو کیونکر شرر فشاں آتش بجائے آب ہے اس کے خزانے میں
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ اے بلبلِ قفس آ ہم بھی ہوں شریک ترے آب ودانے میں

احوالِ زار اپنا سنا اُس کو مصحفی
مجنوں کے ایک روز ملا کر فسانے میں

1۔ مغضوب= جس پر غضب ہوا ہو، سزا یافتہ

و

281

کس پر ہے یہ تلوار بجی پھر کے تو دیکھو
کس پر ہے یہ ابرو کی کجی پھر کے تو دیکھو

آنکھوں میں لگایا ہے دھواں دھار جو کاجل
منظور ہے کیا اس سے، اجی پھر کے تو دیکھو!

وارفتہ ہو کیا آئینے میں حسن پر اپنے
یاں جان ہی جاتی ہے چلی پھر کے تو دیکھو!

مت دیکھیو تم پھر کے شہیدوں کو وگرنہ
پھر تم کو کہیں گے یہ سبھی، پھر کے[1] تو دیکھو

دم ہونٹوں پہ آیا ہے مرا آپ کی خاطر
تم اس کو سمجھتے ہو ہنسی، پھر کے تو دیکھو

کیا پیٹھ دیے بیٹھے ہو بیمار سے اپنے
ہے اس کا ادھر آنکھوں میں جی پھر کے[2] تو دیکھو

سلوائے ہے رستم کی بھی آنکھوں کو وہ بانکا
طاقت ہے طرف اُس کی، کوئی پھر کے تو دیکھو

منہ مجھ سے پھراتے ہو گرائے جان پھراؤ
پر ساتھ پھرانے کی ذری پھر کے تو دیکھو

ہے مصحفی اک عمر سے دنبال تمھارے
کیا اتنی تغافل[3] ہے کبھی پھر کے تو دیکھو

282

ہے ہے ٹک اُس طرف کو اجی پھر کے دیکھ لو
اک ناتواں کا جائے ہے جی، پھر کے دیکھ لو

کشتے کو اپنے چھوڑ کے بسمل کہاں چلے
یہ تو تڑپ رہا ہے ابھی، پھر کے دیکھ لو

خنجر کی آب جس کو پلا کر چلے ہو تم
اک دم تو اس کی تشنہ لبی پھر کے دیکھ لو

کیا مجھ کو چھوڑ نزع میں جانا ضرور تھا
اور یوں ہی ہے خوشی، تو ذری پھر کے دیکھ لو

مارا ہے جس کو کج نظری سے اُسے میاں
ابرو کی یوں کہے ہے کجی، پھر کے دیکھ لو

وہ منہ پھرا چمن سے چلے تھے کہ اتنے میں
بولا یہ ہنس کے کبکِ دری پھر کے دیکھ لو

1۔ پھر کے = دوبارہ 2۔ پھر کے = گھوم کر 3۔ تغافل کو مونث باندھا ہے

بن ٹھن کے قتل کرنے کو کس کے چلے ہو تم کس پر ہے آج تیغ تجی، پھر کے دیکھ لو
میری نظر مجھی کو لگے، دور چشمِ بد اس دم تو بن رہے ہو پری، پھر کے دیکھ لو
تم مصحفی کو چھوڑ کے بسمل چلے گئے
رخصت حیا نے اتنی نہ دی پھر کے دیکھ لو

283

خورشید کا ادھر سے گزر کس طرح سے ہو دیکھوں شبِ فراق سحر کس طرح سے ہو؟
پتھر تو تو نے موم کیا لیک یہ بتا اے نالہ اس کے دل میں اثر کس طرح سے ہو؟
فرصت نہ ہووے جس کو گریباں سے ایک دم وہ ہاتھ اس کا طوقِ کمر کس طرح سے ہو؟
ناسور پڑ گیا ہے جگر میں مرے دلا پونچھے سے خشک دیدۂ تر کس طرح سے ہو؟
اک تیرِ آہ پھینکتے ہیں اُس طرف کو ہم دیکھیں فلک کا سینہ سپر کس طرح سے ہو؟
ہے اُس کو عار میرے جوابِ سلام سے وہ پُر غرور، دست بہ سر کس طرح سے ہو؟
شیر و شکر کے جامے سے نفرت رہی جسے عاشق کے ساتھ شیر و شکر کس طرح سے ہو؟
بیٹھے ہوں ہر قدم پہ جہاں لاکھ دیدبان[1] عاشق کا ایسی جا گہ گزر کس طرح سے ہو؟
منزل ہے دور، پانو تھکے، جسم ناتواں دیکھیں تمام اب کا سفر کس طرح سے ہو؟
اپنوں کے گھر رہے نہ جو وسواس سے کبھی مہمانِ شب وہ غیر کے گھر کس طرح سے ہو؟
رہتا ہے واں تو آئنہ دن رات پیشِ چشم احوال پر کسی کے نظر کس طرح سے ہو؟
دل آب ہو کے اشک کا قطرہ تو بن گیا یہ قطرہ اب میں دیکھوں گُہر کس طرح سے ہو؟
جو خونِ کشتگاں سے مَلے ہاتھ پر حنا اُس کو کسی کے خون کا ڈر کس طرح سے ہو؟
میں تو شبِ فراق کے زنداں میں قید ہوں وا میرے منہ پہ صبح کا در کس طرح سے ہو؟
اپنی تو عمر شعر میں اے مصحفی کٹی
اِس کے سوا اب اور ہنر کس طرح سے ہو؟

1۔ دیدبان = چوکیدار (Watchman)

284

اشک بے صرفہ نہ اے دیدۂ تر جانے دو　آستیں خون میں بھرتی ہے تو بھر جانے دو

یہ شبِ ہجر ہے بیٹھے رہو، اے ہم نفساں　بیٹھے بیٹھے ہی ٹک اس شب کو گزر جانے دو

ہم پریشانی کی اپنی بھی کریں گے تقریب　تم ذرا اور بھی زلفوں کو بکھر جانے دو

اے طبیبو! نہ کرو بہرِ خدا اس کی دوا　میری آنکھوں سے مرا خونِ جگر جانے دو

سعی کا فائدہ؟ اے کارکنانِ گیتی　نہیں ہونے کی شبِ ہجر سحر، جانے دو

جھانکنے کا نہیں پھر میں کبھی، تقصیر ہوئی　نہ کرو بند میاں رخنۂ در، جانے دو

تم سے اے آنسوؤ مجھ کو یہ گلہ ہے کہ کبھی　اُس کے رخسار تلک بھی نہ نظر جانے دو

دل کو گر قید کیا تم نے، میاں خوب کیا　لیکن اُس سے مجھے اک بات تو کر جانے دو

کبھی روکوں ہوں جو اُس کو تو وہ زلفوں کو بکھیر　مجھ سے کہتا ہے کہ شب ہے، مجھے گھر جانے دو

دل کو کوچے سے ترے لائے ہیں جو شخص بہ زور　اُن سے کہتا ہے یہی، مجھ کو اُدھر جانے دو

ایک نے اُس سے کہا مصحفی مرتا ہے میاں
یوں کہا اُس نے کہ پھر کیا کروں، مر جانے دو

285

عاشق کے دلِ زار کو تم ہاتھ سے مت دو　اس مرغِ گرفتار کو تم ہاتھ سے مت دو

کم گل کی نزاکت سے نہیں اُس کی نزاکت　میرے دلِ افگار کو تم ہاتھ سے مت دو

یوں خونِ جگر مجھ کو پلاؤ تو پلاؤ　پر جامِ مے اغیار کو تم ہاتھ سے مت دو

لٹکے ہو اسیرو بہ سرِ چاہِ زنخداں　اس طرۂ طرار کو تم ہاتھ سے مت دو

میں اپنا گلا کاٹوں ہوں آپ اُٹھ کے چھری سے　اچھا، مجھے تلوار کو تم ہاتھ سے مت دو

یوں چاہو جہاں گرمیِ بازار کرو، جاں　پر اپنے خریدار کو تم ہاتھ سے مت دو

میں بیٹھ رہوں ہوں تو یہ دل مجھ سے کہے ہے　اُس آئنہ رخسار کو تم ہاتھ سے مت دو

آنے دو سرِ تیر تو آہوے حرم کو　　پیارے ابھی سوفار کو تم ہاتھ سے مت دو

میاں مصحفی گو یار تمھیں دوکھیں[1] ولیکن
سر رشتۂ گفتار کو تم ہاتھ سے مت دو

286

حسن اور عشق یار ہیں دونو　　روز و شب ہم کنار ہیں دونو

جان و دل بیقرار ہیں دونو　　تب تو چشم اشکبار ہیں دونو

کیوں نہ ٹپکے لہو بھوؤں سے تری　　تیغ یہ آب دار ہیں دونو

چشمِ بد دور، تیری چشمِ سیاہ　　آفتِ روزگار ہیں دونو

تیرے تیرِ نگہ کے، اے صیاد　　دیدہ و دل شکار ہیں دونو

جاے خلخالِ پا ہوئے تھے جو رات　　میرے شانے فگار ہیں دونو

زار روتے ہیں میرے دیدۂ تر　　رشکِ ابرِ بہار ہیں دونو

میرے ہاتھوں میں کب ہے گیرائی　　صورتِ پشت خار[2] ہیں دونو

دل مرا اور غنچۂ لالہ　　دیکھ لے، داغ دار ہیں دونو

جیب و دامن کا میرے حال نہ پوچھ　　ان دنوں تار تار ہیں دونو

وے دو بوسے لیے تھے اُس کے جو میں　　مجھ پر اب تک اُدھار ہیں دونو

رات دن جستجو میں اُس مہ کی　　مہ و خورشید خوار ہیں دونو

اُس کے جولاں کے، آسمان و زمیں　　ایک ادنیٰ غبار ہیں دونو

قیس و فرہاد سے گزر نہ کہ یہ　　ق　　عاشقِ جاں نثار ہیں دونو

یہ جو یاں خاک و سنگ کے ہیں ڈھیر　　یہ اُنھیں کے مزار ہیں دونو

بہ طریقِ کلیم[3] اور قدسی[4]　　ق　　جان و دل سے یہ یار ہیں دونو

1۔ دوکھنا = دکھ دینا (عوامی)　2۔ پشت خار = لوہے یا لکڑی میں ایک پنجہ بنا ہوا، جس سے پیٹھ کھجاتے ہیں۔ 3۔ ابوطالب کلیم شاعر فارسی　4۔ محمد جان قدسی شاعر

کوئی سمجھے تو مصحفی و قتیل[1]
شعر میں یادگار ہیں دونو

287

کیا نہ تھا غمِ دل آشکار ہم نے تو		چھپا رکھا تھا دلِ داغ دار ہم نے تو
ہم اور شخص کی کہتے نہیں، خدا کی قسم		بہت سہا ستمِ روزگار ہم نے تو
ترے فراق میں کیوں اب تلک رہے جیتے		کچھ اور دل سے کیا تھا قرار ہم نے تو
یہ دل میں رہ گئی حسرت کہ آہ وقتِ وداع		ملائیں تجھ سے نہ آنکھیں بھی یار، ہم نے تو
ہوا ہے دستِ جنوں سے یہ اپنی جیب کا حال		کیا تھا کاہے کو یوں تار تار ہم نے تو
رہے اسیرِ قفس سالہا ہزار افسوس		نہ دیکھی ایک بھی فصلِ بہار ہم نے تو
نشاں ہے گم ترے کشتے کا کیوں محرم[2] میں		نئی بنائی تھی اُس کی مزار ہم نے تو
کب اور کرتے ہیں یوں آنسوؤں کی اپنے قدر		گلے کا اُن کو بنایا ہے ہار ہم نے تو
کہے ہے دل کو مرے ذبح کر کے وہ بے درد		زمیں پہ چھوڑ دیا یہ شکار ہم نے تو
نہ آؤ تم ہی جو وعدے پہ اپنی کیا تقصیر		تمام رات کیا انتظار ہم نے تو
ہمیشہ گرم ملے تیرے ملنے والوں سے	ق	رکھا نہ اُن کے بھی ملنے کا عار ہم نے تو
پہ تجھ کو اس پہ بھی مصروفِ غیر ہی پایا		یہ امتحان کیا لاکھ بار ہم نے تو

یہ ریختے کا جو اُردو[3] ہے مصحفی اس میں
نئی نکالی ہیں باتیں ہزار ہم نے تو

288

مت آستیں سے ساعدِ سیمیں نکال تو		رنگِ حنا دکھا کے مجھے مار ڈال تو
فتنے سے یوں کہے ہے تری شوخیِ خرام		میں سیر کو چلوں، مرا دامن سنبھال تو

1۔ محمد حسن قتیل 2۔ رواج یہ تھا، اور بعض جگہ اب بھی ہے، کہ پرانی یا شکستہ قبر کی مرمت یا نئی تعمیر ماہ محرم میں کرتے تھے۔ 3۔ اردو کی اصطلاح استعمال کرنے والے مصحفی غالباً پہلے شاعر ہیں

صیاد صیدِ دل کی تمنا بھی تھی یہی اپنے ہی ہاتھ سے اسے کیجو حلال تو
کیا کوئی عرضِ حال کرے تجھ سے میری جاں دیتا ہے ہنس کے باتوں کو عاشق کی ٹال تو
ہر ہر قدم پہ تیرے تڑپتی ہیں حسرتیں سیکھا ہے کس سے اے بتِ کافر یہ چال تو
کیا تجھ سے کامِ دل میں نہ لوں روزِ وصل لیک اتنا ہی مجھ کو ڈر ہے کہ ہے خُرد سال تو
آج اس کی خاک پھرتی ہے گلیوں میں دربدر کل کر گیا تھا جس کے تئیں پایمال تو
ہوتا ہے گر سفر میں ترا آشنا تو پھر اس کی دکھانے آئے ہے مجھ سے ہی فال تو
لٹ اُس کی، آستیں میں جو شب میری آگئی بولا کہ ہے یہ سانپ چنبیلی کا، پال تو
پڑھتا ہوں تیرے سامنے میں وہ بھی مصحفی
گر دوسری غزل کا رکھے ہے سوال تو

289

جب سر جھکا کے دھووے ہے دریا میں بال تو پھینکے ہے سر پہ مردمِ آبی کے جال تو
کب تجھ کو مجھ سے لاگ ہے، آوازِ عندلیب کیوں سالتی[1] ہے دل میں مرے اب کے سال تو
کہتا ہے آئنے میں ترا عکس تجھ سے یوں تیری مثال میں نہیں، ہے بے مثال تو
پٹھوں میں اُس کے دھنسنے کا شاید خیال ہے اے دل تجھے، چلے ہے جو یوں جوں[2] کی چال تو
کوٹھے سے اس کا گوشۂ ابرو ہوا بلند جلدی سے اپنے منہ کو چھپا، اے ہلال تو
تختے سے زعفراں کے نکلتا ہے آفتاب الٹے ہے اپنے منہ سے سنہری جو شال تو
قصہ نہ زندگی کا چُکا، تیغِ یار سے اے مرگ آکے اب اسے کر انفصال تو
قاتل نے قتل کر کے مری لاش سے کہا "رکھتا تھا اپنے جی میں بھی کیا کیا خیال تو"
کہتا ہے مجھ سے خواب میں آکر خیالِ دوست ق مانگا تو کر خدا سے دعاے وصال تو
گر میں کہوں یہ اُس سے کہاں میں کہاں وصال تو یوں کہے "بلا سے، پڑا رہ نڈھال تو"

1۔ سالنا = کچوکے دینا، ٹیس 2۔ جوں کی چال چلنا = آہستہ رینگنا

عنقا و وصل ایک ہیں معنی میں مصحفی
کس واسطے کرے ہے خیالِ محال تو

290

آئی بہار حسرتِ دل اب نکال تو بلبل پھڑک پھڑک کے قفس توڑ ڈال تو
گزری ہے تجھ پہ غیر کے گھر کیا جو آئے ہے چہرے سے پونچھتا عرقِ انفعال تو
یوں جی ہی جی میں اپنے کہے ہے وہ روزِ وصل قابو میں پا کے اپنے اسے مار ڈال تو
در اُس پہ بند ہو تو کہے اضطرابِ حسن کوٹھے کی چھت کو توڑ کے کھڑکی نکال تو
طول اس قدر کلام کو کیوں دے ہے مصحفی
جانا، فنِ سخن میں ہے صاحب کمال تو

291

پاس اپنے نہ ہر اک کو مری جان بٹھاؤ دروازے پہ تم اپنے نگہبان بٹھاؤ
یک لحظہ دمِ قتل کوئی سامنے اس کے کرکے مجھے اس شوخ پہ قربان، بٹھاؤ
خط تھوڑا ہی لکھنا مجھے اب باقی ہے یارو قاصد کو کوئی دم کسی عنوان بٹھاؤ
یہ کس نے کہا تھا مجھے تم قلزمِ خوں میں اے دیدۂ تر تا بہ گریبان بٹھاؤ
لے جاکے گھر اپنے میں میاں مجھ کو کرو قتل کیا فائدہ جو بر سرِ میدان بٹھاؤ
معزول ہوا حاکمِ نیساں تو، زمین پر تم اپنا عمل دیدۂ گریان بٹھاؤ
اے قافلے والو یہ ہے مجنوں کی زیارت یاں ناقۂ لیلیٰ کو کوئی آن بٹھاؤ
میاں مصحفی بیٹھے ہے وہ کب پاس کسی کے
تم اُس کا مگر کھینچ کے دامان بٹھاؤ

292

نہ نسیم نامہ مانگے، نہ صبا پیام بر ہو تجھے کس طرح سے یارب مرے حال کی خبر ہو

ترے ماتھے پہ لگاوے جو طبیب گھس کے صندل
تو ہی سوچ اپنے جی میں مجھے کیوں نہ دردِ سر ہو

ترے کوٹھے پہ جو پھینکوں میں کمند آخرِ شب
تو یہ ڈر رہے مبادا نہ سپیدہ[1] جلوہ گر ہو

شبِ ہجر یہ توقع مجھے تجھ سے تھی کہ جب میں
لگوں دم شمار کرنے اُسی دم تو پھر سحر ہو

تری دونوں زلف باہم یہ کریں تھی مشورت رات
رہے بیچ میں وہ چہرہ، میں اِدھر ہوں تو اُدھر ہو

مجھے گر دوا کھلاوے تپِ عشق کی، مسیحا
یہ دعا کرے کہ یارب یہ دوا تو کارگر ہو

مرے ہاتھ کر حمایل، کہ مزا اُٹھاوے تو بھی
نہ کہ دستِ غیر ہر شب ترے طرفِ دوش پر ہو

نہیں ناامید کوئی کرمِ خدا سے ہرگز
تری بات میں اثر ہے، مری چاہ میں اثر ہو

میں گزر گیا ہوں جس کی سرِ رہ پہ، جی اُٹھوں پھر
جو مرے جنازے کا ہی اُسی راہ سے گزر ہو

مجھے بے گناہ جس نے سرِ رہ کیا ہو ٹکڑے
مری لاش پر تو آکر وہ کشندہ چشم تر ہو

جو میں اپنے گھر سے نکلوں تجھے ڈھونڈنے کسی شب
یہ غضب ہے تُو اُسی شب کسی آشنا کے گھر ہو

مرے مصحفی کی خاطر کسی در سے تو نکل آ
تری جستجو میں کب تک وہ خراب دربدر ہو

293

مرتا ہے کوئی پھر کے نظر دیکھتے جاؤ
جاتے تو ہو گھر، لیک ادھر دیکھتے جاؤ

آ نکلے ہو آخر تو ادھر راہِ کرم سے
نزدیک ہے عاصی کا جو گھر دیکھتے جاؤ

ہر اشک کے قطرے کو بنائے گا یہ موتی
اب دیدۂ گریاں کا ہنر دیکھتے جاؤ

ہنستے ہوئے کیا سیر کو لالے کی چلے ہو
میرا بھی تو ٹک داغِ جگر دیکھتے جاؤ

اے ہم نفساں بیٹھو، شبِ ہجر میں مجھ پر
جو کچھ کہ ہو، تا وقتِ سحر، دیکھتے جاؤ

جاتے ہوئے تم کشتۂ شمشیر کو اپنے
نقصان ہے کیا اس میں اگر دیکھتے جاؤ

بیمار تمھارا ہے کوئی دم ہی کا مہماں
چاہو تو اُسے وقتِ سفر دیکھتے جاؤ

کیا رقص میں بیتابیِ دل دیکھو ہو میری
اپنی بھی تو ٹک تابِ کمر دیکھتے جاؤ

1۔ سپیدہ = صبح کی روشنی

کیا خو ہے میاں مصحفی یہ تم میں کہ جس وقت
اس کو سے چلو جانبِ در دیکھتے جاؤ

294

بسمل کے تڑپنے میں جو قاتل کی خوشی ہو — تڑپے وہ پڑا، گو کہ نہ بسمل کی خوشی ہو
اے ناقۂ لیلیٰ طرفِ نجد گزر کر — مجنوں کو کسی روز تو محمل کی خوشی ہو
کشتی مری دریاے محبت میں تبہ ہی — ایسے نہ ہوئی جو مجھے ساحل کی خبر ہو
دے ڈال تو بوسہ ہی لبوں کا کہ سخی ہے — کیا چیز ہے یہ، اس میں جو سائل کی خوشی ہو
مجنوں، تو اِسی طرح سے کر دست فشانی — جس طرح کہ لیلیٰ کے قبائل کی خوشی ہو
کیا سمجھے بھلا رنجِ اسیری وہ دوانہ — سودے میں جسے اور سلاسل کی خوشی ہو
تصویر بھی اپنی تو اُسے جب نہ دکھاوے — کس شکل سے پیارے ترے مائل کی خوشی ہو
تو شوق سے مل غیر سے، مانع نہیں تیرا — ملنے میں اُسی کے جو ترے دل کی خوشی ہو

اے مصحفی تو پڑھ یہ غزل سامنے اُس کے
تا اس میں سلیماں شہِ باذل کی خوشی ہو

295

یوں مجھ پہ شبِ وصل میں سَو لات چلاؤ — پر تم کو قسم ہے جو کہیں بات[1] چلاؤ
کیا اپنی ہی نت کہتے ہو، اس شوخ سے، یارو — میرا بھی کبھی ذکرِ ملاقات چلاؤ
جو مثلِ حنا دست گرفتہ ہو تمھارا — تم موٹھ[2] صنم اس پہ ہی ہیہات چلاؤ
اس انجمنِ خاص کے، اے بیٹھنے والو — میرا بھی تو مذکور کسی رات چلاؤ

میاں مصحفی ہرگز نہ رکھو کام کسی سے
جس طرح سے ہو اپنی تم اوقات چلاؤ

1۔ بات چلانا = چرچا کرنا 2۔ موٹھ = لکڑی کی شام

296

بختِ خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگاتے جاؤ　ہے یہ مردہ سا پڑا، اِس کو جلاتے جاؤ
ناصحو، چاک اُدھر اس کو میں کرتا جاؤں　تم ادھر میرے گریباں کو سلاتے جاؤ
تیل ڈالا ہے چمیلی کا، تو عاشق کے تئیں　اپنے بالوں کی ذرا لٹ تو سنگھاتے جاؤ
نعش سے کشتے کی تم اپنے کنارہ نہ کرو　جی میں آوے تو ذرا ہاتھ لگاتے جاؤ
باتیں مجھ ساتھ کرو، آپ کی یہ کیا خو ہے　اور اُدھر آئنے سے آنکھ لڑاتے جاؤ
جانِ من تم کو ارادہ ہے سفر کا تو بھلا　اپنے بیمار کو صورت تو دکھاتے جاؤ
گر چلے سیرِ گلستاں کو، مبارک لیکن　اک گلوری تو مرے ہاتھ سے کھاتے جاؤ
لطف تب ہے کہ ہوا کھولتی جاوے اُس کو　اور تم پردے میں منھ اپنا چھپاتے جاؤ

مصحفی تم میں اگر عشق کی طاقت ہے میاں
ناز جو جو وہ کرے تم پہ، اُٹھاتے جاؤ

297

دے بوسۂ قلیاں ہی ذرا اور نہیں تو　لوں میں لب نے کا ہی مزا، اور نہیں تو
دشمن سے نہ اُٹھوا تو مری نعش پس از مرگ　کر دوستی اتنی تو بھلا، اور نہیں تو
دے چھوڑ قفس سے ہمیں صیّاد کوئی دم　صحرا ہی کی کھاویں گے ہوا، اور نہیں تو
اے ساقیِ غم مجھ کو تُو اِس تشنہ لبی میں　اک جامِ ہلاہل ہی پلا، اور نہیں تو
آنکھوں میں نہ کر غیر سے ہر لحظہ اشارہ　اتنا تو مرا مان کہا، اور نہیں تو
حاضر رہے مجلس میں مے و مطرب و ساقی　دے اتنی فراغت تُو خدا، اور نہیں تو
خوں ریزی کا ساماں جو زیادہ نہ ہو پیارے　فندق ہی کو لگوا تو حنا، اور نہیں تو
لے جاوے مری خاک اُڑا اس کی گلی میں　اتنا تو کرے بادِ صبا، اور نہیں تو

اے مصحفی گر تجھ کو رسائی نہیں اُس تک
کر اپنے ہی بختوں کا گلا، اور نہیں تو

298

گو ان میں بوے الفت و مہر و وفا نہ ہو | یا رب جو خوبرو ہیں اُنھوں کا برا نہ ہو
چاہت نے تیری خاک میں ہم کو ملا دیا | سچ ہے کہ روے خوش پہ کوئی مبتلا نہ ہو
گو تو ملے ہر اک سے پہ یہ چاہتا ہے رشک | جو آشنا مرا ہے، ترا آشنا نہ ہو
ہووے اگر نماز قضا اس کا ڈر نہیں | پر چاہیئے نمازِ محبت قضا نہ ہو
گر ماہِ آسماں ہو تو کچھ کام کا نہیں | جس خوبرو میں شوخی و ناز و ادا نہ ہو
ہرگز نہیں نماز روا اُس شہید کی | جو ان بتوں کا کشتۂ رنگِ حنا نہ ہو

جانے دے مصحفی تو خیالِ پری رخاں
اتنا بھی روے خوش پہ دوانے فدا نہ ہو

299

آج پلکوں کو جاتے ہیں آنسو | اُلٹی گنگا بہاتے ہیں آنسو
آتشِ دل تو خاک بجھتی ہے | اور جی کو جلاتے ہیں آنسو
خونِ دل کم ہوا مگر، جو مرے | آج تھم تھم کے آتے ہیں آنسو
جب تلک دیدہ گریہ ساماں ہو | دل میں کیا جوش کھاتے ہیں آنسو
گوکھرو پر تمھاری انگیا کے | کس کے یہ لہر کھاتے ہیں آنسو
تیری پازیب کے جو ہیں موتی | اُن سے آنکھیں لڑاتے ہیں آنسو
شمع کی طرح اک لگن میں مرے | ق | مصحفی کب سماتے ہیں آنسو
فکر کر ان کی، ورنہ مجلس میں | ابھی طوفان لاتے ہیں آنسو

300

جان جاتی ہے اک نظر دیکھو | ہوں میں رخصت طلب اِدھر دیکھو
شک ہے گر تم کو میری چاہت میں | تم بھی چاہو تو عشق کر دیکھو

کیسا اوروں کا دل کڑھاتے ہو　　اپنی چھاتی پہ ہاتھ دھر دیکھو
کیا ہی باہم پڑا ہے اُلجھیڑا[1]　　پیچشِ زلف اور کمر دیکھو
عمر کا بھر چکا ہے پیمانہ　　اب تو تم مجھ کو آنکھ بھر دیکھو
میرے منھ سے کچھ اب نکلتا ہے　　ہو گئے ہو بہت نڈر دیکھو
صبح دم ہی وہ گھر مرے آیا　　نالۂ شب کا ٹک اثر دیکھو
آؤ جب کرنے پر سفر ناگاہ　　تیرہ تیزی[2] نہ تم صفر دیکھو
ان دنوں مت سفر کو جاؤ میاں[3]　　ابھی عقرب میں ہے قمر دیکھو
میرے نامے کو سرسری نہ پڑھو　　اک ذرا اس کو بیٹھ کر دیکھو
مدعا بھی نکل رہے گا کہیں　　پڑھتے جاؤ نہ، پیشتر دیکھو
ہو چکے نامہ جب تمام تو پھر　　ہے عبارت جو پشت پر دیکھو
کر لو اول سے تا بہ آخر غور　　پھر جدھر چاہو تم اُدھر دیکھو

مصحفی جاؤ آپ سے[4] نہ ابھی
اور بھی راہِ نامہ بر دیکھو

301

آگ میں گو جلائیے دل کو　　صبر کیوں کر سکھائیے دل کو
کچھ گریباں نہیں کہ ہر ساعت　　چاک کر کے سلائیے دل کو
ادھر آجائے گر وہ تیر انداز　　خاکِ تودہ بنائیے دل کو
ایک تو بے وفا سمجھیے اُسے　　آہ تِس پر لگائیے دل کو
ہاتھ اُٹھانا تو ہے بہت آساں　　اُس سے کیوں کر اُٹھائیے دل کو
دل اگر ہو اسیرِ دامِ کمند　　سو طرح سے چھڑائیے دل کو

1۔ الجھیڑا = الجھاؤ (عوامی) 2۔ تیرہ تیزی = عورتوں نے مہینوں کے جو نام رکھ لیے تھے، اُن میں سے ایک مہینا۔ (ربیع الثانی) 3۔ پہلے زمانے کے لوگ جب قمر در عقرب دیکھتے تو سفر نہیں کرتے تھے
4۔ آپ سے جانا = بے صبری

یہ گرفتاریِ محبت ہے اس سے کیوں کر بچایئے دل کو

مصحفی یار کی خوشی ہے یہی
یعنی غم میں گھلایئے دل کو

302

شبِ مہتاب ہو، صحرا ہو، تو ہو کہوں تب میں، جو میری آرزو ہو
اُٹھاوے گا تو اے جراحِ خِفّت نہیں یہ زخم ایسا جو رفو ہو
حجابِ عشق، کب تک عشقِ پنہاں اُٹھا پردے کو اک دن، روبرو ہو
دماغ اپنا یہی چاہے ہے ہر شب کہ تو ہو اور ترے گیسو کی بو ہو
لگے ہے جی وہیں اپنا تو جس جا ترا مذکور، تیری گفتگو ہو
نہ رووے کیونکے وہ دلدادۂ عشق جسے آٹھوں پہر رونے کی خو ہو
تری تصویر مانی لکھ کے بولا کوئی ایسا نہ یا رب خوبرو ہو
پری کہتی ہے دیکھ اُس کو پری سے خدا دیوے تو ایسا رُو و مو ہو
الٰہی آوے وہ شب بھی کہ جس میں مرے ہاتھ ہوویں اور اُس کا گلو ہو
شراب اوروں کو دی، یہ جانتے ہیں ہمارے جام میں ساقی لہو ہو

شبِ ہجر آئی ہے اے مصحفی پھر
تو کرلے جتنی تجھ سے ہاے وہُو ہو

303

طولِ شبِ فراق سے کب تک گزند ہو یا رب شتاب صبح کا تارا بلند ہو
آتا ہے میرے خواب میں پھر پھر کے وہ نگار چونکے پہ تا مصیبتِ ہجراں دو چند ہو
عالم میں اُس کے نور کے بکّوں کا کیا کہوں مکھڑے پہ جس کے خوشۂ پرویں سپند ہو
غل چور کا ہوا تھا کہیں تب سے ہے یہ حکم پھاٹک گلی کا اُس کی سرِ شام بند ہو

دُزدی کی کاش یوں کوئی تصویر کھینچ دے کوٹھے پہ ہو وہ، ہاتھ میں میرے کمند ہو
میں ہوں وہ تلخ کام کہ روزِ وصال بھی آوے جو خندہ لب پہ مرے، زہر خند ہو
آتی ہے بانگِ سینہ خراش آج نجد سے مجنوں سے ہم بغل نہ کوئی دردمند ہو
لایا ہوں لختِ دل کو بہ تقریبِ پیش کش شاید کہ یہ عقیق تمھاری پسند ہو
شیرینیِ سخن تری یہ کچھ ہے مصحفی
کاغذ نہ کیونکے کاغذِ رو پوشِ قند[1] ہو

304

تم ایسا شوق دلا کر چھپا گئے منھ کو کہ خواب میں بھی نہ اک شب دکھا گئے منھ کو
لیا نہ بوسہ ترا، پر یہ ہم نے کام کیا کہ سوتے میں ترے منھ سے لگا گئے منھ کو
شبیہ میں ترے چہرے کی، کاتبانِ قضا دقیقہ جان کے، اول بنا گئے منھ کو
یہ کیا ادا تھی کہ رستے میں آتے آتے کل تم اس غریب سے ناحق پھرا گئے منھ کو
کبھی لب اُن کے نہ پھر آشنائے حرف ہوئے جو تیری بزم میں آکر سِلا گئے منھ کو
نہ مصحفی کی ہوئی ہمسری کسی سے بہ شعر
ہزاروں سامنے آکر چڑا گئے منھ کو

305

جو تم غلام کو چاہو ہو سرفراز کرو تو پانْو اپنے دوشالے ہی میں دراز کرو
ذرا کھڑے تو ہو میت پہ اپنے کشتے کی کیا میں فرض، کہ تم آپ مت نماز کرو
کہو ہر ایک کے آگے بھلا بُرا نہ مجھے یہ کون شخص ہے، اتنا تو امتیاز کرو
کرے گر آپ کی کیسی ہی منتیں کوئی وہ تم نہیں ہو کہ بندِ قبا کو باز کرو
کہے ہے دیکھ نگاہوں کو میری وہ بتِ شوخ یہ جی میں اپنے، تم ایسے سے احتراز کرو

1۔ کاغذ رو پوشِ قند = مٹھائی پر ڈھکا ہوا کاغذ

میں قدرداں ہو تمھارے تغافلوں کا میاں بڑا غضب ہو جو تم ہر کسی پہ ناز کرو
جلا جو شمع پہ پروانہ اُس کی وہ جانے نہ مجھ سے کوئی یہ مذکورِ جاں گداز کرو
پری رخوں سے کہے ہے یہی وہ غمزۂ شوخ کہ نقد جان و دل اپنا مری نیاز کرو
وصال اُس کا میاں مصحفی ہے امرِ محال
نہ جب تلک کہ کسی کارداں[1] سے ساز کرو

306

خدا نے ہاتھ سے اپنے ترے سنوارے پانو خوش آویں کیونکے نہ مجھ کو یہ پیارے پیارے پانو
میں کیوں کے چاک گریباں کروں، کدھر جاؤں اُدھر کو ہاتھ تھکے اور اِدھر کو ہارے پانو
یہ اضطراب ہے دل کو کہ اب کسی صورت گلی میں اُس کی ٹھہرتے نہیں ہمارے پانو
یہ پاے یار میں کفشِ ستارہ دار نہیں فلک سے پوجنے آتے ہیں اس کے تارے پانو
کرے نہ جا کے ہماری خبر کوئی اُس کو جو پیٹ پیٹ مریں ہم قلق کے مارے پانو
بہارِ رنگِ کفک دیکھے اُن کی گر شیریں تو صدقے ہو ترے پانووں پہ اپنے وارے پانو
میں مارے رشک کے تلوے ہی دیکھ کر دی جاں ابھی نہ کھینچے تھے مانی نے اُس کے پیارے پانو
پڑا جو سوتے میں ناگاہ میرا پانو ان پر تو لات مار کے بولے ''رکھو کنارے پانو''
تم آئے گھر مرے مہماں کبھی تو میں بیتاب اندھیری رات میں ڈھونڈا کیا تمھارے پانو
دبا رکھا جو میں شب اُن کو مصحفی تو کہا
لیے ہیں آپ نے بندے کے کیا اجارے پانو

307

برقع لپیٹے منھ سے جاتے ہو تم کدھر کو صدقے میں اس ادا کے، ٹک دیکھیے ادھر کو
ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑ جائے پیچ کوئی انگڑائی لے کے ناحق بل دیتے ہو کمر کو

1۔ کارداں = تجربہ کار

پیچھے تمھارے یہ جو آتا ہے اجنبی سا　شاید اسے لگا کر تم لے چلے ہو گھر کو
لے کر جواب خط کا جو اب تلک نہ آیا　کیا جانے ہو گیا کیا رستے میں نامہ بر کو
اک تیر کے ہوئے ہیں پہلو میں دو نشانے　دل کو بچاؤں یا رب پیکاں سے، یا جگر کو
کانوں سے اُس کے کوئی کب لگ سکے ہے، جس نے　لٹکا رکھا ہو برسوں آویزۂ گہر کو
دل نت نئی خلش اک پہلو میں جو کرے ہے　دل کی جگہ رکھا تھا کیا حق نے نیشتر کو؟
شب اُس خلاف گو کے آنے کا تھا جو وعدہ　ہرگز کیا نہ ہم نے تا صبح بند در کو
دن رات آرسی سے صحبت رہے تمھاری　یہ ہے خدا کی مرضی، ہم ترسیں اک نظر کو
ہوتی نہیں ہے آخر اب تک جو ہجر کی شب　اس رات کیا الٰہی موت آگئی سحر کو

آخر ہے مصحفی شب، چل تو بھی راہ لگ اب
مجلس سے یار اُٹھ اُٹھ گئے اپنے اپنے گھر کو

308

جب ہم نے اُس کی جانب بھیجا پیامبر کو　رستے میں لُٹ کھُسٹ[1] کر آیا وہ اپنے گھر کو
اپنا بھی جی سے جانا اب ہو چکا مسلّم　ہم رہ بکیں ہیں کوئی، جب تم چلے سفر کو
اُس نازنیں پہ تم نے یہ کیا ستم کیا ہے　ہیکل کا بوجھ دیکھو، اور بال سی کمر کو
دینا ہے بوسہ پیارے تو دو بھی، کون ہے اب　پھر پھر کے دیکھتے ہو تم کیا اِدھر اُدھر کو
کی ایک نے سفارش اُس سے مری تو بولا　پاس اپنے کیوں بٹھاؤں میں ایسے بدنظر کو
اے چرخ وصل کی شب آئی ہے بعدِ مدت　کر دیجو آج تیغا[2] دروازۂ سحر کو
آوے گی کام کس دن، اے نالہ تیری گرمی　لگتی نہیں جب آتش اس آہِ بے اثر کو

اے مصحفی عجب کیا مژگاں کی پھانس نکلے
گر بعدِ مرگ چیرے کوئی مرے جگر کو

1۔ لُٹ کھُسٹ کر = لوٹا کھسوٹا ہوا (روزمرہ) 2۔ تیغا کرنا = بند کرنا

ہ

309

تم تو سو رہتے ہو سر بالشِ کمخواب پہ رکھ
ہم پڑے رہتے ہیں ہاتھ اس دلِ بیتاب پہ رکھ

کیا تصور کا سراغ اُس کے میں ڈھونڈوں کہ وہ شوخ
دیدۂ تر سے گیا رات، قدم آب پہ رکھ

یوں ہے اس چشم کا عالم تہِ ابرو جیسے
پھول نرگس کا کوئی دے خمِ محراب پہ رکھ

غیر کے آگے جو کھولا ہے مرے خط کو تو پھر
دی سر انگشت[1] شتابی وہیں القاب پہ رکھ

میرے چہرے پہ ہوائی سی جو شب اُڑنے لگی
اس نے کیا کیا نہ سنائیں مجھے مہتاب[2] پہ رکھ

خون کا اپنے ہے گر پاس تجھے اے رستم
دشنۂ تیز نہ یوں شہ رگِ سہراب پہ رکھ

اپنا اسباب مُسبّب[3] کو سمجھ در ہر حال
مصحفی تو نہ نظر عالمِ اسباب پہ رکھ

310

سر ٹھوکروں میں پھرتے ہیں جس کے قدم کے ساتھ
رکھتے ہیں عشقِ سجدہ ہم اس پُر ستم کے ساتھ

لکھنا نہ تھا جو ہم کو اُسے، سو بھی لکھ گئے
مستی میں رات ہاتھ جو بہکا قلم کے ساتھ

اوقاتِ تیغ و خنجر و پیکاں ہمیں پہ ہے
وابستہ کتنے دم ہیں یہ اپنے ہی دم کے ساتھ

یک قطرہ خونِ دل کی کہوں کیا میں رستمی
کشتی رہے ہے نت اُسے اک تازہ غم کے ساتھ

اے فرطِ شوق تو مجھے رسوا نہ کیجیو
لایا ہوں، اپنے گھر اُسے قول و قسم کے ساتھ

میں بت کدے میں دور سے دیکھ اُس کو غش کیا
کچھ باتیں کر رہا تھا برہمن صنم کے ساتھ

کشتہ ہوں کس کی زلف کا جو خاک پر مری
سنبل پڑا ہوا ہے عجب پیچ و خم کے ساتھ

نامہ شریف کعبہ نے میرا کیا جو چاک
اُڑتا پھرا کبوترِ بامِ حرم کے ساتھ

1۔ سر انگشت = انگلی کا سرا 2۔ مہتاب پہ رکھ = یعنی بظاہر چاند پر طنز کیا، مراد مجھے سنانا تھا
3۔ مُسبّب (بروزن منجّم) = اللہ، (سبب پیدا کرنے والا)

تربت پہ میری شورِ محرّم بپا نہ ہو دیکھو جدھر کو سینہ زنی ہے علَم کے ساتھ
خسرو کے سر پہ وہ نہ رہا تاجِ خسروی ق نے رہ گیا وہ چترِ فلک سا ہی، جم کے ساتھ
کیسی اب ان کی دھوپ میں جلتی ہیں تربتیں سایے میں یاں پلے تھے جو ناز و نعم کے ساتھ
کر پیشہ تو کرم، کہ برآئے دعائے خیر اُٹھتے ہیں ہاتھ سیکڑوں دستِ کرم کے ساتھ
رویا گلے لگا مجھے رہباں بھی مصحفی
بیت الصنم میں مَیں جو گیا چشمِ نم کے ساتھ

311

اس نے رکھا جو اک انداز سے رخسار پہ ہاتھ رہ گیا محو، میں رکھ اپنے دلِ زار پہ ہاتھ
میری اور اس کی عجب ڈھب کی کنایت[1] ہوئی کل میں جو گھورا تو رکھا اُس نے بھی تلوار پہ ہاتھ
کوچۂ زلف میں دل بھٹکے ہے یوں، جوں شبِ تار کور رکھتا ہوا جاوے کہیں دیوار پہ ہاتھ
بے ادائی کو میں دیکھ اُس کی موا جاتا ہوں بہلہ[2] جس وقت رکھے ہے کمرِ یار پہ ہاتھ
میرے قاتل کی تسلی نہیں ہوتی ہرگز جب تلک صاف وہ کرتا نہیں دو چار پہ ہاتھ
ہاتھ اُسی کے ہے مری موت، میں سمجھا تھا تبھی اُس نے جب اپنا رکھا تھا لبِ سوفار پہ ہاتھ
انگلیاں ہو گئی ہیں میری حنائی، میں نے رکھ دیا تھا جو کہیں دیدۂ خوں بار پہ ہاتھ
مارے بیتابی کے سو رخنے ہوا ہے، صیاد کیوں نہ رکھے قفسِ مرغِ گرفتار پہ ہاتھ
مصحفی بس کہ سلیماں کا نشیمن ہے بلند
رکھ کے دیکھے ہے اُسے مہر بھی دستار پہ ہاتھ

312

دل میں ٹکرا کے میری آہ سے آہ، جا لڑے ہے تری نگاہ سے آہ
کوئی عاشق تو واں اسیر نہ ہو نکلے ہے اُس گلی کے چاہ[3] سے آہ

1۔ کنایت = اشارہ 2۔ بہلہ = گاڑی میں سوار کرنے والا 3۔ چاہ = کنواں

داد خواہی کو روزِ محشر بھی نکلی اُس کے نہ داد خواہ سے آہ
موجِ دریا سے لے کے تا مہِ نو کرتے ہیں اُس خمِ کلاہ سے آہ
دیکھ کر اُس کے گورے پنڈے کو نکلے ہے آسماں پہ ماہ سے آہ
آوے مسجد میں گر نماز کو وہ نکلے ہر شیخِ خانقاہ سے آہ
روزِ ہجراں میں تیرے عاشق کی تیرہ تر ہے شبِ سیاہ سے آہ
جب وہ گرمِ خرام ہوتا ہے اُٹھتی ہے مثلِ گرد، راہ سے آہ
مصحفی اُس کی زلفِ خم در خم
الجھے ہے مجھ سے بے گناہ سے، آہ

313

اور ہی[1] اپنا مجھے عاشقِ بے جان سمجھ مان کہنے کو مرے، اے بتِ نادان سمجھ
یار کا گوشۂ داماں جو مرے ہاتھ آیا پھاڑ ڈالا میں اُسے اپنا گریبان سمجھ
اپنے عاشق کے تئیں خوار نہ کر اتنا بھی قدر انسان کی کر، تو بھی ہے انسان سمجھ
صبح ہوتے ہی میں اُٹھ کر کے چلا جاؤں گا رات کی رات گھر اپنے مجھے مہمان سمجھ
چشم پوشی سے فلک کی میں نہ ہوں کیونکر داغ خوار رکھتا ہے مجھے بے سر و سامان سمجھ
دل کھٹکنے جو لگا رات مرے پہلو میں کھینچ کر پھینک دیا میں اُسے پیکان سمجھ
مصحفی آصف اگر آصفِ دوراں ہے تو تو
اِس زمانے میں سلیماں[2] کو سلیمان[3] سمجھ

314

جھانک لیتے تھے کبھی روزنِ دیوار کی راہ دیکھیں کیا نکلے ہے اب یار کے دیدار کی راہ
آہ صیاد نے ہر چاکِ قفس بند کیا تا نہ اتنی بھی رہے مرغِ گرفتار کی راہ

1۔ اور ہی = دوسری طرح کا (روزمرہ) 2۔ شہزادہ سلیماں شکوہ 3۔ یعنی سلیمان پیغمبر علیہ السلام

کھولتی کیوں نہیں آ کر مری چھاتی کے کواڑ　　میں تو کچھ بند نہیں کی، تری تلوار کی راہ
کیوں کے تسبیح سے زاہد کو مسلماں کہیے　　اِس کے دانوں میں تو ہے رشتۂ زنار کی راہ
تیرے پیکاں نے پیا تھا جو لہو عاشق کا　　آخرش سب وہ ہلوکا[1] لبِ سوفار کی راہ
ہجر میں اس کے میں جاگوں ہوں یہاں تک کہ مدام　　خواب دیکھے ہے مرے دیدۂ بیدار کی راہ
منھ اُٹھائے میں دوانہ سا چلا جاتا ہوں　　نہ بیاباں کی سمجھتا ہوں، نہ کہسار کی راہ
اُمڈے ہے مصر میں نظارۂ یوسف کو جو خلق　　ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ رہے ہیں، بند ہے بازار کی راہ

مصحفی رات جو نالے میں کیے گرما گرم
اک غزل اور چھڑی آہِ شرر یار کی راہ

315

قیس و فرہاد پہ آساں ہوئی کہسار کی راہ　　باتوں باتوں میں کٹے جیسے کہ دو یار کی راہ
صدمہ کیا جانیے کیا دل پہ ہوا بلبل کے　　متصل قطرۂ خوں ٹپکے ہے منقار کی راہ
کوئی دل سوختہ قیدی ہے مگر زنداں میں　　کہ نکلتا ہے دھواں رخنۂ دیوار کی راہ
بسکہ ہے تازہ خریدار کا خواہاں وہ صنم　　شب کو نت گھر سے نکل پوچھے ہے بازار کی راہ
کیا ہوا، شام سے در میں نے اگر بند کیا　　تم گر آؤ تو کھلی ہے دلِ بیدار کی راہ
کتنے ناداں ہیں، کہ جو خمر[2] سے مانع ہے ہمیں　　اُس سے ہی پوچھیں ہیں ہم خانۂ خمار کی راہ
بسکہ اب رزق انھوں کا ہے اسی پر موقوف　　مور تکتی ہیں زمیں میں ترے بیمار کی راہ
کھڑکیاں بند ہیں مسدود ہیں روزن سارے　　اُس سے اس پر بھی چلی جاتی ہے دو چار کی راہ

مصحفی ہووے ترا. ہاتھ زمینِ سرسبز
تا موالید[3] کو پہنچے تری گفتار کی راہ

316

رفتہ رفتہ ہوئی کوٹھے پہ جو دلدار کی راہ　　اس نے جی کھینچ لیے رخنۂ دیوار کی راہ

1۔ ہلوکا = اُگل دیا، تھوک دیا　2۔ خمر = شراب　3۔ مولود کی جمع، پیداوار

کفر وہ شے ہے کہ جا ہے ہے جسے ہر کوئی　　میں نے دیکھی ہے رگِ سنگ میں زنار کی راہ

شبِ فرقت میں قلق گھیرے ہے جن کو تجھ بن　　دیکھتے وہ نہیں قاتل تری تلوار کی راہ

خواہشِ وصل میں ہم اتنا کریں کیوں اغراق[1]　　اُس کا انکار بھی ہووے اگر انکار کی راہ

کوئی غرفے سے، کوئی در سے، تجھے جھانکے ہے　　کچھ نکلتی تو چلی ہے ترے دیدار کی راہ

آبِ حیواں تو کہاں تھا، یوں ہی دھوکے دھوکے　　لے گئی دل کو مرے مانگ شبِ تار کی راہ

دیکھ کر حسرتِ مجنوں کو بہت سر پٹکا　　ناقہ لیلیٰ کا جو گزرا کبھی کہسار کی راہ

یاد وے دن کہ میں ہمسایہ تمھارا جب تھا　　شب کو آپ[2] آئے تھے تم پھاند کے دیوار کی راہ

خود بخود دم جو رکا جائے ہے یاں آج مرا　　کس نے روکی ہے خدا جانے وہاں یار کی راہ

مصحفی رو نہ، جو لکھنا ہے سو جلدی لکھ دے
ہووے کھوٹی نہ کہیں قاصدِ دلدار کی راہ

317

دیکھ کر کوچے میں اس کے لاکھوں تربت کی جگہ　　یوں قضا ڈر کر کے بولی، ہے یہ عبرت کی جگہ

گرچہ ہے ہر عضو کا بوسہ ترے شیریں میاں　　لیک ہے کنجِ دہن کچھ زور لذت کی جگہ

بزم میں اُس کی رسائی کوئی ہر سادے[3] کو تھی　　کس طرح آئینہ پہنچا، ہے یہ حیرت کی جگہ

خاک پر کشتے کی اس کے بس کہ ہے انبوہِ خلق　　ہم کھڑے لاحول پڑھتے ہیں زیارت کی جگہ

لولیِ دنیا کے گھر آ کر ہوا جو کتخدا　　خونِ دل اِس نے پلایا اُس کو شربت کی جگہ

کیوں نہ کیجے شکر ہی اُس کے خدنگِ ناز کا　　گو پرو دیا دل، شکایت ہے شکایت کی جگہ

غیر سے ملنا تمھارا کب گوارا ہے ہمیں　　زہر کھا مر جائیے، بس ہے یہ غیرت کی جگہ

حجرۂ تن میں جب آ کر روح زندانی ہوئی　　غیرِ دل کوئی نہ پائی اتنی وسعت کی جگہ

چھوڑ ہم کو نزع میں وہ بے مروت اٹھ گیا　　رات بالیں سے ہماری، ہے یہ حسرت کی جگہ

1۔ اغراق = بہت زیادہ مبالغہ　2۔ آپ = خود　3۔ سادہ = معمولی

بے دماغی سے لکھا ہے خط میں آدھا مصحفی
آگے تو لکھ دے کہ خالی ہے عبارت کی جگہ

318

نہ یار ہے نہ کوئی آشنا ہے میرے ساتھ　خدا کے ساتھ ہوں میں، اور خدا ہے میرے ساتھ
وہ پیچھے پھر کے جو دیکھے ہے جعد کو اپنی　کہے ہے ہائے یہ کیسی بلا ہے میرے ساتھ
میں کیوں کے دل پہ تصدق کروں نہ اپنی جاں　کہ تیرے عشق میں یہ مر گیا ہے میرے ساتھ
ہر ایک زخم میں سو نیش ہوں عجب کیا ہے　زمانہ بر سرِ کاوش رہا ہے میرے ساتھ
وہ دیکھ دیکھ کے کیوں مجھ کو مسکراتا ہے　خبر نہیں مجھے یہ کیا ادا ہے میرے ساتھ
میں بادشاہِ دو عالم ہوں جس طرف جاؤں　طلسمِ سایۂ بالِ ہُما ہے میرے ساتھ
گلی میں اُس کی جو آتا ہے مصحفی دوڑا
میں جانتا ہوں کہ اُس کی قضا ہے میرے ساتھ

319

جاتے تھے دوڑے دوڑے چلے محملوں کے ساتھ　کیا ہم کو یاد آتے ہیں دن منزلوں کے ساتھ
قاتل نے سب کو پھونک دیا رکھ کے آگ میں　آخر کو یہ سلوک کیا بسملوں کے ساتھ
اک دن شبِ وصال جو روزی ہوئی تو آہ　نکلیں ہزار طرح کی باتیں گِلوں کے ساتھ
تلوار کے سوا جو سمجھتے ہی کچھ نہیں　پالا پڑا ہے مجھ کو بھی کن قاتلوں کے ساتھ
کیا ہو کبھی کرو جو قدم رنجہ اس طرف　سنتا ہوں رفتگی ہے تمھیں قاتلوں کے ساتھ
تجھ بن، قلق میں کیا کہوں بیمار کے ترے　نکلا دم اُس کا رات بڑی مشکلوں کے ساتھ
مُو[1] ہی سہی کہیں ہیں جو لوگ اُس کمر کو مو　کس کو دماغ بحث ہے یاں جاہلوں کے ساتھ
اس کی گلی میں قدر ہے کیا، آفتاب کی　پھرتا ہے یہ بھی کاسہ لیے سائلوں کے ساتھ

1۔ مُو = بال

وہ مجھ سے مل چلے تو عجب کیا، قدیم سے ہوتی ہے آئی لاگ دلوں کو دلوں کے ساتھ
مجنوں کی روح محملِ لیلیٰ کے شوق میں پھرتی ہے گرد ہو کے لگی قافلوں کے ساتھ
دل مصحفی کا کیوں کے تڑپ کر نکل گیا
پاٹی تھی اُس کی قبر تو ہم نے سلوں[1] کے ساتھ

320

شانہ جس طرح رہے زلفِ پریشاں میں اُلجھ یوں رہا ہاتھ مرا تارِ گریباں میں اُلجھ
سارباں ناقہ درختوں سے بچا کر لے چل جائے یاں محملِ لیلیٰ نہ مغیلاں میں اُلجھ
طعمۂ[2] چرخ ہوئے پر میں بچا ہوں کچھ یوں ریشۂ لحم رہے جوں بُنِ دنداں میں اُلجھ
مجھ کو ڈر ہے کہ کہیں ضعف سے یہ تارِ نگاہ وقتِ نظّارہ، ترے جائے نہ مژگاں میں اُلجھ
کون سا تیر الگ ہے کہ کہوں اِس کو کھینچ یاں رگِ جان رہی ہے کئی پیکاں میں اُلجھ
کششِ شوق سے کیا دور ہے، گر چلتے وقت جائے دامانِ زلیخا درِ زنداں میں اُلجھ
اُس کی زلفوں سے سروکار ہے کیا میرے تئیں نہ مرے ساتھ صبا، سیرِ گلستاں میں اُلجھ
مصحفی آئے جو یاد اُس کے کھلے بال مجھے
جی گیا اور بھی میرا شبِ ہجراں میں اُلجھ

321

بہزاد لکھ کے دیدۂ خوں بار کی شبیہ لکھ اس کے خوں سے پھر کفکِ یار کی شبیہ
بلبل کی یہ خوشی ہے کہ کھینچے شبیہ کش[3] اک برگِ گل لیے مری منقار کی شبیہ
کیا صید گاہِ عشق کے سمجھے وہ رنگ کو دیکھی نہ جس نے مرغِ گرفتار کی شبیہ
رزمیۂ بہار کا عالم میں کیا کہوں ہے دشتِ کربلا گل و گلزار کی شبیہ
سوزن کے ساتھ جانیو ٹکڑے جگر کے ہیں دیکھو کہیں بہم جو گل و خار کی شبیہ

1۔ سِل = پتھر کے مربع ٹکڑے 2۔ طعمہ = لقمہ، نوالہ، کھاجا 3۔ شبیہ کش = مصوّر

لکھنا کمر کا اُس کی، علاقہ سُرین کے ساتھ   اک مو سے کھینچنی ہے دو کہسار کی شبیہ
مانی تو لیجیو رگِ گل جائے موقلم   نازک ہی کام ہے کمرِ یار کی شبیہ
بکھری لٹوں کا اُس کی یہ عالم ہے دلفریب   ہو جوں اساوری میں کئی مار کی شبیہ
مستقبل[1] اس غزل کو بنا اب تو مصحفی
تا نیم[2] رخ نہ ہو ترے اشعار کی شبیہ

322

لکھنے لگا جو چہرہ کش، اُس یار کی شبیہ   چہرے کی ایک ماہ میں تیّار کی شبیہ
گر ما زدہ کو عشق کے، صیّاد واں بٹھا   ہو جس ورق پہ سایۂ دیوار کی شبیہ
یہ کشتنی ہے کون، کہ مانی نے جس کی ہائے   گردن کے پیچھے کھینچی ہے تلوار کی شبیہ
بالیں پہ جس کی عیسیِ مریم خموش تھا   اغلب کہ تھی وہی ترے بیمار کی شبیہ
رکھتا ہے تیرے حسن کو صانع بہ احتیاط   زیرِ ورق ہو جیسے طرحدار کی شبیہ
صورت کو میری دیکھ کے کہنے لگا وہ شوخ   ہے موکشاں یہ کس کے گنہگار کی شبیہ؟
شوخی سے اُس کے تیر کی کیا ہے عجب اگر   لے دل میں چٹکیاں لب سوفار کی شبیہ
یوسف کو لے گئی تھی زلیخا جو قصر میں ق   تھی ہر طرف کو اُس میں لگی پیار کی شبیہ
پر آفریں ہے ضبطِ پیمبر کو، اُس نے بھی   کیا اُلٹے پانو کھینچی ہے انکار کی شبیہ
اب یاں سے اک شبیہ ستم کھینچ مصحفی
تصویر داں میں رکھ کے یہ تکرار کی شبیہ

323

مانی جو کھینچے مرغِ گرفتار کی شبیہ   چاکِ قفس میں کھینچیو منقار کی شبیہ
جانا نہ میں نے رات کو رات، اور نہ دن کو دن   تب کی درست زلف و رخِ یار کی شبیہ

1۔ مستقبل (بہ فتح با) سامنے نظر آنے والی 2۔ نیم رخ = ایک جانب دکھانے والی تصویر (Profile)

انگلی الگ ہی رکھ کے کوئی لکھ گیا ہے یہ انداز بوسہ پر لبِ سوفار کی شبیہ
گویا کہ بول اُٹھے گی ابھی، کلکِ صنع نے کھینچی ہے اس ادا سے مرے یار کی شبیہ
مانی کے ہاتھ میں نہ رہی پھر عنانِ صبر ق جب اُس سے کھینچ گئی تری تلوار کی شبیہ
پہنچا نہ اس کا ہاتھ برِ دوش تک ہنوز نکلی نہ اُس سے دامن و رفتار کی شبیہ
نقاشِ ناتمام وہیں ہو گیا تمام گردن تلک ہی کھینچ رخِ یار کی شبیہ

لکھ اور بھی غزل اسی صورت کی مصحفی
گر کھینچنی ہے تیرے تئیں چار کی شبیہ

324

مانی تو پہلے لکھ کے شبِ تار کی شبیہ پھر کھینچ دے بغل میں مرے یار کی شبیہ
کیا ہی ادائے جنبشِ سر اُس کی قہر تھی بوسے کی تھی طلب میں جو انکار کی شبیہ
بقراط تب علاج میں ڈالے ہے اُس کے ہاتھ اول منگائے ہے ترے بیمار کی شبیہ
ہو جائے کیوں نہ دست مصور کا رعشہ دار وہ کھینچتا ہے تیرے گنہگار کی شبیہ
مانی گلے میں اُس کے مرا ہاتھ ڈال دے اور نام اُس شبیہ کا رکھ پیار کی شبیہ
کیا چہرہ کش سے چُوک ہوئی یہ جو لکھ گیا رخسار پر مرے ترے رخسار کی شبیہ
اے دل جھجک جو دیکھنی ہے اُس کی، پھینک دے رستے میں اک رسن کو بنا مار کی شبیہ
عاشق کا خوں صدف[1] میں بھرا چہرہ ساز نے جب کھینچنے لگا کفکِ یار کی شبیہ
مانی نے مارے رشک کے زانو بدل دیا زانو پہ میرے لکھ کے سرِ یار کی شبیہ
نظّارہ بازِ حسن کو نقاش مت دکھا آبِ رواں و سبزہ و گلزار کی شبیہ
اس سے تو، از برائے تسلی وہی ہے خوب دکھلاوے گر تو روزنِ دیوار کی شبیہ

دیجے خطاب میر کلاں تجھ کو مصحفی
ہے بے نظیر تو نے جو تیار کی شبیہ

1۔ مصور سیپی کے ٹکڑے کو دوات کے طور پر استعمال کرتے تھے

325

مانی جو کھینچنی ہو تجھے پیار کی شبیہ خمیازہ کش[1] ہی کھینچ مرے یار کی شبیہ
اونچا ہے ہاتھ بھر وہ ورق لوحِ عرش سے جس پر کھنچی ہے ساعدِ دلدار کی شبیہ
ٹھوکر لگے ہے دل کو تماشے میں اُس کے ہائے کیا اس ادا سے ہے تری رفتار کی شبیہ
یوں اختلاط دردلِ شب[2] اُس سے ہے مرا بالیں پہ جیسے خفتہ کے بیدار کی شبیہ
مانی نے جس ورق پہ لکھا مجھ کو اُس پہ ہائے کھینچی پڑی ہوئی ہے رخِ یار کی شبیہ

پیغمبروں کے ساتھ ہے یوں نقشِ مصحفی
جوں صالحوں میں ہووے گنہگار کی شبیہ

326

واں ہوئے عاشق، نہیں جس کُو میں جانے کی جگہ بیٹھنے کی دن کے اور شب کے ٹھکانے کی جگہ
سجدہ کرتے اس نے کیا جانے کسے بسمل کیا کچھ تو لوہو سا پڑا تھا آستانے کی جگہ
بوسہ زن ہے پشتِ لب پر سبزۂ خط ان دنوں کھائیے گر زہر، تو ہے زہر کھانے کی جگہ
گھر کے جاسوسوں نے وہ روزن ہی لپوائے[3] دریغ جس میں کچھ تھوڑی سی تھی آنکھیں لڑانے کی جگہ
خندۂ گل سے وہیں، کہتے ہیں شب بجلی پڑی تھی جہاں مرغِ چمن کے آشیانے کی جگہ
رکھ کے بازو اپنا بیٹھے تھے جو وہ شب پیار سے اب تلک اک درد سا ہوتا ہے شانے کی جگہ
کب سے یہ رکھتا تھا زخمِ تیرِ مژگاں کا خیال دل کو میں نے رکھ دیا اُس کے نشانے کی جگہ

مصحفی مر ہی گیا ہولی کی شب، اُس مہ نے جب
منہ سے آ تا مل لیا بھوڈل[4] لگانے کی جگہ

ی، ے

327

نہ جاؤ کوئی میرے قاتل کے پیچھے وہ قاتل پڑا ہے مرے دل کے پیچھے

1۔ انگڑائی لیتے ہوئے 2۔ دلِ شب = آدھی رات 3۔ لپوانا = بند کرانا 4۔ بھوڈل = گُلال

جو تھے گرم رو، سب وہ آگے نکل گئے　　میں اک رہ گیا ہوں، سو منزل کے پیچھے

یہ کوچے میں اس کے عجب ماجرا ہے　　کہ اک اور بسمل ہے بسمل کے پیچھے

گئے ہم جو محفل میں اس کی، ادب نے　　بٹھایا ہمیں ساری محفل کے پیچھے

یہ لیلیٰ سے کہہ دو کہ اک نوحہ گر سا　　کوئی روتا آتا ہے محمل کے پیچھے

گلی میں تری ہے یہ جوشِ فقیراں　　کہ سائل پہ سائل ہے سائل کے پیچھے

تو اے مصحفی ترک کر اُس کا ملنا
نہ کھو عمر کو ایسے غافل کے پیچھے

328

غم جو اس دل کا درد چُنتا ہے　　کیسے دل ہاتھ پاؤں دُھنتا ہے

بزمِ تصویر ہے طلسمِ جہاں　　کم کوئی یاں کسی کی سنتا ہے

آتشِ غم سے متصل، یارو　　دل نہیں یہ کباب بھنتا ہے

کارگاہِ سخن کا فرق نہ پوچھ　　جیسی جس کی ہے بافت،[1] بُنتا ہے

موجِ دریا پہ طعنہ کرتے ہیں　　بند جامے کے، جب وہ چُنتا ہے

غم لگا مصحفی کو یہ کس کا
جی ہی جی میں پڑا جو گُھنتا[2] ہے

329

ناتوانی کے سبب یاں کس سے اُٹھا جائے ہے
آہ اُٹھنے کی کہیں کیا، دم ہی بیٹھا جائے ہے

نزع میں ہر چند ہم چاہیں ہیں دو باتیں کریں
کیا کریں، مقدور کب ہے کس سے بولا جائے ہے

1۔ بافت = بناوٹ　2۔ گُھنتا (بروزن سنتا) = غم میں گھلنا

آمد و رفت اُن کی یاں ساعت بہ ساعت ہے وہی
کب طبیبوں کا ہمارے سر سے بلوا[1] جائے ہے

جائے رقّت ہے مری حالت تو اب، اے ہم نشیں
پاؤں کیا سیدھے کروں میں، دم ہی اُلٹا جائے ہے

تیغِ ابرو تیرِ مژگاں سب رکھے ہیں سان پر
ان دنوں اُس کی طرف کب ہم سے دیکھا جائے ہے

زخمِ دل سے مجھ کو اک آتی ہے بوے اُنس سی
اُس کے کوچے کی طرف شاید یہ رستا جائے ہے

مصحفی تو عشق کی وادی میں آخر لٹ گیا
اس بیاباں میں کوئی، نادان تنہا جائے ہے؟

330

دل کے نگر میں چار طرف جب غم کی دہائی بیٹھ گئی
سر پہ ہمارے دستِ قضا سے تیغِ جدائی بیٹھ گئی

ہم ہیں فقیر اللہ کے یارو پھر اس کا ہے پریکھا[2] کیا
گر ہم پاس بھی آ کر کوئی بہنی مائی[3] بیٹھ گئی

سن کے ادائے غم کی تیرے صبر و شکیب ہیں بھاگنے پر
پاؤں ٹھہرنے مشکل ہیں، جب دھاک پرائی بیٹھ گئی

اے دل اُس بانکیت[4] سے ہرگز شغل نہ کر تو لکڑی کا
ہاتھ قلم ہے پھر تیرا گر ایک بھی گھائی[5] بیٹھ گئی

1۔ بلوا = ہجوم 2۔ پریکھا = اعتراض، اندیشہ 3۔ بہنی مائی = ماں بہن (روزمرہ)
4۔ بانکیت = لکڑی کے داؤں دکھانے والا 5۔ گھائی = وار

تیغِ جفالی میان سے اپنے، جب اُس جان کے دشمن نے
سر کو جھکا کر اپنے اپنے، ساری خدائی بیٹھ گئی

مصحفی کیا پوچھے ہے دوانے حال صفائے دل کا مرے
تھا تو یہ آئینہ روشن پر اب کائی بیٹھ گئی

331

دشمنِ جان ہوئی اپنی تو یاری تیری
شکل آنکھوں میں لگی ہوتی نہ پیاری تیری

رشک سے اپنے تئیں مار مرے کتنے غریب
غیر کے ہاتھ میں دیکھی جو کٹاری تیری

غم میں کسی دستِ حنائی کے تو روتا ہے دلا
آستیں خون میں ڈوبی ہے جو ساری تیری

کیا نسیمِ سحری باغ سے آتی ہے چلی
آج تو پھولوں سے کچھ گود ہے بھاری تیری

میں نہ رویا شبِ غم کھول کے دل، خوب ہوا
آبرو رہ گئی، اے ابرِ بہاری تیری

دامنِ ابر میں منھ اپنا چھپا جاتی ہے
برق جب دیکھے ہے دامن کی کناری تیری

ہے شبِ وصل کا آغازِ سحر، رو تو دلا
شمع بس رو چکی، اب آئی ہے باری تیری

مصحفی دل کو چھڑا ایسے سے، بس جانے دے
دیکھ سکتے نہیں ہم خواری و زاری تیری

332

سدا فکرِ روزی ہے تا زندگی ہے
جو جینا یہی ہے تو کیا زندگی ہے

چھپا منھ نہ اپنا کہ مر جائیں گے ہم
پری رو ترا دیکھنا زندگی ہے

مجھے خضر سے دو نہ جینے میں نسبت
کہ اُس کی بہ آبِ بقا زندگی ہے

تری بے وفائی کا شکوہ کریں کیا
خود اپنی ہی یاں بے وفا زندگی ہے

اجل کے سوا اُس کی دارو نہیں کچھ
عجب دردِ دور از دوا زندگی ہے

تو گلشن میں رہ، گل یہ کہتا تھا اس سے
ترے دم سے میری صبا زندگی ہے

جنھوں نے کیا ہے دل آئینہ اپنا انھیں لوگوں کی با صفا زندگی ہے
کہاں کی ہوا تک رہا ہے تو ناداں کہ پل مارتے یاں ہوا زندگی ہے
نہ ہم مفت مرتے ہیں کوے بتاں میں کہ مرنے سے یاں مدعا زندگی ہے
تو اے مصحفی گر ہے عاشق، فنا ہو
کہ عاشق کو بعد از فنا زندگی ہے

333

عمرِ پس ماندہ کچھ دلیل سی ہے زندگانی بھی اب قلیل سی ہے
گریہ کرتا ہوں کیا میں نذرِ حسینؑ آنسوؤں کی جو اک سبیل سی ہے
چل دلا وہ پتنگ اُڑاتا ہے ابھی آنے میں اُس کے ڈھیل سی ہے
لوگ کرتے ہیں وصفِ نورجہاں میں نے دیکھا وہ زن تو فیل سی ہے
کس کے مژگاں نے یہ کیا جادو میرے دل میں گڑی جو کیل سی ہے
تو گر آوے شکارِ ماہی کو چشمِ تر آنسوؤں سے جھیل سی ہے
اُس کو صحبت کا گر دماغ نہیں طبع اپنی بھی کچھ علیل سی ہے
دل مرا مصرِ حسن ہے تب تو ندی آنکھوں کی رودِ نیل سی ہے
ہے جو یہ مصحفی کی ہم خوابہ
ہے تو اچھی، پہ کچھ اصیل سی ہے

334

آئے ہے یاد کیا اُسے گلزار رات سے پھڑکے ہے سخت مرغِ گرفتار رات سے
ابروے خم کا کس کی مجھے دھیان بندھ گیا آتی ہے روز خواب میں تلوار رات سے
شاید کسی سے وصل کا وعدہ وہاں ہوا بے چین ہے بہت دلِ بیمار رات سے
بیٹھا رہوں ہوں زانوے پہ سر کو دھرے ہوئے کچھ مجھ کو ہو گیا ہے یہ اسرار[1] رات سے

1۔ اسرار = آسیب (روزمرہ)

منہ کھل گیا ہے زخمِ جگر کا مرے مگر　　جاری بہت ہیں دیدۂ خوں بار رات سے
زلفوں کو اُس کی ہاتھ لگایا تھا میں کہیں　　بیزار ہو گیا ہے مرا یار رات سے
شب خیزیوں کے لطف کو کیا جانیں خفتہ بخت　　بیدار دل ہی ہوتے ہیں بیدار رات سے
اتنا خیالِ زلف سے دل پر ستم نہ تھا　　کیا کیجیے بڑھ گیا ہے یہ آزار رات سے
انجام اس کا دیکھیے کیا ہو کہ مصحفی
ہے بے کلی بہت مجھے دو چار رات سے

335

کپڑے پہن کے آتے ہے وہ ہر زماں نئے　　ہوویں نہ کیوں کے جامے یہاں دھجیاں نئے
لے جادیں کاش اسیرِ قفس کر کے مجھ کو واں　　ہوں جس زمیں پہ باغ نئے، بوستاں نئے
سروِ سہی نہ مجھ کو چھب اپنی دکھا، کہ میں　　دیکھے ہیں تجھ سے سیکڑوں قدکش[1] جواں نئے
یہ تو نے ان سے آتشِ گل کیا کیا سلوک　　باندھے تھے بلبلوں نے ابھی آشیاں نئے
یارب تو اس جہان سے لے چل مجھے شتاب　　ہو جس جگہ زمیں نئی، آسماں نئے
کس کس سے میں فلک زدہ سازش[2] کیا کروں　　رہتے ہیں اُس کے در پہ تو نت پاسباں نئے
مل بیٹھو کوئی دم یہ تکلف کہاں کا ہے　　نا میں ہی کچھ نیا ہوں، نہ ہو تم میاں نئے
کیا جانے کون ان کو لے آیا تھا یاں، کہ رات　　دیکھے میں اُس گلی میں کئی نیم جاں نئے
مطلق وہ سادگی کی ملاقات ہی نہیں　　کچھ ہو گئے ہیں ان دنوں یہ نو خطاں نئے
سارے جہاں سے ان کی جُدی چال ڈھال ہے　　ہیں ہر زمیں پہ مردمِ ہندوستاں نئے
اے مصحفی قسم ہے کہ اردو بے شعر میں
نت چوچلے نکالے ہے تیری زباں نئے

336

اُٹھ کے اب یاں سے کدھر جائے کوئی　　کیا ترے در پہ نہ مر جائے کوئی

1۔ قدکش = نکلتے ہوئے قد کے　2۔ سازش = جان پہچان

بیٹھ کر راہ گزر میں اس کی چاہیئے جی سے گزر جائے کوئی؟
اُس کے کوچے میں جب آوں اے کاش ، میری کرنے کو خبر جائے کوئی
باندھنا نت اُسے پگڑی کو سنوار اِس میں بگڑے کہ سنور جائے کوئی
گو ہے اُس کو کی زمیں جائے ادب جوں صبا کیوں کے اُدھر جائے کوئی
جیسے دنیا سے گئے ہم ناچار اِس طرح سے نہ سفر جائے کوئی
مصحفی دوں میں اُسے خط اپنا
اُس کے کوچے میں اگر جائے کوئی

337

غمِ دل کا بیان چھوڑ گئے ہم یہ اپنا نشان چھوڑ گئے
تیری دہشت سے باغ میں صیّاد مرغ سب آشیان چھوڑ گئے
راہ میں مجھ کو ہمرہاں میرے جان کر ناتوان چھوڑ گئے
نفرت آئی سگ و ہُما کو کیا جو مرے استخوان چھوڑ گئے
چلتے چلتے بھی یہ جفا کیشاں ہاتھ مجھ پر ندان چھوڑ گئے
کسی در پر اُنھوں کو جا نہ ملی جو ترا آستان چھوڑ گئے
سفر اس دل سے کر گئے غم و درد یار سونا مکان چھوڑ گئے
صفحۂ روزگار پر لکھ لکھ عشق کی داستاں چھوڑ گئے
لے گئے سب بدن زمیں میں ہم
مصحفی اک زبان چھوڑ گئے

338

کیا کہیں آہ نہ پوچھو جو مصیبت گزری یار بن ہم پہ شبِ ہجر قیامت گزری
تھا مرے نامے میں مضمونِ تمنا، بھڑکا جس گھڑی اُس کی نظر سے یہ عبارت گزری

بال نوچے، کبھی چہرے کو خراشیدہ کیا ہجر میں اپنی تو یارو اسی صورت گزری
تم تو آئے نہ کبھو عالمِ تنہائی میں عمر گزری تو مری، لیک بہ حسرت گزری
کبھی روئے کبھی پیٹے شبِ تنہائی میں ہم کو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گزری
ہم تو سمجھے نہ، بھلا اور بُرا دنیا کا ہیں بڑے مرد وہی جن کی بہ عبرت گزری
تو جدا مجھ سے ہوا وصل کی شب جس ساعت مجھ پہ اے جان وہی ظلم کی ساعت گزری
یہ نہ دیکھا کہ ہوئے ہجر کے ایام تمام ہم کو دن رات ہی گنتے ہوئے مدت گزری

مصحفی آگے میں کیا جانوں کہ کیا ہووے گا
اب تلک تو مری دنیا میں بہ حرمت گزری

339

عبث تو آشیاں بلبل کا اے صیاد لوٹے ہے
کوئی یوں بھی کسی کا خانۂ آباد لوٹے ہے

خبر کیا ہے تری مژگاں کی سر تیزی کو، اے ظالم
مزے خوں کے ہمارے، نشترِ فصّاد لوٹے ہے

لبِ شیریں نے تیرے دستِ غارت جب سے کھولا ہے
سرِ بازار جا دکّانچہ قنّاد[1] لوٹے ہے

پھنسا ہو جس کا دل گل میں وہ کیا ذوقِ قفس سمجھے
گرفتاری کی لذّت طائرِ آزاد لوٹے ہے

کلہ پوشوں نے یوں غارت کیا اس کشورِ دل کو
کہ جیسے فوجِ شہ آکر 'جہان آباد' لوٹے ہے

خبر خسرو کو کیا ہے مصحفی، وہ وصل میں خوش ہے
کہ کیا کیا ہجرِ شیریں میں مزے فرہاد لوٹے ہے

1۔ دکانچہ = چھوٹی دکان۔ قنّاد = حلوائی

340

چند روزہ دست و پا اپنے نہ تھے آشنا بھی آشنا اپنے نہ تھے

ہاتھ میں تھا غیر کے یہ اختیار عقدۂ بندِ قبا اپنے نہ تھے

دم رکا آتا تھا مارے ضعف کے اپنے نالے غم زدا[1] اپنے نہ تھے

شعر لکھ سکتے نہ تھے ہم، گرچہ یار ہاتھ ساعد سے جدا اپنے نہ تھے

ہم دعا سے بھی اُٹھا بیٹھے تھے ہاتھ کیونکہ یہ دستِ دعا اپنے نہ تھے

روبرو ہر اک کے کر بیٹھے دراز ہاتھ مانندِ گدا اپنے نہ تھے

حرص نے سائل کیا تھا مصحفی
ورنہ یہ عقدے تو وا اپنے نہ تھے

341

از بس کہ مرے دیدۂ حیران میں کچھ ہے
اک آن میں دل کچھ ہے تو اک آن میں کچھ ہے

خالی ہی چلے آتے ہیں ہم سیرِ چمن سے
دامان میں کچھ ہے، نہ گریبان میں کچھ ہے

کیوں مجھ کو ستاتا ہے بھلا، اے غمِ ہجراں
تو دیکھ تو باقی بھی مری جان میں کچھ ہے؟

جادو تو میں کہتا نہیں، پر سمجھوں ہوں اتنا
واللہ تری نرگسِ فتّان[2] میں کچھ ہے

کیوں اتنا ستم کرتی ہے، اے شدت گریہ
حالت بھی مرے دیدۂ گریان میں کچھ ہے؟

1۔ غم زدا = (فارسی مصدر زدودن سے) غم دور کرنے والے 2۔ فتّان = دل ربا، دلفریب

پاتے نہیں کچھ ہم تو، سراغ اُس کی کمر کا
کہہ دے تو ہی اے دل جو ترے دھیان میں کچھ ہے

اے مصحفی مرنے کی مرے سن کے وہ بولا
کیا لگتا ہے مر جانے کو، انسان میں کچھ ہے؟

342

صنعِ مانی ہے نہ کارِ خامۂ بہزاد ہے
دیکھیو اس کو ذرا نقشا ہی یہ بے داد ہے

شور و غل کرتے رہے ہیں تیرے زندانی جہاں
بس دیارِ عشق میں کوچہ وہی آباد ہے

مشتِ پر اُڑتے ہیں بلبل کے ہوا میں ہر طرف
وہ اسیری کی جو محنت تھی، سو یوں برباد ہے

اُڑ کے دیوارِ چمن پر آہ کیوں کر بیٹھیے
ہم کو تا بامِ قفس ہی رخصتِ صیّاد ہے

اُس کے کوچے سے جو اُٹھوائے گئے ہیں ہم بزور
کیا خوشی اُس کو ہوئی ہے، کیا دل اُس کا شاد ہے

بیستوں تک دیکھنا، پہنچے نہ اُس کو چشم زخم
نقشِ شیریں یادگارِ تیشۂ فرہاد ہے

تیغِ ابرو کے یہ کس کی زخم گھرے آئے ہیں
ہر طرف کشتوں میں جو شورِ مبارک باد ہے

قتل کر کے جن کے ہاتھوں کو کیا ہے تو الگ
کہتے ہیں وے کشتے، ہاتھوں سے ترے فریاد ہے

مصحفی کا قتل کرنا اُن کے آگے کیا ہے کام
غمزہ چابک دست ہے، ابرو بھی خود استاد ہے

343

دل نہ دیجے اس کو اپنا جس سے یاری کیجیے
آپ اتنی تو بھلا خاطر ہماری کیجیے

تم کو کیا چاکِ گریباں سے کسی کے کام ہے
جائیے لڑکوں میں، واں دامن سواری کیجیے

جی میں آتا ہے کہ اک دن مار مریے آپ کو
کب تلک گلیوں میں یوں فریاد وزاری کیجیے

مارے تلواروں کے اُتو کردیا[1] سینہ مرا
چاہیے تو اور بھی کچھ دستکاری کیجیے

ہجر کی شب ہم کو یوں کہتی ہے ہنگامِ اخیر
ہو چکی اختر شماری، دم شماری کیجیے

کیا کریں ہم، صبر پر اپنا نہیں کچھ اختیار
ورنہ یوں مجبور ہو بے اختیاری کیجیے

بگڑوے ہے اپنی ہی بات، اُس کا تو کچھ جاتا نہیں
تنگ آکر مصحفی گر بے قراری کیجیے

344

جانے کا نہ لے نام کہ مر جائے گا کوئی
بے درد ابھی جی سے گزر جائے گا کوئی

دھمکاوے ہے کیا تیغ و سپر باندھ کے مجھ کو
ایسا تری اِن باتوں سے ڈر جائے گا کوئی

مدفون مجھے کیجو سرِ راہ چمن میں
تربت پہ مری پھول تو دھر جائے گا کوئی

ہم اس کو ہبوط[2] اپنے ستارے کا کہیں گے
یوں بام پہ چڑھ کر جو اُتر جائے گا کوئی

لاشہ مرا دو پھینک جفا جویوں کی رہ میں
ہاتھ اپنا بھلا صاف تو کر جائے گا کوئی

اُٹھتے تو ہیں یہ مجلسیاں پر میں ہوں حیراں
مجلس سے تری اُٹھ کے کدھر جائے گا کوئی

عاشق ترے دروازے سے مر کر ہی کے ٹلیں گے
جیتا تو کبھی یاں سے نہ گھر جائے گا کوئی

ہم شیشہ دلوں کو تو نہ دم دیجیو اے عشق
دم دیتے ہی جوں شیشہ اُبھر[3] جائے گا کوئی

لکھ بھیجیں گے ہم یاروں کے تئیں حالِ دل اپنا
دلّی کی طرف قاصد اگر جائے گا کوئی

1۔ اُتو کرنا = نشان ڈال دینا، بدھیاں 2۔ ہبوط = نیچے آنا، نزول 3۔ اُبھرنا = پھول جانا

مضمون یہ نامے میں لکھیں گے کہ عزیزاں — تب اُس کی خبر لوگے کہ مر جائے گا کوئی؟

اے مصحفی اُس وقت تو کیا کام کرے گا
دل لے کے اگر تیرا مکر جائے گا کوئی

345

دیکھنا کیسا کہ واں در تک بھی جانا منع ہے — روزنِ دیوار سے آنکھیں ملانا منع ہے

گرچہ ہم رکھتے ہیں تجھ کو جان سے اپنی عزیز — پر ہمیں سر کی ترے سوگند کھانا منع ہے

یہ ستم تو موسمِ گل میں نہ کر اے باغباں — آشیاں بلبل کا اِن روزوں جلانا منع ہے

بیٹھ کر بالیں پہ میری تو نہ رو اے رشکِ شمع — سامنے بیمار کے آنسو بہانا منع ہے

دن جُنوں کے ہیں، نہ یہ تکلیف کر ناصح ہمیں — ان دنوں چاکِ گریباں کا سلانا منع ہے

طاقِ ابرو پر نہ رکھوا دل، لگانے ہیں جو تیر — یعنی قبلے کی طرف رکھنا نشانا منع ہے

آکے بالین پر مری غوغا نہ کر اے شورِ حشر — مجھ کو سونے دے کہ سوتے کا جگانا منع ہے

مر گئے جب ہم تو اُس نے اہلِ زینت سے کہا — اب ہمیں چالیس دن مہندی لگانا منع ہے

خیریت کیا اُس سے پوچھوں میں کہ ہے یہ بزمِ غیر — بیمِ رسوائی سے اس جا ہاتھ اُٹھانا منع ہے

قصد کر کے جن کے ملنے کے تئیں جاتے ہیں ہم — وائے رسوائی انھیں در تک بھی آنا منع ہے

سادگی پر جن کی جی لوٹے ہے اپنا مصحفی
ہائے اُن کو اب تلک مسّی لگانا منع ہے

346

شہادت کی طلب میں نامہ گر اس کو رقم کیجے — تو انگشتِ شہادت چاہیئے پہلے قلم کیجے

نہ اس سے ہو سکے اتنا کہ اب تُرکِ ستم کیجے — نہ اپنے میں یہ طاقت ہے کہ ملنا اُس کا کم کیجے

دل بشکستہ اب سینے سے میرے یوں نمایاں ہے — کہ جیسے ٹوٹے آئینے کے دو ٹکڑے بہم کیجے

نشانِ پا ترا جس سنگ پر ہو، گر وہ ہاتھ آوے — تو تعویذِ مزار اپنا وہی نقشِ قدم کیجے

پری خواں[1] کی لگاوٹ دیکھیو یہ اُن سے کہتا ہے　　"جو فرماؤ تو کچھ پڑھ کر تمھارے منھ پہ دم کیجے"
نہیں سوے کمر جانا مناسب زلفِ پُرخم کا　　پریشاں ہے نہ اس کو راہیِ ملکِ عدم کیجے
خرابی پر کمر باندھے ہے جب وہ غمزہ، کہتا ہے　　"فراغت بت کدے سے کر کے پھر قصدِ حرم کیجے"
نئی یہ رسم تم نے خانہ جنگی کی نکالی ہے　　بگڑیے غیر سے، اور تیغ کو ہم پر علم کیجے
زباں اک شعر کہنے کی خدا نے ہم کو ہاں دی ہے　　اگر ہو دوسری تو کچھ بیانِ سوزِ غم کیجے
اگر پروانہ اُس سے لگ چلے ہے پیار میں آکر　　کہے ہے شمع "میرے بوڑھے چونڈے[2] پر کرم کیجے"

کروں کیا میں یہی اے مصحفی دل مجھ سے کہتا ہے
غزل اک اس زمیں میں اور بھی اب تو رقم کیجے

347

گر اپنے ہاتھ سے خط اُس جفا جُو کو رقم کیجے　　تو پڑھ کر یوں کہے "ہاتھ اس کے کاتب کے قلم کیجے"
ذرا چاکِ قفس تو کھول دیجے موسمِ گل میں　　اسیروں پر نہ اے صیاد اتنا بھی ستم کیجے
دم آنکھوں میں ہے میرا، اُٹھ کے بالیں سے نہ جاؤ جی　　ذرا میں دیکھ لوں تم کو، توقف ایک دم کیجے
تمھاری راہ میں میں نے دل اپنا رکھ دیا اب تو　　کُھندلیے[3] ایڑیوں سے، خواہ پامالِ قدم کیجے
میں درگزرا تمھاری دوستی اور مہربانی سے　　مرے احوال پر اے بندہ پرور بس کرم کیجے
مرے گھر گر وہ آنکلے تو اب کے میں یہ سوچا ہوں　　بٹھا رکھیے بہ زور اس کو بہ وزدی متہم کیجے
یہ جی میں ہے سراپا لا دیجے تجھ کو گہنے سے　　پھر اس کے بعد تجھ سے عشق بازی اے صنم کیجے
نہ دیکھی جیتے جی تو وصل کی صورت، مگر مانی　　یہ ٹھہرا دے کہ ہاتھ اُس کی کمر میں اس کے خم کیجے
اگر پھیلاؤ تم کو دیکھنا ہے دل کے ٹکڑوں کا　　تو سوزن لائیے اور وصل دے اُن کو بہم کیجے
میں رہنے کو نہیں آیا کچھ اس جا، پر یہ کہتا ہوں　　مری خانہ خرابی پر نظر اہلِ حرم کیجے

گلی میں اس کی جاتا ہوں تو مجھ کو وحشتِ طالع
سجھا دے ہے یہی اے مصحفی یاں سے بھی رم[4] کیجے

1۔ پری خواں = عملیات کرنے والا　2۔ چونڈا = سر، چوٹی　3۔ کُھندلنا = مَسلنا　4۔ رم کرنا = بھاگ جانا

348

اک تیغ کے لگتے ہی لگی جان ٹھکانے — اچھا تو ہے لگ جاوے گر انسان ٹھکانے

میں نامِ سفر منھ سے ترے جب سے سنا ہے — اُس وقت سے اپنے نہیں اوسان ٹھکانے

نومید پھرا واں سے، تو قاصد نے کہا لو — یہ خط نہیں لگتا کسی عنوان ٹھکانے

اے دستِ جنوں تیری مدد ہووے تو اب بھی — اک جھٹکے میں لگتا ہے گریبان ٹھکانے

تھی تھوڑی سی کچھ رات، یہ پروانہ کہے تھا — جس وقت لگی شمعِ شبستان ٹھکانے

گہ دوش پہ پڑتی ہے تو گہ طرفِ کمر پر — ڈھونڈے ہے تری زلفِ پریشان ٹھکانے

ہے وصل کی شب، اتنا نہ رو تو کہ لگے آج — محنت تری، اے دیدۂ گریان ٹھکانے

نکلی جو تری تیغِ ستم میان سے کافر — لاکھوں ہی لگے گبر و مسلمان ٹھکانے

الجھا ہے تو کس سے، جو ترے جامے کی پیارے — نے چین[1] ٹھکانے ہے۔ نہ دامان ٹھکانے

آویزہ بنا محملِ لیلیٰ کے جرس کا — صد شکر لگا اب دلِ نالان ٹھکانے

ناخن کو شرائیں[2] پہ مری رکھ کے مسیحا — بولا ''نہیں نبض اس کی تو اس آن ٹھکانے''

اک اور ٹھکانے کی غزل، جی میں ہے لکھیے
اے مصحفی اس وقت ہیں اوسان ٹھکانے

349

یا آئے مرا دل کسی عنوان ٹھکانے — یا اس غمِ فرقت میں لگے جان ٹھکانے

پھر کھینچیو تلوار میاں غصے میں آکر — عاشق کو لگاتی ہے یہی آن ٹھکانے

تھی آتشِ فولاد گداز اپنے جو دل میں — لگتے ہی، لگا تیر کا پیکان ٹھکانے

آتی نہیں بانگِ جرسِ محملِ لیلیٰ — پہنچا ہے مگر قافلہ اِس آن ٹھکانے

وہ بت نظر آیا ہے مجھے نامِ خدا ہائے — دیکھے سے رہے جس کے نہ ایمان ٹھکانے

1۔ چین = سِلوٹ 2۔ شرائین (شریان کی جمع) نس، نبض

کچھ دشتِ بلا سے نہیں کم عشق کا کوچہ اس کُو میں لگے سیکڑوں انسان ٹھکانے

ہو بیکلی اتنی نہ تجھے ہجر کی شب میں کل آئے[1] جو تیری دلِ نالان ٹھکانے

اُٹھتے ہی ترے ہوش وحواس اپنے ہوئے گم تو بیٹھے تو آویں مرے اوسان ٹھکانے

پھاڑ اُس کے ورق اُن نے پتنگ اپنا بنایا ق اچھی لگی سعدی کی ''گلستان'' ٹھکانے

اُس طفل کے ہاتھوں سے نہیں دور جو یوں ہی میرا بھی لگا دیوے وہ دیوان ٹھکانے

اے مصحفی اس زلف میں لاکھوں کو ملی جا

لیکن نہ لگا اک یہ پریشان ٹھکانے

350

پوشیدہ میں اُس سے جو کہیں راہ نکالی تو غیر سے اُس نے بھی وہیں راہ نکالی

جیسے کوئی کھودے ہے سُرنگ، اس کی طرف کو میں گور میں بھی زیرِ زمیں راہ نکالی

آمد شدِ ہر لحظہ پھر اُس کوچے میں کیا ہے اغیار نے گر تجھ سے نہیں راہ نکالی

جانے لگی افلاک پہ سینے سے نکل کر کیا تو نے یہ اے آہِ حزیں راہ نکالی

اغیار کو بوسے دیے، پھر کیو نکے نہ لوں میں تو نے ہی یہ اے زہرہ جبیں راہ نکالی

آنسو طرفِ خاک گئے ہجر کی شب میں نالے نے سوے عرشِ بریں راہ نکالی

جو مصحفی کعبے سے پھرا، پھرتے ہی اُس نے

با راہبِ بت خانہ نشیں راہ نکالی

351

اُن کے ہاتھوں سے کئی دل کے نشانے لگ گئے تیر مژگاں کے ترے اکثر ٹھکانے لگ گئے

گر کہا ہم کو کسی نے اُس گلی میں خاک اُٹھا بس کہ دیوانے تھے ہم ووں ہی اُٹھانے لگ گئے

بس کہ ہوتے ہی جدا تیرے، گئی صحبت بگڑ غم لگا کھانے ہمیں، ہم غم کو کھانے لگ گئے

1۔ کل ٹھکانے آنا = پریشانی سے نکلنا، نارمل حالت میں آنا

دشمنِ راحت ہوئے ہیں بس کہ تیرے آشنا　آنکھ ٹک جھپکی کہ بس ووں ہی جگانے لگ گئے
چپ رہے بھی تو نہیں بنتی ہے، پھر کیا کیجیے　جوں کہا کچھ میں نے وہ آنسو بہانے لگ گئے
وائے قسمت قاصد اس کوچے سے آتا ہے ہنوز　لگ گیا کیا اُس کا دل، جو واں زمانے لگ گئے
نجد سے مجنوں جو آیا کوچۂ لیلیٰ میں رات　دیکھیو کیسے اُسے اپنے بگانے[1] لگ گئے
دیکھنا کیسا میں ڈھکاتا ہوں تجھ کو اس گھڑی　ہاتھ میرے گر تری سمرن کے دانے لگ گئے

مصحفی گویا کہ اُن کا تھا بڑا تقصیر وار
گھر سے جو نکلے تو بس تیغ آزمانے لگ گئے

352

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے　چوکے یہی، کہ واں سے نہ دامن اُٹھا چلے
اُنگلی رکھی نہ ناز سے نقشِ مراد پر　آئے دکھانے فال، انگوٹھا دکھا چلے
لیلیٰ بھی سیرِ باغ کو ہوتی نہیں سوار　ناقے کے آگے آگے نہ جب تک صبا چلے
مہمانِ تیغ و تیر ہوئے اُس گلی میں ہم　مہمانی[2] اپنی کھانے جو آئے تھے کھا چلے
بلبل کے مشتِ پر بھی اُڑا دو تو سیر ہے　غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اُڑا چلے
نالے تو ہم نے وادیِ غربت میں سر کیے　پر خفتگانِ خاک کو ناحق جگا چلے
اُٹھنے لگے جو وے مری بالیں سے وقتِ نزع　نکلا یہی زبان سے آہستہ "کیا چلے؟"
کیا تھا خزاں میں باغ کے آنے سے ہم کو کام　آئے تھے، آشیانے کو اپنے جلا چلے
یا رب یہ مصحفی کی دعا ہے کہ آج کل　ق　مشرق سے ایک بار کچھ ایسی ہوا چلے
جو خود بہ خود سپہر پہ چڑھ مثلِ آفتاب　مغرب[3] زمیں کو تختِ سلیماں چلا چلے

353

چشم اُس کی مرا کیونکے دلِ زار سنبھالے　بیمار کو کس طرح سے بیمار سنبھالے

1۔ بگانے = بیگانے (روزمرہ)　2۔ مہمانی = دعوت (عوامی)　3۔ مغرب زمیں سے یہاں دلّی مراد ہے

میں دوڑ کے لگ جاؤں ہوں ظالم کے گلے سے جب تک کہ نزاکت سے وہ تلوار سنبھالے
گر آپ نہ سنبھلے کمر اُس کی تو نہ سنبھلے دامن کو تو لیکن گہِ رفتار سنبھالے
وہ بام پر آیا تھا مگر صبح، جو خورشید دیکھے تھا طرف اُس کی ہی دستار سنبھالے
بیتابی کی حالت ہے عجب اُس پہ، تو صیاد کیوں کر قفسِ مرغِ گرفتار سنبھالے
کیا فائدہ رہنے کا ہے اُس باغ میں بلبل جس باغ میں نت دامنِ گل خار سنبھالے
سنبھلیں نہ بتاں دیکھ کے پھر اُس کی پھبن کو گر آپ کو ٹک بھی وہ طرح دار سنبھالے
یوں ہاتھ اس ابرو کا ہے خم چشم پہ تیری جس طرح کسی مست کو ہشیار سنبھالے

شب چُور جو تھا مصحفیِ خستہ نشے میں
میخانے سے لائے اُسے دو چار سنبھالے

354

جن دنوں تھی دل سے ہم پر مہربانی آپ کی
ہم لیے پھرتے تھے ہر جاگہ کہانی آپ کی

گھر سے اُٹھ ڈیوڑھی تک آنا بھی تمھیں دشوار ہے
دور پہنچی ہے نہایت ناتوانی آپ کی

کیا چرا کر لے گئی وہ، میں نے دیکھی باغ میں
پاس لالے کی کلی کے سُرمہ دانی آپ کی

گاہ در اور گاہ کھڑکی سے نکل جاتے ہو تم
خوب گھر والوں نے کی ہے پاسبانی آپ کی

دل مرا ہوکر بیا[1] اڑتا ہے اُن کے شوق میں
دیکھ کر ماتھے پہ ٹیکی[2] زعفرانی آپ کی

1۔ بیا = ایک چھوٹا پرندہ جو اپنا گھونسلا بُنتا ہے (Weaver Bird) 2۔ ٹیکی = بندی

تم کرو اخفائے شب باشی تو ہم سے صبح دم
سرخی آنکھوں کی کہے اور سرگرانی آپ کی

جان سے بیٹھے ہیں ہم مایوس اپنی، قہر ہے
چھیڑ چھیڑ اِس وقت یہ غیرت دلانی آپ کی

سر کو دیواروں سے پٹکوں ہوں میں، جب آتی ہے یاد
رکھ کے سر پر ہاتھ وہ سوگند کھانی آپ کی

کام کیا کرتے ہو تم اس بحر میں میاں مصحفی
اور بھی دیکھیں تو ہم جادو بیانی آپ کی

355

چھوڑ دی ہے کب سے میں سوگند کھانی آپ کی
ہے عبث بندے پہ مشفق سرگرانی آپ کی

گرچہ میں عاشق ہوں، تم معشوق ہو، پر کم نہیں
بدگمانی سے مری کچھ بدگمانی آپ کی

وصل کی شب دھینگا مشتی کر کے تم جاتے رہے
زخمِ ناخن رہ گئے تن پر نشانی آپ کی

ہم نہ ٹھہرے ہائے اس بھی کام کے افسوس ہے
غیر کے حصے میں آئی پاسبانی آپ کی

اب تو تہ پوشی[1] کے ٹکڑے میرے ہاتھوں ہو گئے
میں یہ کیا جانوں نئی تھی یا پرانی آپ کی

بعد مدت کے ادھر آ نکلے ہو تم شیخ جیو
جی میں ہے کچھ آج کیجے میہمانی آپ کی

1۔ تہ پوشی = نیچے کا لباس (Underwear)

لطف تب تک تھا کہ جب کچھ بات آئی درمیاں
آپ نے مانی ہماری، ہم نے مانی آپ کی

یاد ہیں وے دن کہ جب ہم تم میں خلطہ[1] تھا کبھو
ہم کو آساں تھی پہیلی بوجھ جانی آپ کی

مائلِ بیداد تم طفلی سے ہو، ہے ہم کو یاد
سینک کے تیر اور وہ ننھی کماتی آپ کی

خضر مل جاوے تو پوچھوں اُس سے میں یوں ہاتھ باندھ
طوقِ گردن کیوں ہوئی یہ زندگانی آپ کی

اب زباں گدّی سے کھڑواتے[2] ہیں اُس کی اہلِ رشک
وصل کے دن جس نے کی تھی ہم زبانی آپ کی

تیر تو تھا ہی ترازو دل میں، لیکن تول تول
قہر ہے اُس بعد یہ برچھی لگانی آپ کی

کچھ کرو میاں مصحفی جلدی سے تم اپنا علاج
کیوں کہ جائے بیم ہے یہ ناتوانی آپ کی

356

منھ چھپا کر آپ جب پردے کے اندر ہوگئے
مر گئے کیا، بلکہ ہم مرنے سے بدتر ہوگئے

بال ماتھے کے پُنے اُس مہ نے جب با صد تراش
سر مُنڈا کر سیکڑوں عاشق قلندر ہوگئے

مَیں نے پرزوں پر گریباں کے لکھا تھا حالِ دل
لوٹ پوٹ آخر کو وہ پُرزے کبوتر ہوگئے

1۔ خلطہ = میل ملاپ 2۔ کھڑوانا = اُکھڑوانا (عوامی)

چڑھ کے کوٹھے پر جو دی شب اُس نے لٹ گیسو کی کھول
بوے خوش سے شہر کے کوچے معطّر ہو گئے

شوخیاں کرتے ہیں کیا کیا ساتھ عارض کے میاں
بال زلفوں کے تمھاری سخت اتبر ہو گئے

دائیں بائیں زخم جو آئے مرے اُس تیغ کے
مرغِ جاں کے واسطے وہ زخم شہ پر ہو گئے

بات ہی کچھ منھ سے نکلی، نے اُٹھے آگے کو پانْو
اُس گلی میں ہم تو کچھ جاتے ہی پتھر ہو گئے

دل میں جو رکھتے تھے تجھ سے عشق بازی کا خیال
دیکھ کر صورت تری وہ لوگ ششدر ہو گئے

اب تو خط آیا، غرور اتنا نہ کیجے حسن پر
سادگی کے تھے جو دن سو بندہ پرور ہو گئے[1]

راہ بن طوقِ کمر کے کھینچ چل سکتے نہیں
دیکھ کر چیتے کمر کو اُس کی لاغر ہو گئے

آنکھوں میں تھے جب تلک اشکوں میں یہ پہنا[2] نہ تھی
منھ پہ کچھ آتے ہی میرے آبی چادر ہو گئے

نزع میں کل دیکھ کر مجھ کو وہ یوں کہنے لگا
''کیا ہوا اِس کو، یہ کیسے اِس کے تیور ہو گئے''

لطف اُس گورے بدن کا کیا کہوں میں وقتِ غسل
پڑتے ہی پانی کے قطرے اُس پہ گوہر ہو گئے

1۔ ہو گئے = گذر گئے (روزمرہ) 2۔ پہنا = وسعت، پہنائی

جن بیابانوں میں وہ اپنا لگا جی ہارنے
خضر کے ہم اُن بیابانوں میں رہبر ہوگئے

کیا خبر ہے تجھ کو ایامِ جدائی میں تری
حادثے کیا کیا نہ میری جان ہم پر ہوگئے

کس کے مژگاں کا تصور جی میں آکر چھا گیا
بال جو یکسر ہمارے تن کے نشتر ہوگئے

سر بہ مُہرِ نامہ کا اَسرار ہم سے کچھ نہ پوچھ
جانتے ہوں گے وہی جو لوگ بے سر [1] ہوگئے

ہم بھی دیکھیں گے یدِ بیضا کرے گا روکشی
آستیں سے اُن کی جس دم ہاتھ باہر ہوگئے

تو جو کہتا تھا کہ میں باہر رہوں ہوں، جھوٹ ہے
ہم تو راتوں کو ترے کوچے میں اکثر ہوگئے

خط کے آتے ہی ترے، یہ دل ہوا زیر و زبر
تھے جو کچھ اوراقِ جمعیت، وہ ابتر ہوگئے

ذبح کرتے تو کیا اُس نے مجھے لیکن وو ہیں
خون کے قطرے گریباں گیرِ خنجر ہوگئے

موتی مالا کا کیا کب اُس پری کی میں نے ذکر
اشک کیوں میرے گلے کا ہار آکر ہوگئے

مصحفی نے یہ غزل از بس کہ لکھی آب دار
اس غزل کے سارے مصرع سلکِ گوہر ہوگئے

1۔ بے سَر = بے حال، بے ہوش

357

مژگاں سے زخم کیا کیا اپنے جگر میں آئے
جب ہم نے اُس کو جھانکا، رخنے نظر میں آئے

تن کر کے لی جو اس نے انگڑائی اک ادا سے
ظالم کے پیچ کیا کیا موے کمر میں آئے

وعدے کی شب جو تھی کل، ہم بیکلی کے مارے
سو بار گھر سے نکلے، سو بار گھر میں آئے

جب حلقہ ہو کے بیٹھے گرد اپنے مہ جبیناں
ہم نے تبھی یہ جانا دورِ قمر میں آئے

جس رہ گزر میں کل ہم روتے ہوئے گئے تھے
پھر آج سر پٹکتے اُس رہ گزر میں آئے

طالع کی یہ مدد ہے اے مصحفی وگرنہ
یہ جامہ زیب کس کے یوں تنگ بَر[1] میں آئے

358

بہ وقتِ بوسہ شدت سے جو لعلِ یار کو ملیے
تو اس دم پیار سے رخسار بھی رخسار کو ملیے

اگر گلگونۂ خوبی کبھی رخسار کو ملیے
تو اک دو اُنگلی مسّی بھی لبِ میخوار کو ملیے

کرو گے قتل تو آخر ہمیں، پر مہربانی ہے
ذرا سا عطر بھی اپنی اگر تلوار کو ملیے

ہوا یوں مضمحل مژگاں سے اشکِ سرخ کا خوشہ
کبھی جوں ہاتھ میں لے دانہ ہائے نار[2] کو ملیے

تمنا اب یہ ہے اپنی، کہ گر زخمی کبھی ہو جے
تو خوں لے لے کے اپنا جامہ و دستار کو ملیے

ابھی رنگِ کفک میں کتنی تحریریں نظر آویں
یہ خوں آغشتہ مژگاں ٹک جو پائے یار کو ملیے

عیاں ہیں عاشقوں پر اس کے جوہر، فائدہ کیا ہے
کسیس[3] اتنا نہ اپنی تیغِ جوہر دار کو ملیے

ہمارے خوں میں بھی اک حسن ہے، معلوم تب ہووے
یہ غازہ لے کے آپ اپنے اگر رخسار کو ملیے

بہ تنگ آیا ہوں بیداری سے اس کی، جی میں آتا ہے
کہ اک شب روغنِ[4] قاز اُس بتِ عیار کو ملیے

اگر دعویٰ کرے وہ تجھ سے ہم چشمی کا گلشن میں
تلے تلووں کے چشمِ نرگسِ بیمار کو ملیے

1۔ بَر = آغوش 2۔ نار = انار (ضرورتِ شعری سے الف گرادیا)

3۔ کسیس = تلوار کو چمکانے کا پاوڈر 4۔ کہتے ہیں روغن قاز خواب آور ہے، غافل کرتا ہے

ہمیں تو دسترس یہ بھی نہیں جو از پے تسکین جبیں سے اپنی لے کر خاکِ پائے یار کو ملیے
ملا چاہوں ہوں مژگاں اس کے میں پائے نگاریں سے یہ سوچوں ہوں کہ کیوں کر تازہ گل سے خار کو ملیے
تسلی مصحفی کے قتل کرنے سے نہ ہووے گی
گلے سے اُس کے ٹک خنجر کی اپنے دھار کو ملیے

359

تیری رفتار سے اک بے خبری نکلے ہے مست و مدہوش تو جیسے کہ پری نکلے ہے
اک فریبندہ ہے تیری روشِ طرزِ خرام اِس کے عہدے سے کوئی کبکِ دری نکلے ہے
کوٹ کوٹ اس میں اثر میں نے بھرا ہے، تو بھی میرے نالے سے وہی بے اثری نکلے ہے
گل کو نسبت ہے اسی واسطے با اہلِ جنوں وضع میں اُس کی جو اک جامہ دری نکلے ہے
زہرِ چشم اُس کے کے کشتے کو جہاں گاڑا ہے قلم اُس خاک سے نرگس کی ہری نکلے ہے
لبِ سوفار تلک ہوتی ہے خوں میں رنگیں اُس کے جب تیر کی سینے سے سری نکلے ہے
اپنے رونے کو کوئی سمجھے تو آئینہ مثال دیدۂ خشک میں آنسو کی تری نکلے ہے
سیدھی ہوتی ہی نہیں چشمِ حیا ناک تری اس کے انداز سے نت کج نظری نکلے ہے
واں سے، جس جا پہ کہ کشتے کا ترے مدفن ہے بھال جو نکلے ہے، لوہو سے بھری نکلے ہے
اشک یوں لختِ جگر لے کے چلا، جوں گھر سے گٹھری کاندھے سے لگائے سفری نکلے ہے
کھول دیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں پا بہ زنجیر نسیمِ سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے
کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

360

ہے طُرفہ ماجرا مرے قاتل کے سامنے بسمل پڑا تڑپتا ہے بسمل کے سامنے
حسرت پہ اُس مسافرِ بے کس کے روئیے جو رہ گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

ہے جب سے رو ادھر ترے پیکانِ تیر کا — دل سامنے ہے اس کے تو وہ دل کے سامنے
افسوس کی جگہ ہے کہ دریاے عشق میں — کیا کیا غریب ڈوبے ہیں ساحل کے سامنے
جا رہیے اُس نگر میں جہاں اچھی صورتیں — بے پردہ ہو کے آتی ہیں سائل کے سامنے
لیلیٰ سے کہہ صبا کہ ذرا جھانک تو سہی — توڑے ہے دم کوئی ترے محمل کے سامنے

اے مصحفی طلسمِ جہاں سے نہ دل لگا
قدر اس کی کچھ نہیں کسی عاقل کے سامنے

361

ٹھوکر تری جب مردۂ صد سالہ جِلا دے — جا کر کوئی اُس دم مجھے عیسیٰ کو بلا دے
اُٹھتا نہیں، پیارے، ترے کشتے کا جنازہ — گو تو نہ اُٹھا اس کو پہ ٹک ہاتھ لگا دے
یہ وادیِ مجنوں ہے حُدی خواں سے یہ کہہ دو — اس جا پہ ذرا ناقۂ لیلیٰ کو بٹھا دے
ساقی سے کہا عشق نے بد یار ہے نوفل — مجنوں کو بچا لے، اور اِسے زہر پلا دے
ہرگز نہ رکھے پیشِ نظر صورتِ شیریں — تصویر تری گر کوئی خسرو کو دکھا دے
ہو عمرِ دراز اُس کے لبِ زخم سے پیدا — قاتل تری تلوار کو جو کشتہ دعا دے
آنکھوں کے مزے لوٹے ہے سرمے کی سلائی — ڈرتا ہوں نہ یہ بات کوئی اُس کو سُجھا دے
بے پردہ شبِ مہ میں جو تو بام پر آوے — خجلت سے فلک ماہ کو پردے میں چھپا دے
تلوار علم کرنے کی حاجت نہیں، قاتل — ہم سر سے گزر جاویں گے، تو ہاتھ اُٹھا دے
ڈر ہے یہی پیارے تری رفتار سے مجھ کو — یہ خوابِ عدم کے تو نہ سوتوں کو جگا دے

اے مصحفی کیا تو نے پری شعر پڑھے ہیں
اب غیرِ سلیماں تجھے کون اس کا صلہ دے

362

سچ ہے جی، عشق کا بیمار برا ہوتا ہے — دل کا آزار بھی آزار بُرا ہوتا ہے

یوں تو ہوتے ہیں سبھی چیز کے سائل مُبرم[1] لیک بوسے کا طلبگار بُرا ہوتا ہے
ہجر کا کچھ مجھے اندیشہ نہیں اتنا، پر یہ اندھیرا سا شبِ تار، برا ہوتا ہے
جی ہی لے جائے ہے فریاد و فغاں کے کرتے دامِ الفت کا گرفتار برا ہوتا ہے
تم نہ اس سودے میں آؤ کہ حسینوں کے تئیں بیٹھنا بر سرِ بازار برا ہوتا ہے
جس نے دیکھا تجھے قبضے پہ دھرے ہاتھ، کہا ہائے اِس وضع کا خوں خوار برا ہوتا ہے
اس کا پینا نہیں مقدور ہر اک کا ساقی عشق کا ساغرِ سرشار برا ہوتا ہے
سن نہ صیاد تو اس کو کہ خفا ہووے گا نالۂ مرغِ گرفتار برا ہوتا ہے

آپ کو مار ہی مرتا ہے، میں دیکھا ہے بہت
مصحفی عاشقِ ناچار برا ہوتا ہے

363

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے، کبھو آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچے میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

گئے باغ میں کسی گل تلے، تو وہاں بھی اپنا نہ جی لگا
لے بہ رنگِ غنچہ جمائیاں، تجھے یاد کر کے چلے گئے

کہیں غش میں تھا میں پڑا ہوا، سنو اور قہر کی بات تم
مجھے دیکھنے کو جو آئے وہ تو بگڑ سنور کے چلے گئے

کروں مُو و زلف کا کیا بیاں، کہ عجیب قصہ ہے درمیاں
یہ ادھر کو سینے پہ آ رہی، وہ اُدھر کمر کے چلے گئے

اب انیس ہے نہ جلیس ہے، نہ رفیق ہے نہ شفیق ہے
ہم اکیلے گھر میں پڑے رہے، سبھی لوگ گھر کے چلے گئے

یہ عجب زمانے کی رسم ہے کہ جنھوں پہ مرتے تھے ہم سدا
پسِ مرگ آ، وہی خاک میں ہمیں آہ، دھر کے چلے گئے

1۔ مُبرم = اصرار کرنے والے

چڑھے کوٹھے پر تو تھے مصحفی، پہ نہ داؤ پر وہ مرے چڑھے
میں چڑھاؤں جب تلک آستیں، اُٹھے اور اُتر کے چلے گئے

364

ادھر تو رقص میں دامن ترا اُچھلتا ہے — اِدھر بغل میں مری، دل پڑا اُچھلتا ہے
یہ سنر بُریدوں کی حالت ہے اس کی مجلس میں — کہ ایک تڑپے ہے تو دوسرا اُچھلتا ہے
کبھی جو ہووے ہے اس دل کو وجد، کہتا ہوں — سرک پرے، مرے پہلو میں کیا اُچھلتا ہے
اگرچہ گرم ہو حالت[1] میں، شیخ صاحب تم — سپند بزم میں لیکن بلا اُچھلتا ہے
یہ جَست و خیز ہے خونِ شہیدِ الفت میں — کہ مثلِ برق بہ روے بلا اُچھلتا ہے

نہ زیرِ تیغ کرو اس کے، مصحفی کی تلاش
کب ایسے گھاٹ کا ڈوبا ہوا اُچھلتا ہے

365

مژگاں ہے مری چشمِ گہر بار کی ٹٹی — اشکوں نے بنائی ہے یہ بوچھار کی ٹٹی
ہیں شانے میں قطرے عرقِ زلفِ سیہ کے — یا ہے یہ چراغانِ شبِ تار کی ٹٹی
یہ تو نے بڑا ظلم کیا مجھ پہ چھپر بند[2] — جالی کی بنائی تھی درِ یار کی ٹٹی
برسات میں، ہمسایہ ہوا جب سے میں اُس کا — ہر روز نئی لگتی ہے دیوار کی ٹٹی
پردے کا تمھیں شوق نہیں، ورنہ جو چاہو — دو پیسے کو مول آتی ہے بازار کی ٹٹی
مہندی کے درختوں کو دِرو[3] کیونکے نہ کیجے — بڑھ بڑھ کے یہ ہو جاتے ہیں گلزار کی ٹٹی
پردے میں شکار اس کے یہ کھیلے ہے شب و روز — داڑھی تو ہوئی زاہدِ مکار کی ٹٹی
تھا منتظر آنے کا میں کس کے کہ سحر تک — مژگاں نے نہ دی دیدۂ بیدار کی ٹٹی

1۔ حالت = سماع میں وجد و حال کی کیفیت 2۔ چھپر بند = چھپّر چھانے والا کاریگر
3۔ دِرَو کرنا = کاٹنا

اے مصحفی پردہ نہیں کچھ میرے اور اُس کے
دھوکے کی سی ہے یوں ہی پندار کی ٹٹی

366

عیسیٰ کو ان لبوں کی گفتار مار ڈالے
رستم کو ابروؤں کی تلوار مار ڈالے

بلدار پھینٹے والے[1] یک بار مار ڈالے
خونیں نگہ نے اُس کی خونخوار مار ڈالے

فرقت میں رات اور دن مرنا پڑا ہے ہم کو
اے کاش، اس سے کوئی اک بار مار ڈالے

فرہاد سے ہزاروں اس عشقِ نیزہ کش نے
لے جا کے سوے دشت و کہسار مار ڈالے

قتلِ جفا نصیباں آساں ہوا ہے اُس کو
جس وقت تیغ کھینچی دو چار مار ڈالے

دن رات جب وہ گھر میں رہنے لگے اُسی کے
عاشق کو کیوں نہ رشکِ اغیار مار ڈالے

باز آنے کا نہیں میں چاہت سے اُس کی ہرگز
گو مجھ کو آرزوے دیدار مار ڈالے

ہونے سے جن کے ہم کو اک زیست کا مزہ تھا
سو گردشِ فلک نے وہ یار مار ڈالے

تھے مرغِ نامہ بر کی جو نسل سے کبوتر
سو رفتہ رفتہ اُس نے سب مار مار ڈالے

ایدھر بھی ٹک گزر کر، اے شوخ مصحفی کو
شاید تری اداے رفتار مار ڈالے

367

دشنام پاسباں کے دو چار کھا کے آئے
آخر ہم اُس گلی سے خفت اُٹھا کے آئے

یا صرف سادگی تھی یا اب ہے یہ لگاوٹ
جب سامنے وہ آئے، سرمہ لگا کے آئے

کھینچا جو رات میں نے اُن کے تئیں بغل میں
آئے تو ڈھب پہ لیکن، کیا کسمسا کے آئے

مجلس میں ہم گئے تھے اُس شوخِ بے وفا کی
افسانہ کہہ کے اپنا اس کو رُلا کے آئے

دیدار کی نہ نکلے تا دل سے میرے حسرت
گر خواب میں بھی آئے، تو منھ چھپا کے آئے

قطرہ عرق کا اُن کے جس خاک پر گرا تھا
اُس خاک پر ہم اپنا لوہو بہا کے آئے

یہ نیچی آنکھیں ان کی بے وجہ ہی نہیں ہیں
نظروں سے یہ کسی کو شاید گرا کے آئے

1۔ بلدار پھینٹے والے = بانکے

تلوار ہی کے نیچے، ہم کو رکھا غضب نے جب سامنے وہ آئے تیوری چڑھا کے آئے

تربت کا مصحفی کی باقی کچھ اک نشاں تھا
سو آج وہ نشاں بھی تم تو مٹا کے آئے

368

یوں جو چاہو تو کرو کم نگہی لیک منہ پھیر نہ لو، یہ نہ سہی

راست پوچھو تو میاں تم پہ ہے ختم کج روی، کج نگہی، کج کلہی

جوں نگیں دستِ دبیراں[1] سے مجھے نہ ملا خاک بہ جز روسیہی

اس کے ساعد کا جو پوچھا احوال بات کچھ گول سی قاصد نے کہی

کیا ہوا تجھ کو جو ان روزوں میں
مصحفی وہ تری ہیئت نہ رہی

369

اشک کا صرفہ[2] کر کر و کشتے کی اپنے لاش سے چھڑکو ذرا گلاب تو اُس پہ گلاب پاش سے

زخم پہ زخم متصل، آئے ہیں بس کہ ہجر میں سینہ ہے لوحِ مشقِ خوں ناخنوں کی خراش ہے

طعنِ ملامت اب کوئی خلق کے کب تلک سہے دشت ہے ہم کو تو بھلا، شہر کی بود و باش سے

گر کوئی اُس کے کوچے میں دیکھے ہے آ اِدھر اُدھر دل میں ہزاروں وسوسے گزریں ہیں اس تلاش سے

آب کی جا گہ دم بہ دم پیتے ہیں بیٹھے خونِ دل گر ہے یہی معاش تو، گزرے ہم اس معاش سے

پٹھوں کی گر ہے یہ ادا قلموں کی گر ہے یہ صفا مارے پڑیں گے سیکڑوں آپ کی اس تراش سے

جامہ کتاں کا بر میں ہے، اس مہِ چاردہ کے آج ماہ سفید ہووے گا دیکھیے کس قماش سے

گو ہے زمین سنگلاخ، ایک غزل تو اور کہہ
ہاتھ اُٹھا نہ مصحفی تو تو ابھی تلاش سے

1۔ دبیر = دفتر کے کارندے، منشی 2۔ صرفہ = بخل، کنجوسی

370

ملنے کا کچھ بھی ڈھنگ ہے اُس بتِ بدمعاش سے
تیر سوا اس خراش سے، تیغ سوا بس تراش سے

لایا نہ میرے گھر کبھو، از رہِ لطف یار کو
اتنی نہ ہو سکی تلاش چرخِ ستم تلاش سے

وقت اُنھوں کا خوش، جو لوگ آئے نہ اُس گلی میں پھر
منھ کو چھپا کے مر گئے غیرتِ دور باش سے

شستگیِ لباسِ یار دیکھ کے رات چاندنی
آگ پہ لوٹتی رہی، لیک گئی قماش[1] سے

تیغ ترنج کا سماں حسن سے اُس کے ہے عیاں
کیوں نہ تراشیں انگلیاں یار قلم تراش سے

سر بھی کٹے پہ تجھ سے ہم کرتے معانقے کا قصد
ہوتے جدا نہ گرمیاں ہاتھ ہمارے لاش سے

کس کے حنائی ناخن آہ، دیکھے ہیں میں نے مصحفی
آتی ہے بوئے خوں ہنوز نالۂ دل خراش سے

371

دل کا سراغ میں کیا سینۂ پاش پاش سے
بارے ملا تو دل مجھے لیک بڑی تلاش سے

ڈر ہے کہ ہو شکستہ دل ناز کی دور باش سے
پہنچی ہے اُس کمر تلک، زلف بڑی تلاش سے

جس کے تئیں خبر نہ دوں اپنی میں بود و باش سے
کام بھلا وہ پھر رکھے میری ہی کیوں تلاش سے

شوخی تو دیکھیو کہ میں، غش سے جو آنکھیں کھولیاں
اُس نے چھڑک دیا گلاب، پھر بھی گلاب پاش سے

ہاتھ میں لے کے تیرا ہاتھ، تجھ کو لکھاوے جب ادیب
کیوں نہ میں کاٹوں انگلیاں اس کی قلم تراش سے

1۔ قماش = کپڑا

سایۂ تیغ میں گزر کس کی بھلا ہوئی کبھو
کرتے ہیں سرگزشتہ[1] لوگ زندگی اس معاش سے

کس کا یہ قتل گاہ ہے جس میں ہزار کشتے ہیں
اور مناسبت نہیں لاش کو ایک لاش سے

دارِ شفا کے حجرے آج خالی پڑے ہیں جا کے دیکھ
یعنی جو تھے ترے مریض، اُٹھ گئے ہیں فراش[2] سے

آتے ہی بزم میں مری، مانگا جو اس نے گنجفہ
جی کی گیا میں اُس کے بوجھ بات ہی کے قماش[3] سے

کس کی مژہ کا ہے خیال دل میں مرے کہ مصحفی
آمد دم بھی اِن دنوں خالی نہیں خراش سے

372

گرم روانِ قافلہ خوش رہو تم تلاش سے
اپنا تو لگ گیا ہے جی شہر کی بود و باش سے

لاکھ دکھائے اپنی سج روز نئی تراش سے
کوئی لگے ہے ماہِ نو زین کی اُس کی قاش سے

عشق میں ہم ترے میاں، دونوں جہاں سے جا چکے
فکر نہ کچھ معاد[4] کی، کام نہ کچھ معاش سے

حسرتِ تیر میں ترے دیوے ہے کیا وہ اپنی جاں
دم جو ترے مریض کا نکلے ہے اس خراش سے

بر سرِ نعشِ مصحفی اس کو چھڑکنے جب لگے
جھڑ پڑے اشکِ خوں کئی چشمِ گلاب پاش سے

1۔ سرگذشتہ = جو سر سے گذر جائیں، سرتسلیم خم کردیں　2۔ فراش = بستر
3۔ قماش = وضع، طریقہ　4۔ معاد = آخرت

373

اُس کے لہرانے میں چال آئی نہ مطلق سانپ کی
موجِ دریا کرتی ہے تقلید ناحق سانپ کی

باندھ لائی اُس کو رشتے میں تری جعدِ سیاہ
گرچہ تھی پتال[1] میں چوٹی معلّق سانپ کی

یوں لگی، جب میان سے نکلی وہ تیغِ آب دار
کیچلی چھوڑے پہ ہو جوں اور رونق سانپ کی

زلف و خط میں فرق اک مو بھی نہیں، ہے تو یہ ہے
شکل ہے کالے کی وہ، یہ صورت ازرق[2] سانپ کی

ہے نشاں موذی گری کا دکھنیوں[3] کے ہاتھ میں
تب تو فوج اُن کی لیے پھرتی ہے بَیرق[4] سانپ کی

کیوں نہ قسمت میں عدو کی ہو گزند اس کا کہ صاف
نوکِ نیزہ سے تری صورت ہے مشتق[5] سانپ کی

دیکھ کر شانہ تری چوٹی کو سر پٹکا کیا
آخرش شانے نے کھودی جان ناحق سانپ کی

اس درازی سے جو بڑھ آئے ہیں وہ ایڑی تلک
ہے مگر بالوں میں اُس کے نسل ملحق[6] سانپ کی

مصحفی انصاف اس کا راجا باسک سے تو چاہ
کہہ سکے ہے کب غزل ایسی فرزدق[7] سانپ کی

374

بے لاگ ہیں ہم، ہم کو رکاوٹ نہیں آتی
کیا بات بناویں کہ بناوٹ نہیں آتی

ہے دھیان لگا در کی طرف، پر کئی دن سے
کانوں میں ترے پانو کی آہٹ نہیں آتی

دندانِ ہوس سے اُسے مسلا ہے کسو نے
بوسے سے تو لب پر یہ نلاہٹ[8] نہیں آتی

کاجل نے تری آنکھوں میں جو لطف دیا ہے
ہر ایک کے حصے یہ گھلاوٹ نہیں آتی

کیا جامۂ چسپاں کا ترے وصف کروں میں
تقریر میں کچھ اِس کی سجاوٹ نہیں آتی

ہے رنگ سیاہی لیے جوں اُس کی حنا کا
ہاتھوں پہ ہر اک کے یہ اُداہٹ[9] نہیں آتی

1۔ پتال (پاتال) زمین کو تہ 2۔ اَزرَق = گہرا نیلا 3۔ دکھنی = مرہٹے 4۔ بیرق = جھنڈا
5۔ مُشتَق = بنی ہوئی 6۔ ملحق = وابستہ، ملی ہوئی 7۔ فرزدَق = عہد بنی امیہ میں عربی کا مشہور شاعر
8۔ نلاہٹ = (نیلاہٹ) نیلاپن (عوامی) 9۔ اُداہٹ = سیاہی مائل تیز رنگ

اے مصحفی بیٹھے ہیں ہم اُس بزم میں خامش
کیا بات بناویں کہ بناوٹ نہیں آتی

375

جلتا ہے جگر تو چشم نم ہے — کیا جانے یہ کس کا مجھ کو غم ہے
جاوے تُو کنشتِ دل میں ہو کر — تو کعبے کی راہ دو قدم ہے
دیکھے ہے وہ دھکدھکی میں جب سے — تب سے مرا دھکدھکے[1] میں دم ہے
تصویر تو اُس کی زلف کی دیکھ — نقاش یہ چین کا قلم ہے
گر دیدۂ غور سے تو دیکھے — ہستی جسے کہتے ہیں عدم ہے
اتنے جو ہوئے ہیں ہم بد احوال — یہ حضرتِ عشق کا کرم ہے
ہر چند اس کی ہے ہر ادا شوخ — ق — منظور اپنا جو اک صنم ہے
پر دانتوں تلے زباں دبانا — بیداد ہے، قہر ہے، ستم ہے

سمجھو نہ فقیر مصحفی کو
یہ وقت کا اپنے محتشم[2] ہے

376

پُر ہے اک شہر ترے حسن کے آوازے سے — خوبرو خود ہے تو بس ہاتھ اُٹھا غازے سے
اپنی مسکی ہوئی چولی کا ذرا رنگ تو دیکھ — یہ ستم ان پہ ہوا ہے ترے خمیازے سے
خونِ دل سے تو نہ پہنچی ہو طراوت[3] اِن کو — آج مژگاں پہ ہیں کچھ لختِ جگر تازے سے
کوچہ گردی کا مزہ خانہ نشیں کیا جانے — سر نکلتے نہیں دیکھا کسی دروازے سے
نجد میں نالۂ بلبل کی صدا جو آئی — کر کے غش گر پڑی لیلیٰ وہیں جمازے[4] سے
مدح کا ذکر ہو یا ذم کا بیاں، شاعر سے — بات یہ چاہیئے باہر نہ ہو اندازے سے

1۔ دھکدھکی = دیوار میں باریک سوراخ، دھکدھکے میں = گھبراہٹ، پریشانی 2۔ محتشم = باعزت
3۔ طراوت = تازگی 4۔ جمازہ = تیز رفتار اونٹنی

مصحفی اس کو چھری سے کوئی کاٹے تو وہیں
خون ٹپکے مرے دیوان کے شیرازے سے

377

میرے مرتے ہی فلک ٹوٹ پڑے پانی کے — جوں پسِ مردہ لُڑھاتے[1] ہیں گھڑے پانی کے
یہ بھنور ہیں کہ ترے بالوں کی خاطر اے ماہ — صاف دریا نے گھڑائے ہیں کڑے پانی کے
دھو گیا کون یہ کل حوض پہ پانو کے تئیں — سارے فوّارے ہیں حیران کھڑے پانی کے
دن کو وے تارے نظر آنے لگے دریا میں — اُس کے بالوں سے وے قطرے جو جھڑے پانی کے
ان دنوں رہتی ہیں گریے سے بھری یوں آنکھیں — جوں کہیں ہوتے ہیں تالاب پڑے پانی کے
مثلِ فوّارہ نہ کر صرفہ تو رونے کا، دلا — ابھی سینے میں خزانے ہیں کھڑے پانی کے

مصحفی دل پہ شکست آئی مرے بر لب جو
دو بولے کبھی باہم جو لڑے پانی کے

378

بانہہ اُس کی میں اک دن جو شبِ تار گھسیٹی — ظالم نے بگڑ کر وہیں تلوار گھسیٹی
کر قتل ہمیں جرمِ محبت کے گنہ سے — لاش اُس نے ہماری سرِ بازار گھسیٹی
بجلی سی پھری لوٹتی، جب اُس نے زمیں پر — دامن کی کناری دمِ رفتار گھسیٹی
جب چیل جھپٹے[2] پہ ہوئے شیخ جی راضی — اک طفل نے آکر وہیں دستار گھسیٹی
دل پسنے لگے سیکڑوں، جب خامۂ مو سے — مانی نے ورق پر تری رفتار گھسیٹی
جب اُٹھ نہ سکی لاش مری اُس کی گلی سے — شب ہار کے یاروں نے وہ ناچار گھسیٹی

جن نے یہ غزل مجھ سے سنی مصحفی آکر
جلدی سے قلم لے وہیں یکبار گھسیٹی

1۔ لُڑھانا = بہانا (دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی بہایا جاتا ہے تاکہ مٹی جم جائے)

2۔ چیل جھپٹا = بچوں کا کھیل، (کوئی چیز اُچک کر بھاگنے کا مقابلہ)

379

سوتے ہیں ہم زمیں، پر کیا خاک زندگی ہے
ماٹی میں سَن رہے ہیں ناپاک زندگی ہے

غیر از لباسِ ظاہر صورت نہ پکڑے معنی
تصویر کے ورق پر پوشاک زندگی ہے

سر کاٹ کر نہ میرا فتراک سے لگا وے
سمجھے اگر وہ اس کی فتراک زندگی ہے

کیوں کر کرے نہ ہر دم قطعِ منازلِ عمر
تیغِ زباں سے اپنی چالاک زندگی ہے

جیتے ہیں دیکھ کر ہم زلفِ سیہ کو اُس کی
افیونیوں کی جیسے تریاک زندگی ہے

دے وصل کا تو وعدہ جھوٹا اُنھوں کو جا کر
اس بات سے جنھوں کی املاک زندگی ہے

معنی نیاز کے اک نکلیں ہیں بس کہ اس میں
الحمد میں ہماری اِیّاک [1] زندگی ہے

گر ناک ہو نہ منھ پر کیا لطف زندگی کا
انسان کے بدن میں یہ ناک زندگی ہے

دو دن میں آ رہے ہے خط کا جواب واں سے
اے مصحفی ہماری یہ ڈاک زندگی ہے

380

اُس نے کر وَسمہ [2] جو فندق پہ جمائی مہندی
کیا ہی دلچسپ مجھے وہ نظر آئی مہندی

نہ رہا ایک بھی چور [3] اُس کے کہیں ہاتھوں میں
ایسی چترائی [4] سے کافر نے لگائی مہندی

بیٹھے بیٹھے جو مزاج آ گیا رنگینی پر
گوندھ کر لالے کی پتی میں ملائی مہندی

ق
اس نفاست کا میں کشتہ ہوں کہ اک تو اُس نے
بنگلے [5] پانوں سے ہاتھوں میں بندھائی مہندی

تس پہ کم بخت کی یہ دوسری سگھڑائی [6] دیکھ
باندھ رومالوں سے بسمے کی بچائی مہندی

ق
اور ہشیاری یہ سن، سوتے سے جو چونک پڑا
کھول پھرتی سے وہیں جلد چھڑائی مہندی

بعد ازاں طاق سے اک چھوٹے سے شیشے کو اُتار
عطر میں ہاتھوں سے مل مل کے بسائی مہندی

1۔ سورۂ فاتحہ میں اِیّاکَ نعبد و اِیّاکَ نستعین کی طرف اشارہ ہے 2۔ وَسمہ = بالوں میں مہندی کا رنگ لگانا
3۔ مہندی کا چور = جہاں مہندی کا رنگ آنے سے رہ جائے 4۔ چترائی = ہوشیاری
5۔ بنگلا = پان کی ایک قسم۔ مہندی لگا کر اوپر سے یہ پان باندھا جاتا ہے۔ 6۔ سگھڑائی = سلیقہ

مصحفی کیوں نہ دعا دیوے کہ اُس کو تو نے
اک غزل اور بھی رنگین لکھائی مہندی

381

نارنولی[1] جو کبھی اُس نے منگائی مہندی
دور سے مجھ کو بھبوکا[2] نظر آئی مہندی

پور پور اس کی کمر بستہ ہوئی خوں پہ مرے
لال ڈوروں سے جو فندق پہ جمائی مہندی

چہچہی[3] ایسی ہی کافر ہے کہ اُس کافر نے
تو کہے خونِ شہیداں سے گندھائی مہندی

ہاتھ پہنچوں تلک اس بت نے جو مل مل کے رنگے
تازہ ترکیب جو تھی، مجھ کو بھی بھائی مہندی

باندھ مٹھی میں مرے دل کو کیا خون اُس نے
اور دانست میں لوگوں کی رچائی مہندی

قطع پاجامے کی ایڑی تلک آگے کب تھی
یعنی اس پردے میں پانْو کی چھپائی مہندی

غزل اک اور بھی لکھوا کہ مرے ہاتھوں میں
ہو سر انگشت قلم تجھ سے حنائی مہندی

382

لیٹ کر اُس نے جو تلووں کی دکھائی مہندی
کیا ہی اُس دم مجھے کافر کی خوش آئی مہندی

لعلِ تازہ نظر آئے مجھے وہ دو کفِ پا
اُس نے جس وقت کہ پانْووں کی چھڑائی مہندی

شوقِ تزئیں جو ہوا اُس کو تو اس کی خاطر
بن کے مشاّطہ، صبا باغ سے لائی مہندی

مجھ کو حیرت ہے کہ ہاتھوں کی ترے، اے کافر
کس طرح دُزدِ حنا نے یہ چُرائی مہندی

1۔ نارنول ہریانہ کا ایک شہر 2۔ بھبھوکا = گہرا سرخ رنگ 3۔ چہچہی = چمکدار

انگلیاں اس کی مرے خون کی پیاسی کب تھیں
تیرے چھلّوں نے کمران کی بندھائی مہندی[1]

شاہدِ گل کے بھی پنجوں میں نہ دیکھی میں تو
یہ نفاست، یہ لطافت، یہ صفائی، مہندی

مصحفی کو تو لکھا دے غزلِ چارم بھی
تا کہ معلوم ہو تیری بھی رسائی مہندی

383

اُس نے ساون کی جو پنجوں میں لگائی مہندی
لال جوں بیر بہوٹی[2] نظر آئی مہندی

رات کو کس نے یہ اُس شوخ سے کیں رنگ رلیاں
صبح بستر پہ جھڑی اُس کے میں پائی مہندی

غیر کے ہاتھ سے پانو کے لگانے کے لیے
پس گیا دل جو کبھی اُس نے پِسائی مہندی

گلِ اورنگ لگے چاک گریباں کرنے
اُس کے فندق کی جو اُودی نظر آئی مہندی

کھول دیں غش سے میں آنکھیں وہیں، اُس کافر نے
اپنے ہاتھوں کی جو پاس آ کے سنگھائی مہندی

کس جگر سوختہ نے بوسے لیے گرما گرم
کیوں سیاہی ترے ہاتھوں کی لے آئی مہندی

اب سماں دیکھیے آگے غزلِ پنجم کا
مصحفی نے عجب اک چیز بنائی مہندی

384

شبِ عید اُس نے جو پانو کی چھڑائی مہندی
میں وہی آبلۂ دل کو لگائی مہندی

خونِ عاشق کی تو بُو اس میں نہ آئی ہووے
نظر آتی ہے مجھے کل سے سوائی مہندی

دیکھ کر بیر بہوٹی نے سر اپنا پٹکا
ناخنِ پا کی ترے جب نظر آئی مہندی

لعل میں ہوتی ہے الحق یہ ڈلک[3] کا ہے کو
اُس کفِ پا کی جو رکھتی ہے صفائی مہندی

1۔ کمر بندھانا = ہمت دلانا 2۔ بیر بہوٹی = ایک چھوٹا سا گہرے سرخ رنگ کا کیڑا
3۔ ڈلک = صفائی

رنگِ گل کیوں نہ جلے دیکھ تری آرایش کیوں کے اُس میں نہیں یہ ہوش ربائی مہندی
سوزشِ دل کا مسیحا سے جو پوچھا میں علاج اُتری ہاتھوں کی ترے اُس نے بتائی مہندی
دل کو میرے جو ہوئی سیرِ شفق کی خواہش اُس نے آ بام پہ ہاتھوں کی دکھائی مہندی

مصحفی کی جو طبیعت ہے نپٹ زینت[1] دوست
پنجۂ فکر پہ یوں اُس نے جمائی مہندی

385

شب بزمِ غیر میں تم اگر جا کے سو رہے سن لیجیو کہ یار بھی کچھ کھا کے سو رہے
اُٹھنے کے خاک سے نہیں وہ روزِ حشر بھی جو اُس گلی میں پانو کو پھیلا کے سو رہے
روزانہ اُن کے ملنے کو آیا جو میں تو وے صورت خُمار کی مجھے دکھلا کے سو رہے
نادان ایسے ہو گئے یہ کیا غضب کیا تم چاندنی میں فصد جو کھلوا کے سو رہے
پہنچا نہ عاشقوں کی ترے کوئی داد کو آخر شبِ فراق میں چلّا کے سو رہے
رکھا جوان کے سینے پہ میں جاگتے میں ہاتھ کچھ کچھ سمجھ کے جی میں، وہ دم کھا کے سو رہے
آئی شبِ وصال بھی گاہے تو یوں کٹی زانو پہ رکھ کے سر کو مرے، آ کے سو رہے
کرنے لگا جو چمپی[2] میں جی سے اُنھوں کی رات ہر چند جاگتے تھے پہ سُکھ پا کے سو رہے

دھندے سے رات دن کے رکا مصحفی جو دل
کچھ بن نہ آئی ہم کو تو گھبرا کے سو رہے

386

ہے تمنائے سیرِ باغ کسے گل سے سازش کرے، دماغ کسے؟
کس کا عالم، کہاں کے باغ و بہار اپنے عالم سے ہے فراغ کسے؟
اُس کے آوارگاں کو ڈھونڈے ہے خلق اُن کا ملتا ہے یاں سراغ کسے؟

1۔ زینت دوست = حسن پرست 2۔ چمپی = مالش

اتنا بے سُدھ نہیں میں، اے ساقی خالی دیتا ہے تو ایاغ کسے؟
تجھ بن، اے وحشتِ جنونِ بہار خوش لگے ہے یہ باغ و راغ[1] کسے؟
لالہ دیکھ اُس کی چھب کو کہتا تھا "داغ پر دے گیا ہے داغ کسے"
گو اندھیری ہے مصحفی شبِ ہجر
پر ہوئی خواہشِ چراغ کسے

387

دن میں سو سو بار اب ہم اُن کے گھر جانے لگے منہ چھپانے وہ لگے، ہم اُن پہ مرجانے لگے
یہ تو بتلاؤ کہ میرا کیا ٹھکانا کر چلے چھوڑ کر تنہا جو مجھ کو، تم سفر جانے لگے
جن کے بن دیکھے نہ رہتا تھا میں اک ساعت کبھی ہجر میں اُن کے مہینے ہی گزر جانے لگے
یا تو گُدّی[2] تک نہ آتے تھے وہ ننھے ننھے بال یا بڑھے ایسے کہ تا حدِّ کمر جانے لگے
گِل ہوا خونِ شہیداں سے وہ کوچہ اِس قدر رہرووں کے پانو واں کیچڑ میں بھر جانے لگے
ہائے جن آنکھوں سے قطرہ اشک کا گرتا نہ تھا کیا غضب ٹوٹا کہ یوں لختِ جگر جانے لگے
سوزشِ دل نے مگر پھر ان دنوں تاثیر کی تم سے آنسو گرم کیوں، اے چشمِ تر جانے لگے
مصحفی رکھتے تھے یا دن رات وہ میری خبر
یا خبر لینے کو اُن کی نامہ بر جانے لگے

388

اُس کا مستی میں جو لغزش سے قدم پڑتا ہے قدِ نازک میں عجب طرح کا خم پڑتا ہے
جاؤں اُٹھ اُٹھ کے جو راتوں کو گھر اُس کے تو کہے چین بستر پہ بھی تجھ کو کوئی دم پڑتا ہے؟
نامہ جن انگلیوں سے اُس کو لکھا تھا میں نے دستِ استاد سے اب اُن پہ قلم پڑتا ہے
اپنے در پر بھی خسک[3] اُس نے بچھائی شب کو یہ نہ جانا کہ کوئی کشتۂ غم پڑتا ہے

1۔ راغ = چراگاہ 2۔ گُدّی = قفا، (سر کا پچھلا حصہ) 3۔ خسک = چھال، گھاس، گوکھرو کو بھی کہتے ہیں

مل گیا گھر سے نکلتے ہی وہ مہ، شب مجھ کو اتفاق ایسا بھی سچ پوچھو تو کم پڑتا ہے
میں وہ وحشی ہوں کہ وحشت نہیں جاتی اس کی جس پہ اک بار مرا سایۂ رم پڑتا ہے

مصحفی روٹھ کے اُٹھ جائے ہے جب وہ بتِ شوخ
ساغرِ عیش میں اپنے وہیں سَم[1] پڑتا ہے

389

یارانِ رفتہ آہ بہت دور جا بسے دل ہم سے رک گیا تھا اُنھوں کا، جدا بسے
کوچے میں تیرے ہاتھ ہزاروں بلند ہیں ایسے کہاں سے آکے یہ اہلِ دعا بسے
کرتا ہے کوئی زیبِ تن اپنا وہ رشکِ گل پھولوں میں جب تلک کہ نہ اُس کی قبا بسے
بلبل کہے ہے جاؤں ہوں، کیا کام ہے مرا میں کون، اس چمن میں نسیم و صبا بسے
جنگل میں جیسے قافلہ آ کر اتر رہے یوں ہیں یہ رہروانِ عدم جابجا بسے
یا رب ہو واقعہ کوئی ایسا کہ وہ پری گھر اپنا چھوڑ کر کے مرے پاس آ بسے
جانے سے تیرے کشورِ دل ہو گیا خراب ویرانہ ہے یہ اب کوئی یاں آکے کیا بسے
عالم ہے زیرِ خاک بھی گر تجھ کو سوجھ ہو کیا اک طریق ساتھ ہیں اہلِ فنا بسے
بلبل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا پھر اِس چمن میں بوم بسے یا ہُما بسے
حیرت ہے یہ کہ چھوڑ کے آبادیِ عدم اس منزلِ خراب میں ہم کیونکے آ بسے

ہمسائے مصحفی کے میں گھر لے دیا تو وہ
بولے کہ پاس ایسے کے میری بلا بسے

390

کیا فائدہ جو مجھ سے نہیں اور نکالی ہے چین تو جامے کی کہیں اور نکالی
کھنکارا[2] جو میں دیکھتے ہی موئے سر اس نے دیوار سے کوٹھے کی، جبیں اور نکالی

1۔ سم = زہر 2۔ کھنکارنا = (اعلان نون کے ساتھ)

حسرت تو نہ رہ جاتی بھلا، رتھ میں سے گردن — کیوں تو نے نہ، اے پردہ نشیں اور نکالی

تیغا ہوئی گر ایک، تو پھر اس نے بھی ضد سے — کھڑکی اُسی کھڑکی کے قریں اور نکالی

پھر مڑ کے مرے لاشے پہ تلوار لگائی — لو سنتے ہو کچھ، اُس نے یہ کیں اور نکالی

دے بوسہ کہے ہے مجھے، میں پھر نہ ملوں گا — یہ بات اگر منھ سے کہیں اور نکالی

قلمیں بھی لگا رکھنے تو پٹھوں کے برابر — یہ تو نے تراش، اے بتِ چیں، اور نکالی

مانی سے کہے ہے یہ ترے حسن کی تصویر — مجھ سے یہ بلائے دل و دیں اور نکالی

دنیا نئی ایجاد ہوئی مصحفی ہم نے
جب شعر کے عالم میں زمیں اور نکالی

391

کبھی گر بات حق کی مردمِ آگاہ بول اُٹھے — تو صاحب فہم کو لازم ہے سن کر واہ بول اُٹھے

لگا کرنے مرا وصف اُن کے آگے گر کوئی ناداں — تو وے اک شدّ و مد سے سن وہیں توبا[1] ہ بول اُٹھے

بنایا تھا ہمیں یاروں نے مل کر شاہ چپ[2] لیکن — گیا کھیل ان کا آخر سب بگڑ، ہم آہ بول اُٹھے

بہ شکلِ بے نوایاں بزمِ رنداں میں جو ہم گزرے — تو دھر کر ہاتھ پیشانی پہ سب یا شاہ بول اُٹھے

ہوا وہ بدگماں سنتے ہی اس کے، بل بے دانائی — کبھی انگڑائی لینے میں جو ہم اللہ بول اُٹھے

وہ مجھ سے لگ چلا تھا رات باتوں میں کہ بس سن کر — "اجی چلتے ہو سونے کو" مرے بدخواہ بول اُٹھے

چھپے ہے خونِ ناحق کشتۂ الفت کا یاں کوئی — گر اس کو چاہ میں ڈالو تو پھر وہ چاہ بول اُٹھے

مقام اس کا گر امروہہ میں ہو تو کاش یاروں سے — کوئی، یہ شیخ سدّو[3] کی ہے یاں درگاہ بول اُٹھے

1۔ توباہ = توبہ (مد کے ساتھ) (روزمرّہ) 2۔ شاہ چپ = بچوں کا کھیل، جس میں بولنے والا ہار جاتا ہے۔
3۔ شیخ سدّو (صحیح املا شیخ صدّو) حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب جھندہ شہید علیہ الرحمۃ جو حضرت بابا فرید گنج شکر علیہ الرحمۃ کے چھوٹے صاحبزادے تھے اِنھیں امروہے میں ٹھگوں نے شہید کر دیا تھا۔ اُن کا مزار اب ''جھنڈا شہید'' کہلانے لگا جو جھندہ شہید کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ شیخ صدو کے بارے میں جہالت اور ناواقفیت نے بیہودہ روایات شائع کر دیں [تفصیل کے لیے دیکھیں: نثار احمد فاروقی ''حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوب جھندہ شہید'' شائع کردہ بابا فرید ایجوکیشنل سوسائٹی امروہہ 2001ء]

وہ آکر بام پر شب کو اُٹھادے منھ سے گر پردہ
اجی ایدھر تو دیکھو آسماں پر ماہ بول اُٹھے

دل اپنا دخترِ رز پر ہے لٹو آگے قاضی کے
تماشا ہو جو "میں راضی ہوں" وہ شطاہ[1] بول اُٹھے

غزل اک اور بھی پُر دردسی اے مصحفی پڑھیے
خموشی کا ہے پھر کیا لطف تم ہرگاہ بول اُٹھے

392

جو ہم اُٹھتے ہی ان کے، منھ سے، بسم اللہ بول اُٹھے
تو بعضے رشک سے گردن ہلا کر واہ بول اُٹھے

پکارا خفتگانِ خاک کو گر پیار سے اُس نے
تو وہ بھی سر اُٹھا کر خاک سے ناگاہ بول اُٹھے

ہمارے دل میں جب یاس آ گئی دنیا کے دھندوں سے
تو اکثر بیٹھے بیٹھے کیوں میاں اللہ بول اُٹھے

بلایا تھا مجھے تعزیر دینے روبرو اس نے
"یہ بے تقصیر ہے" ناگہ کئی بدخواہ بول اُٹھے

قبائے راہ راہ اک روز اس کافر نے پہنی تھی
"تمھیں پھبتی ہے یہ" اس کے جو تھے ہمراہ بول اُٹھے

زمیں پر گر قدم اُس کا پڑا کج ٹک بھی مستی میں
تو ووں ہی خفتگانِ خاک بسم اللہ بول اُٹھے

کرے وہ غیر سے بیٹھا ہوا پہروں سے یوں باتیں
غضب آوے جو اس میں بندۂ درگاہ بول اُٹھے

کیے گر شب کو گل تکیے طلب اُس مہ نے بالیں کے
اِدھر اودھر سے "جی حاضر ہیں" مہر و ماہ بول اُٹھے

غضب یہ ہے کہ میں جس چاہ پر ہو تشنہ لب جاؤں
"کسی کا حلقِ بسمل ہوں" یہی وہ چاہ بول اُٹھے

وہ کافر اس کی چتون، اور وہ مکھڑا بھبوکا ہے
کہ گر دیکھے پری، وہ بھی معاذ اللہ بول اُٹھے

گرایا چاہ میں یوسف کو جب اخوانِ یوسف نے
کسی رہ گیر سے نزدیک تھا وہ چاہ بول اُٹھے

جو کافر کے لگاوے پھر کے تیغا وہ بتِ قاتل
تو سر ہو کر جدا اس کا جزاک اللہ بول اُٹھے

زبانِ مصحفی یارو ہے وہ آتش کا پرکالہ[2]
کہ حکمِ قتل ہو تو پیشِ نادر شاہ[3] بول اُٹھے

1۔ شطاہ = چالاک، آوارہ کے معنوں میں، خالص اردو کا لفظ ہے اس کا املا شتاہ (تاسے) ہونا چاہیے یہ غالباً عربی لفظ شتّٰی سے گھڑ لیا جس کے معنی ہیں بہت، یعنی جس کا تعلق بہت سے مردوں سے ہو۔

2۔ آتش کا پرکالہ = جرأت مند، بہادر 3۔ نادر شاہ = ایرانی بادشاہ جس نے 1739ء میں عہد محمد شاہ میں دہلی پر حملہ کر کے ہزاروں باشندوں کو شہید کیا تھا۔

393

یا رب کہیں وہ غیر کی الفت کو چھوڑ دے
ایدھر کو اُس کے دل کی کوئی باگ موڑ دے

مجھ تشنہ لب کی خاک پہ اے ابرِ تر ذرا
آیا ہے تو، تو گوشۂ دامن نچوڑ دے

غافل نہ رہ کہ عاشقِ بیدل کا تیرِ آہ
چاہے تو نُہ فلک کے توے پل میں توڑ دے

ممکن نہیں کہ شیشۂ بشکستہ ہو درست
ٹکڑوں کو میرے دل کے کوئی کیونکے جوڑ دے

گر پنجہ لے گیا ہے[1] وہ بت تیرا مصحفی
تو بھی سنبھل کے اُس کی کلائی مڑوڑ دے

394

گھڑ گھڑاہٹ جو سنی تیری صنم ہیکل کی
کل[2] گئی اور مگر میرے دلِ بیکل کی

نخلِ صندل نہ کہوں کیونکے میں تجھ کو کہ میاں
بو پسینے میں ترے ہے عرقِ صندل کی

کس نے مکھڑے سے ملا تھا ترے، ظالم یہ عبیر
جو پڑی لڑتی ہے تاروں سے چمک بھوڈل[3] کی

کفِ افسوس ہنوز آبِ رواں ملتا ہے
ایک دن دیکھی تھی پشواز تری ململ کی

حال میں اپنے گرفتار ہیں ہم، مُلّا تو
ہم سے مت پوچھ خبر ماضی و مستقبل کی

عمر آخر ہوئی، اس پر بھی چلی جاتی ہے
میری اور اُس کی وہ اک بات جو ہے اول کی

کیا سمجھتا ہے وہ راہ و روشِ محبوباں
دل کو ٹھوکر نہ لگی جس کے کسی اچپل کی

رکھتے ہی آنکھیں وہاں خواب نہ کیوں کر آجائے
پشتِ پا میں ترے نکلے ہے صفا مخمل کی

اک تو آنکھوں کی سیاہی ہے تری قہرِ خدا
تس پہ کرتی ہے ستم اور دھنک[4] کاجل کی

منھ چھپائے ہی نہ ہو ابر کے معجر[5] میں برق
نظر آئی تھی جھلک اُس کو ترے آنچل کی

غیر کے گھر میں تو واں شب کی گنے ہے گھڑیاں
اور یہاں مجھ کو پہنچتی ہے خبر پل پل کی

1۔ آپس میں مقابلے کے لیے پنجہ لڑاتے تھے، جو زیر کر دے کہتے تھے وہ پنجہ لے گیا۔ 2۔ کل = آرام، چین
3۔ بھوڈل = گلال 4۔ دھنک = لکیر 5۔ معجر = اوڑھنی

پاؤں رہرو کا زمیں پر نہیں پڑتا ہرگز کہ ہے لاشوں سے بھری راہ ترے مقتل کی

مصحفی فصلِ بہار آنے دے ٹک دیوانے
راہ اس رُت میں بھی لیتا ہے کوئی جنگل کی؟

395

جس جگہ چشم تری حوصلہ پرداز ہوئی خوبیِ دیدۂ نرگس قلم انداز ہوئی

ساعتِ عیسویاں[1] ہے کہ مرا دل جس میں خود بہ خود چوٹ لگی خود بہ خود آواز ہوئی

کان سے تیرے تری زلف نے سرگوشی کی وہ ہی ہمدرد ہوئی اور وہی ہمراز ہوئی

میں جو پھڑکوں ہوں قفس میں، تو کہے ہے صیّاد اس گرفتار کو بھی طاقتِ پرواز ہوئی

زلف رخسار پہ کھولی تھی سرِ شام اُس نے کہ سیاہی شبِ ہجراں کی بھی آغاز ہوئی

لڑکھڑاتے تھے قدم رات ترے مستی میں صحبتِ مے کی تری چال ہی غمّاز ہوئی

میں کہاں اور وہ کہاں مصحفی قسمت کی ہے بات
میری اور اُس کی ملاقات خدا ساز ہوئی

396

دل دھڑکے ہے میرا تری تیاریِ شب سے باہر نہ نکل پردۂ زنگاریِ شب سے

سوتے میں لبوں کا ترے کیوں بوسہ لیا تھا مجھ کو بھی ندامت ہے گنہگاریِ شب سے

پھر چیت[2] پہ چڑھی ہے تری زلفوں کی سیاہی پھر کام پڑا ہے مجھے بیداریِ شب سے

شاید کہ کسی اور سے تھا وصل کا وعدہ معلوم ہوا یہ تری بیزاریِ شب سے

آج اور بتر ہے ترے بیمار کی حالت غافل نہ رہا چاہیے ہشیاریِ شب سے

شانہ تری زلفوں کے میاں ہاتھ لگا ہے چھٹنے کا نہیں اب وہ گرفتاریِ شب سے

مہتاب کے چہرے کو سحر دیکھ کہے ہے یہ رنگ ہوا میرا تو بیداریِ شب سے

1۔ ساعتِ عیسویاں= گھڑیال، گھنٹہ 2۔ چیت = نگاہ

مر جائے تو چھٹ جاوہ، کہ بیمار کے تیرے ہمسائے تنگ آ گئے ہیں زاریِ شب سے

اے مصحفی جاسوسی ہے اُس پردے کی جن کو
غافل نہیں رہتے وہ خبرداریِ شب سے

397

منھ میں جس کے تو شبِ وصل زباں دیتا ہے صبح تک مارے مزے ہی کے وہ جاں دیتا ہے

بوسہ دینے کو تو کہتا ہے وہ مجھ سے لیکن میں جو چاہوں کہ ابھی دے، سو کہاں دیتا ہے

ناقہ گر گم نہ کرے راہ تو خود ریگِ رواں استخواں ریزۂ مجنوں کا نشاں دیتا ہے

صبح خیزوں کو بھی موت آ گئی کیا ہجر کی شب مرغ بولے ہے نہ مُلّا ہی اذاں دیتا ہے

کچھ تو جا گہ ہے مری دل میں بھی اُس کے ورنہ غیروں کو یوں کوئی پہلو میں مکاں دیتا ہے

دل و جاں مجھ سے وہ مانگے ہے بہائے بوسہ ہے تو سودا بہت اچھا، پہ گراں دیتا ہے

یہ دمِ سرد ہے کس کا کہ ہر اک نخل بہ باغ یادِ بے برگیِ ایامِ خزاں دیتا ہے

پھول جھڑتے ہیں منھ اُس کے سے ہزاروں، مجھ کو گالیاں گر کبھی وہ غنچہ دہاں دیتا ہے

جان دروازے پر اُس کے ہی میں جا کر دوں گا اضطرابِ دل اگر مجھ کو اماں دیتا ہے

مصحفی میں ہدفِ ناز ہوں اور واں غمزہ
دم بدم دستِ تغافل میں کماں دیتا ہے

398

کھڑکیاں چھاپی گئیں روزنِ در بند ہوئے بات اب دور کھنچی راہ گزر بند ہوئے

در پہ ہم لوگ بھلا سر کو نہ پٹکیں کیوں کر جا کے وہ آئنہ خانے میں نظر بند ہوئے

رات اندھیری ہے بہت اب تو چلے آؤ کہیں کھڑکیاں لگ گئیں، ہمسایوں کے در بند ہوئے

گر ملے عاشق و معشوق کے سینے شبِ وصل مل کے آپس میں وہ جوں کاغذِ تر بند ہوئے

ہم صفیروں سے کوئی جائے تو اتنا کہہ دے کہ گرفتارِ قفس یاں کئی پر بند ہوئے

ہم سے پوچھی جو کسی شخص نے تیری کوئی بات بس اسی سوچ میں ہم دو دو پہر بند ہوئے

بے حواسی میں جو خط میں نے لکھے تھے اُس کو نہ لفافے ہوئے اُن کے نہ کمر بند ہوئے

کوچہ تیرا وہ طلسمات ہے جس میں، پیارے آن نکلے تو وہیں شمس و قمر بند ہوئے

مصحفی آج رکے گرتے ہیں آنسو شاید

آکے مژگاں میں پھر لختِ جگر بند ہوئے

399

صانعِ عالم کہ روے خوش کا وہ خلاق ہے کر چکا ہے خلق تجھ کو اور ترا مشتاق ہے

خط شکایت کے جو میں لکھ لکھ کے رکھ چھوڑے ہیں سب کاغذوں سے ہے بھرا گھر کا جو میرے طاق ہے

کوند جاتی ہے برنگِ برق دانتوں کی چمک لب سے لب لگنا ترا وقتِ سخن چقماق ہے

خوانِ نعمت سا کوئی تو مجھ کو آیا ہے نظر روز و شب وردِ زباں جو اسم یا رزّاق ہے

ایک جا گہ بیٹھ رہتے ہم ولیکن کیا کریں اپنی قسمت میں تو یہ رسوائیِ آفاق ہے

آخر آخر دیکھیے چاہت کا کیا انجام ہو واں ہجومِ ناز ہے، یاں کثرتِ اشواق[1] ہے

منھ تو دیکھو قرصِ مہ مُکّی لگا سکتا ہے واں صاف میدے[2] کی سی لوئی جس کی ہر اک ساق ہے

اور بھی کہہ کر سنا دے مجھ کو اچھی سی غزل

تازہ معنی کا تو آخر مصحفی خلّاق ہے

400

دل فریبی میں جبیں کا چاند اگر چہ طاق ہے طوق سے بالی کے پر طاقت ہی اپنی طاق ہے

اس کو بے چینی وہاں، یاں طاقت اپنی طاق ہے میں اِدھر مشتاق ہوں اور وہ اُدھر مشتاق ہے

بوسۂ لب خواب میں اُس کے لیا کرتا ہوں میں بندہ ہے قزّاق[3]، اے یارو خدا رزّاق ہے

گرچہ ہے پوشاک اس کی سب چنبیلی کے سے پھول لیک سادہ ہے غضب وہ اور غضب براق[4] ہے

1۔ اشواق = شوق کی جمع 2۔ مَیدے کی لوئی = مَیدہ گوندھ کر اُس سے کچھ بنانے کے لیے مستطیل شکل کا پیڑا بناتے ہیں۔ 3۔ قزّاق = رہزن، لُٹیرا 4۔ بُرّاق = سفید، چمکتا ہوا

پہنچیو مجنوں، یہی محمل سے آتی ہے صدا　ناقۂ لیلیٰ کے گرد اس دم مگر قزّاق ہے
بندِ شلوار اس کا رکھتا ہے جو تاروں کی چمک　کہکشاں گویا لٹکتا ناف سے تا ساق ہے
ہم سے پھر جاوے جو وہ ناگہ تو ہووے کیا غضب　سامنے بیٹھے ہی جس کا منہ پھرانا شاق ہے
سایہ افگن سر پہ جس کے تیغ تیز اُس کی ہوئی　اس کا اِک دم میں حسابِ زندگی بے باق ہے
ہے پڑا جس کے گلے میں لال ناڑا[1] ان دنوں　اس کی ہی گردن پہ خونِ ناحقِ عشاق ہے
ماہ نے اک شب چھوئی تھی اُس کے خیمے کی طناب　تب سے مثلِ میخ سر اُس کا تہِ شلّاق[2] ہے

مصحفی کا ٹا ہو جس کو اُس کے مارِ زلف نے
بوسۂ خالِ لب اُس مسموم کا تریاق ہے

401

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی　کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی
اب تو روپوش ہیں یہ ہم سے، پہ ہم دیکھیں گے　شکل صحرائے قیامت میں کفن والوں کی
کر گئے تم مجھے پامال جو چلتے چلتے　چال کیا تھی یہی دنیا کے چلن والوں کی
جب سے نکلا ہے ترے گردِ دہن سبزۂ خط　بات ہوتی نہیں سرسبز[3] دہن والوں کی
کفشِ گُل دوز[4] کا جو شوق ہوا ہے اُس کو　رات دن گرم ہے دُکان چکن والوں کی
نکتہ چیں اب تو سخن پر بھی سخن رکھتے ہیں　قدر تھی اگلے زمانے میں سخن والوں کی
نیزہ بازی کا جو فن یاد ہے مژگاں کو تری　اس میں سب نکلے ہے ترکیب دکن والوں[5] کی
کیوں نہ پروانہ جلے رشک سے اے شمع کہ ہائے　لاگ رہتی ہے لگی تجھ سے لگن والوں کی
حسن پر اپنے یہ دعویٰ مہِ تاباں کو جو ہے　کیا صفا دیکھی نہیں گورے بدن والوں کی
جب منگاتا ہے وہ ڈور اور پتنگ اُس سے وہیں　سانٹھ گٹھ[6] جاتی ہے کیا عشق کے فن والوں کی
دیکھیے منزلِ مقصود کو پہنچیں کس دن　رات کٹتی ہے اسی سوچ میں بن والوں کی

1۔ ناڑا = دھاگا، ڈوری　2۔ شلّاق = ہتھوڑا　3۔ بات سرسبز ہونا = کارگر ہونا
4۔ کفشِ گُل دوز = کاڑھی ہوئی جوتیاں　5۔ دکن والے = مرہٹے　6۔ سانٹھ گٹھ جانا = دوستی ہو جانا

بو جو لے جاتی ہے اُس کاکلِ مشکیں کی نسیم　جان جاتی ہے نکل تن سے ختن والوں کی
بال سیدھے بھی ترے قہر ہیں پیارے لیکن　مار ڈالے ہے مجھے مجھ کو شکن والوں کی
فربہی اپنی پہ ہے سیب کو اتنا جو گھمنڈ　غب غبیں دیکھی نہیں اس نے ذقن والوں کی
مصحفی زخم پہ زخم اُس نے اُٹھائے جس کے
کُھب گئی دل میں ادا بانکی پھبن والوں کی

402

مر گیا پر نہ رفیقوں کو خبر میں نے کی　اس خرابی سے شبِ ہجر سحر میں نے کی
ایک دن مل جو گیا وہ بتِ کافر سرِ راہ　منھ کیا اُس نے اُدھر، آہ ادھر میں نے کی
وہ بھی تیری ہی طرح جان کا دشمن نکلا　دوستی اور کسو سے جو اگر میں نے کی
مل گیا اُس سے، تو پچھتاؤں ہوں اب میں جی میں　کہ ضیافت تری کیوں غیر کے گھر میں نے کی
گاہ دیوار کے سائے میں، کبھی در کے رہا　یوں ہی اُس کوچے میں اوقات بسر میں نے کی
دیکھتا میری طرف جو ترے در سے نکلا　اُس پہ اک دور سے حسرت کی نظر میں نے کی
اس نے پٹ کھول کے کیا مجھ کو دکھائیں آنکھیں　چوری چوری جو کبھی جا پسِ در میں نے کی
در بدر بس نہ پھرا مجھ کو نہ ہو ہرجائی　تیری خاطر بہت، اے رشکِ قمر میں نے کی
مصحفی آخرِ شب برسرِ رحم آیا وہ
منّت اُس شوخ کی جب چار پہر میں نے کی

403

یارانِ عدم رفتہ گئے دور بہت سے　ہمسار[1] کے پیچھے رہے رنجور بہت سے
بوسہ تو ہے کیا چیز، بتاں چاہیں تو ان میں　ہیں اس کے سوا اور بھی مقدور بہت سے
تیروں سے ترے دل میں مرے، اے بتِ کافر　سوراخ ہیں جوں خانۂ زنبور بہت سے
ایسا نہ ہو پھر ہم بھی کریں اور سے یاری　اس حسن پہ کچھ آپ ہیں مغرور بہت سے

1۔ ہمسار کے = ہم جیسے

ہر نوکِ مژہ سے جو پڑے جھڑتے ہیں آنسو | شاید مرے سینے میں ہیں ناسور بہت سے
اس آنکھ لڑانے کا بُرا ہووے کہ جس میں | مارے پڑے ہیں ناظر و منظور[1] بہت سے
آ جائے اگر جی میں تو سو رہیے کوئی دم | کیوں، آپ کچھ اس وقت ہیں مخمور بہت سے
جن جن سے میاں تو نے چھپایا ہے منھ اپنا | چہرے انھیں لوگوں کے ہیں بے نور بہت سے
ٹک گورِ غریباں میں قدم رکھیو سمجھ کر | آسودہ ہیں یاں قیصر و فغفور بہت سے
کوچہ ترا وہ مقتلِ عشاق ہے جس میں | سُولی کے تلے تڑپیں ہیں منصور بہت سے
پٹکی جو کہیں ہاتھ سے شب اُس نے گلابی | مجلس میں ہوئے شیشۂ دل چور بہت سے
اُٹھ جائے اگر چشم کا پردہ تو نظر آئے | اس پردے میں اسرار ہیں مستور بہت سے

اے مصحفی جھانکیں نہ کبھی اُس کی گلی لیک
ہاتھوں سے ہم اس دل کے ہیں مجبور بہت سے

404

مجنوں کی وقتِ شکوہ جس دم جگر پہ ٹھہری | سو تشنگی اُسی دم پھر چشمِ تر پہ ٹھہری
ان روزوں زلف اُس کی یہ ناتواں ہوئی ہے | شانے سے گر گری تو آ کر کمر پہ ٹھہری
یوں چاہیے کہ جلدی میں بھی سفر کروں اب | ملنے کی میرے اُس کے، اب کے سفر پہ ٹھہری
دانتوں کی اس کے، یارو تعریف کیا کریں ہم | جب منصفی اُنھوں کی سلکِ گہر پہ ٹھہری
یوسف سے مل کے جس دم رخصت ہوئی زلیخا | سو بار چلتے چلتے زنداں کے در پہ ٹھہری
حیراں ہوں میں بھی اس میں، یہ طرفہ شعبدہ ہے | آنسو کی بوند کیوں کر تارِ نظر پہ ٹھہری
لے کر پھرا نہ اب تک خط کا جواب، شاید | تہمت کی اُس گلی میں کچھ نامہ بر پہ ٹھہری

کر تو بھی مصحفی اب جلدی سفر کا ساماں
اُس ماہِ خانگی کی رخصت سفر پہ ٹھہری

1۔ منظور = جس کو دیکھا جائے

405

جی سے مجھے چاہ ہے کسی کی	کیا جانے کوئی، کسی کے جی کی
شاہد رہیو تو، اے شبِ ہجر	جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی
رونے پہ مرے جو تم ہنسو ہو	یہ کون سی بات ہے ہنسی کی
جوں جوں کہ بناؤ پر وہ آیا	دونی ہوئی چاہ آرسی کی
گو اب وہ جواں نہیں، پہ ہم سے	لٹ جائے ہے کوئی عاشقی کی
چاہے تو شفق کو پھونک دیوے	سرخی ترے رنگِ آتشی کی
میں وادیِ عشق میں جو آیا	مجنوں نے مری نہ ہمسری کی
کھاتے نہیں اب ترے نُصیری[1]	سوگند بھی مرتضیٰ علیؓ کی

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں فارسی کی

406

دل ہی دل میں یاں محبت اپنا گھر کرتی رہی	ہم رہے غافل وہ سو ٹکڑے جگر کرتی رہی
آنکھ اُٹھا کر دیکھنے پر ہم تو یاں مرتے رہے	واں حیائے چشم، نت منعِ نظر کرتی رہی
پاے کوباں در پہ اُس کے جب تلک مجنوں رہا	روزنِ دیوار سے لیلیٰ نظر کرتی رہی
دوش پر گرچہ رہی پیارے تری زلفِ دراز	لیکن اکثر واں سے اندازِ کمر کرتی رہی
عہد میں لیلیٰ کے تجھ سا فتنہ جب پیدا ہوا	شوخ آنکھوں سے تری وہ بھی حذر کرتی رہی
توڑ کر گل کو چمن سے صبح گل چیں لے گیا	شور اور غل عندلیبِ نوحہ گر کرتی رہی
تجھ سے ہم بچھڑے تو، پر سینے میں ایامِ فراق	اک پری کی شکل راتوں کو گزر کرتی رہی
در سے خسرو کے کبوتر بھی نہ اُس تک جا سکا	قصر میں شیریں تلاشِ نامہ بر کرتی رہی
تشنۂ دیدار تیرا جب یہ محرومی مُوا	شبنم اُس کی خاک کو اشکوں سے تر کرتی رہی

1۔ نُصیری= ملک شام میں شیعوں کا ایک فرقہ جو حضرت علیؓ کی اُلوہیت کا قائل ہے یعنی اُنھیں خدا کے برابر جانتا ہے۔

کیا گلستاں کی خبر لیویں کہ نت بادِ بہار آمدِ موسم میں ہم کو بے خبر کرتی رہی

چاہ کر اُس کو نہ بیٹھے چین سے ہم مصحفی
یعنی اُس کی چاہ ہم کو در بدر کرتی رہی

407

چاہیے جس کو پھر اُس کے کیوں کے گھر تک جایئے سو غش آویں راہ میں گر رہ گزر تک جایئے

شوق کا تم شوق تو دیکھو کہ اس حالت پہ ہائے مجھ کو کہتا ہے کہ اک دن اُس کے گھر تک جایئے

وہ اگر حالت پہ اپنی اعتنا کرتا نہیں ہاتھ میں لے نامہ اپنا نامہ بر تک جایئے

متصل میرے جو سووے فرش پر شب وہ تو ہائے ہاتھ کہتا ہے کسی صورت کمر تک جایئے

چھوڑ کر غش میں مجھے تم بے خبر، جاتے رہے یہ نہ آیا جی میں پھر اُس بے خبر تک جایئے

ضعف ہے کچھ اس قدر اُس کو کہ قطرہ اشک کا سوچتا ہے کیوں کے اب مژگانِ تر تک جایئے

ہو جیے رخصت بھی گر اُس سے تو ہنگامِ وداع پیچھے پھر پھر دیکھتے مدِّ نظر تک جایئے

یہ نہ آیا جی میں تیرے، اے صبا فصلِ بہار کچھ تو کہنے بلبلِ بے بال و پر تک جایئے

آتے ہی کوچے میں اُس کے مجھ کو غش سا آگیا
مصحفی اب یاں سے اُٹھ کر کیونکے گھر تک جایئے

408

بوسے ہم خواب میں لیتے تھے پڑے پانو کے کھل گئی آنکھ بجے جوں ہی کڑے پانو کے

پانو پر پانو جو سوتے میں رکھا شب اُس نے کیا لڑے اُس کے اُلجھ کر کے کڑے پانو کے

فندقِ پاسے شب اُس کے جو ملیں میں آنکھیں ناخنے[1] پڑ گئے ناخن جو گڑے پانو کے

قہر ہیں ایک تو ہاتھوں کے کڑے الماسی تس پہ کرتے ہیں ستم توڑے چھڑے[2] پانو کے

بانکپن دیکھ کہ زرگر سے وہ بنتے ہے یہی تو نے خم دار کڑے کیوں نہ گھڑے پانو کے

1۔ ناخنے = ناخن کے نشان 2۔ توڑے چھڑے = پانوؤں میں پہننے کے زیور

مصحفی رقص میں کھویا جو گیا دل میرا
گونگھرو اُس کے بھی شب ٹوٹ پڑے پانْو کے

409

دام میں صیّاد جوں بلبل کو لا کر چھوڑ دے
لطف کیا زلفوں میں گر وہ دل پھنسا کر چھوڑ دے

میں وہ قیدی ہوں کہ زنداں باں اگر دیکھے مجھے
میری حالت پر خدا کا ترس کھا کر چھوڑ دے

دیکھتے ہی اس ادا کو ہم تو ظالم مر گئے
یہ کہا تھا کس نے یوں چلمن اُٹھا کر چھوڑ دے

نازکی تیرا برا ہووے، رَوا ہے یہ بھلا؟
ہاتھ سے میرے وہ ہاتھ اپنا ملا کر چھوڑ دے

دوریِ گل سے بتر ہے حالتِ مرغِ اسیر
اب تو اے صیاد اسے گلشن میں جا کر چھوڑ دے

بس کہا مانا میں تیرا اب تو ناصح درگزر
تو مرا آدھا گریباں ہی سِلا کر چھوڑ دے

کشتہ اُس کا سرد آخر یوں دمِ آخر ہوا
جیسے بلبل جان اپنی پھڑ پھڑا کر چھوڑ دے

لگ چلے ہے جو کوئی تجھ سے تو کج رہنا ترا
بس یہی کہتا ہے اس کو آزما کر چھوڑ دے

چاہنے میں اتنا ثابت ہوں کہ جو چاہے تجھے
رشک سے میرے وہ آخر دل لگا کر چھوڑ دے

اس سے کیا بہتر یہ آوے گر ترے صدقے کے کام
مرغِ دل کو گرد اپنے لے، پھرا کر چھوڑ دے

آہ سے دل سانپ کی ڈبیا ہے تیرا مصحفی
ایک دن اِس کو تو اُس کے پاس جا کر چھوڑ دے

410

جی میں سمجھے تھے کہ دکھ درد یہ سب دور ہوئے
ہم تو اس کوچے میں آ اور بھی رنجور ہوئے

کل جو ہم اشک فشاں اس کی گلی سے گزرے
سینکڑوں نقشِ قدم خانۂ زنبور ہوئے

پھول بادام کے پیارے مجھے لگتے ہیں، مگر
تیری آنکھوں کے تئیں دیکھ کے مخمور ہوئے

دل پہ از بس کہ پھپولے تپِ ہجراں سے پڑے
داغِ دل جتنے تھے وہ خوشۂ انگور ہوئے

فرطِ الفت سے مری بات بگڑتی ہی رہی
جوں جوں چاہا میں انھیں، اور بھی مغرور ہوئے

کھا کے سو نیشِ الم آبلۂ دل میرے رفتہ رفتہ بہے اتنے کہ وہ ناسور ہوئے

مصحفی پڑھ تو اب ان کو بھی بھری مجلس میں
شعر تجھ سے جو کوئی اور بدستور ہوئے

411

ہم تو سمجھے تھے کہ ناسورِ کہن دور ہوئے تازہ اس فصل میں زخموں کے پھر انگور ہوئے

سدّ رہ اتنا ہوا ضعف کہ ہم آخرِ کار آنے جانے سے بھی اُس کوچے کے معذور ہوئے

رشک ہے حالِ زلیخا پہ، کہ ہم سے کم بخت خواب میں بھی نہ کبھی وصل سے مسرور ہوئے

بیچ سے اُٹھ گئے ہم، آئنہ لے ہاتھ میں وے آپھی ناظر ہوئے اور آپ ہی منظور ہوئے

بس کہ سنتا رہا میں نیش زنوں کے طعنے پردۂ گوش مرے خانۂ زنبور ہوئے

اشک تھم جاویں ہیں آنکھوں سے مری تو وہ بہ طعن مجھ سے کہتا ہے کہ "چنگے[1] ترے ناسور ہوئے"

لگ کے جس نخلِ چمن کے میں گلے سے رویا شاخ و برگ اس کے پُر از خوشۂ انگور ہوئے

بن گیا داؤں مرا مصحفی اس دم کیسا
جس گھڑی رات نشے میں وہ بہت چور ہوئے

412

تھی جن سے گفتگو ہمیں وہ یار مر گئے جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے

ہرگز در اس کا وا نہ ہوا، ہم سے سیکڑوں سر کو پٹک پٹک پسِ دیوار مر گئے

آئے ہیں اس کی قید میں ہم دیکھیں کیا بنے زنداں میں جس کے لاکھوں گنہگار مر گئے

لائی صبا جو مژدۂ گل، اُن کو باغ سے کنجِ قفس میں کتنے گرفتار مر گئے

بچنا جنونِ عشق میں خیلے محال ہے اس بد مرض کے یاں کئی بیمار مر گئے

دارالشفائے عشق کی میں کیا کہوں کہ واں کیا کیا مریض کھینچ کے آزار مر گئے

1۔ چنگے = بھلے، صحت یاب

ہاتھوں سے دل کی خانہ خرابی کے داغ ہوں شاید کہ شہرِ حسن کے معمار مر گئے
فرہاد و قیس و وامق و خسرو ہزار حیف تھے اپنے آشنا یہ جو دو چار، مر گئے
اب جی کے کیا کروں گا میں تنہا کہ مصحفی
تھا جن سے لطفِ زیست سو وے یار مر گئے

413

بام پر آ کر جو شب وے کچھ اشارا کر گئے کیا کہیں، بس کام ہی آخر ہمارا کر گئے
بختِ خوش اُن کے جو ہنگامِ سواری آن کر سب بدن کا اُس کے چلمن سے نظارا کر گئے
گرچہ راتوں کو کیے میں نالہ ہائے جاں گداز پر وے سن سن کر دل اپنا سنگ خارا کر گئے
تم کنارِ غیر سے باہر نہ نکلے، حیف ہے اور ہم یاں بحرِ ہستی سے کنارا کر گئے
ایک نے تیرے مریضِ عشق کو دارو نہ دی آ کے یوں لاکھوں اطبا استخارا کر گئے
عشق کا جن سر سے کب اُترا، ترے بیمار کے سیکڑوں سیانے بت آئے اور اُتارا[1] کر گئے
بہرِ تعمیرِ مزارِ کشتگانِ تیغِ ناز خشت لائے مہر و مہ، ابر آ کے گارا[2] کر گئے
فائدہ کیا اُس گلی میں ہم کو آنے سے ہوا بلکہ اور اپنا ہی کچھ ناحق خسارا کر گئے
گر ترے کوچے میں گالی بھی کسی نے ہم کو دی ہم تری خاطر سے اِس کو بھی گوارا کر گئے
بعدِ معزولی بھی اُن کے پاس ہم آنے کے نہیں یاں سے صوبے کا عدم کے گر اجارا کر، گئے
مصحفی دنیا مسافر خانہ تھی مثلِ سرائے
ہم بھی یاں رہ کر کے اک شب کا گزارا کر گئے

414

پھر لگے اک بات کے یاں بننے افسانے کئی پھر لگے چرچا سا کرنے اپنے بیگانے کئی
اُس پری رو سے کوئی کہہ دو کہ آئے بام پر خاک چھانیں ہیں ترے کوچے میں دیوانے کئی

1۔ اُتارا = جن اُتارنے کا عمل، صدقہ 2۔ گارا = سانی ہوئی مٹی

دیکھ انھیں آٹھ آٹھ آنسو شمع بھی رونے لگی جان توڑیں تھے لگن میں رات پروانے کئی
غیر کے گھر سے نشے میں جب وہ آیا میرے گھر میں نے پا قابو دیے اور اس کو پیانے کئی
عید کے دن جب سواری واں سے گزری اُس کی ہائے کیا لگے آ کر درِ زنداں پہ چلّانے کئی
کشورِ دل اب مکانِ درد و داغ و یاس ہے عشق کے حاکم نے بٹھلائے ہیں یاں تھانے کئی
حیف ہے تب خوابِ غفلت سے کھلی مجنوں کی آنکھ کر گیا طے ناقہ جب لیلیٰ کا ویرانے کئی
یہ زمیں والوں نے جانا ہم پہ ٹوٹا آسماں شب لگے نالے جو میرے آگ برسانے کئی
گر نہیں منظور اُس کو عقدِ پرویں کی شکست موتیوں کے کان میں ڈالے ہیں کیوں دانے کئی

اک غزل تو اور بھی اُن کو سنا اے مصحفی
آشنا آئے ہیں تجھ سے شعر پڑھوانے کئی

415

شب مجھے آئے تھے اُس کے گھر سے سمجھانے کئی میں نہ سمجھا، ہو گئے بک بک کے دیوانے کئی
ہاتھ سے چھلّا اُتار اُس نے دیا تا کہ جو پھینک گرم کر اُس کو لگے چھاتی پہ گُل کھانے کئی
مجھ کو جب کوچے سے اُس کے لے چلے تھے بہرِ قتل سر کھڑے پیٹیں تھے اپنا، اپنے بیگانے کئی
ٹک خدا کے واسطے ظالم چھپا یہ فندقیں ہو گئے ہیں اِن کی رنگت دیکھ دیوانے کئی
اک تو فیروزے کا آویزہ غضب ہے کان میں تس پہ کرتے ہیں ستم رشکوک[1] کے دانے کئی
دل نہ اس بے درد کا مائل ہوا میری طرف عشق کے میں نے سنائے گرچہ افسانے کئی
یاد آجاتی ہے مجھ کو حسرتِ وقتِ وداع شمع سے جب صبح چھٹ جاتے ہیں پروانے کئی
جب لبِ دریا پہ وہ بیٹھا نہانے کے لیے کیا خوشامد سے لگے بال اُس کے سلجھانے کئی
خلق پر رتبہ ترے کُشتے کا جب ظاہر ہوا جب ملک آئے جنازہ اُس کا اُٹھوانے کئی
اپنے ساقی کا میں ممنوں ہوں کہ بعد از مرگ بھی خاک پر میری لڑھائے اُس نے پیانے کئی

شانے اب تیرے ہی باقی رہ گئے ہیں مصحفی
کر چکا ہوں نذر ان زلفوں کی میں شانے کئی

1۔ رشلک، رشکوک = چمکدار دانے جن سے روشنی جھلکے

416

قفل طالع کے نہ کھولے جو ہنر کی کنجی
کام کیا آتی ہے ہمسائے کے گھر کی کنجی؟

باغباں کر نہ درِ باغ مقفل ان پر
کھول لیویں جو بنا شاخِ شجر کی کنجی

وقتِ کاوش مژہ اُس شوخ کی ہی دل میں مرے
قفلِ تعویذ ہے اور لختِ جگر کی کنجی

صبح ہوتی جو نہیں ہجر کی شب آج کی رات
آہ کھوئی گئی کیا بابِ سحر کی کنجی

اُس کے لانے کا کیا اُس نے ارادہ جس شب
میں چُرائی اُسی شب غیر کے گھر کی کنجی

زر سے مالوف[1] نہ تھے کہتے ہیں شاہانِ سلف
آہنِ تیغ کو سمجھیں تھے ظفر کی کنجی

اشک موتی سے نکلتے ہیں مری آنکھوں سے
ہاتھ آئی ہے مگر گنجِ گہر کی کنجی

مصحفی پوچھے تو قاروں سے کوئی اب جا کر
وے خزانے ہوئے کیا، اور وہ زر کی کنجی؟

417

موسم آئے نہیں گلگشت کے گلزاروں کے
ابھی ٹوٹے ہیں پڑے دام گرفتاروں کے

روکشی[2] کرنے کو تیار ہیں جس دم تُو کہے
ماہ و خورشید سے تکیے ترے رخساروں کے

جی ہی جی میں یہی کہتا ہوں جب آئے ہے بہار
خوب سے لیجیے بوسے ترے رخساروں کے

سینہ کیونکر نہ بنے تختۂ گاذر[3] اپنا
زخم آئے ہیں برابر تری تلواروں کے

تو ہے جس شہر میں پیارے، طرف ملکِ عدم
قافلے جاتے ہیں اُس شہر سے بیماروں کے

کون اک مجھ سے گرفتار کو واں پوچھے ہے
جس جگہ سینکڑوں زنداں ہیں گرفتاروں کے

جو ہیں ہمسائے ترے، وہ یہی مانگیں ہیں دعا
پردے اُٹھ جاویں الٰہی کہیں دیواروں کے

ہجر کی شب جو میں سوتا نہیں، غم سے میرے
دیدے رہتے ہیں کھلے صبح تلک تاروں کے

جی گیا ووں ہی بکھر مصحفی اپنا، مجھ کو
بال بکھرے جو نظر آئے ادا داروں کے

1۔ مالوف = الفت رکھنے والے 2۔ روکشی = مقابلہ، آمنا سامنا 3۔ تختۂ گاذر = دھوبی کا تختہ جس میں دھاریاں بنی ہوتی ہیں

418

کرتا ہوں شمع جب میں روشن بغیر پوچھے
ہو جائے ہے وہ میرا دشمن بغیر پوچھے

میرا چراغِ دل تھا جوں گل شگفتہ اُس پر
بادِ خزاں نے مارا دامن بغیر پوچھے

بیٹھا تھا اک درے[1] میں، کیا کیا رکا وہ مجھ سے
اُٹھ کھول دی جو میں نے چلمن بغیر پوچھے

دو چار تیر اُس کے جب آویں ہیں ادھر کو
سینے کے کھول دیں ہیں روزن بغیر پوچھے

کیا ظلم ہے کہ دشمن آ آ کے اُس گلی میں
کشتے کا اُس کے کھولیں مدفن بغیر پوچھے

تیرِ نگہ کی اُس کے کیا رستمی کہوں میں
چن چن کے جس نے مارے راوَن بغیر پوچھے

کلکتے سے خفا تھا دل مصحفی کا، یارو
جب تو چلا گیا وہ دکھن بغیر پوچھے

419

تم واں گئے کسی کی ملاقات کے لیے
ہم یاں تڑپ کے مر گئے اک بات کے لیے

ہنگامِ گریہ تاب و تواں کام آئے گا
یعنی یہ سب ذخیرے ہیں برسات کے لیے

کیا دُور اس کے لطف سے وہ ماہِ خانگی
آوے جو میرے گھر میں بھی اک رات کے لیے

یارانِ رفتہ عیش و طرب کر چلے گئے
ہم رہ گئے اُنھوں کی مکافات کے لیے

اک روز بام پر تو نظارے کو آیئے
ترسے ہے جی مرا بھی اشارات کے لیے

مت گھر کو اپنے گنبدِ بے در بنایئے
روزن تو رکھیے حرف و حکایات کے لیے

کیا عمر زیرِ تیغ تو کاٹے ہے مصحفی
کڑھتا ہے جی مرا تری اوقات کے لیے

420

کسی کے دل میں تمنا کسی کی جا نہ کرے
کرے کسی کی تمنا کوئی، خدا نہ کرے

میں تجھ سے یہ نہیں کہتا تو مجھ سے مل کہ نہ مل
یہ چاہیئے پہ تجھے غیر سے ملا نہ کرے

1۔ اِک درہ = ایک دَر، کھڑکی

اگرچہ ہم بھی ہیں شاکی پہ جی یہ چاہے ہے
ہمارے یار کا ہرگز کوئی گلا نہ کرے

بہت دلوں کو ستایا ہے تو نے اے ظالم
مجھے یہ ڈر ہے کوئی شخص بد دعا نہ کرے

خدا یہ دیوے ہدایت اُسے کہ وہ اوباش
اندھیری راتوں کو گلیوں میں یوں پھرا نہ کرے

مرض کو اُس کے، طبیعت پہ چھوڑ دیوے مسیح
مریضِ عشق کی بس اور کچھ دوا نہ کرے

تو جس کے خواب میں آیا ہو وقتِ صبح صنم
نمازِ صبح کو کس طرح وہ قضا نہ کرے

کوئی تو اس سے سفارش کرے مری اتنی
کہ مجھ کو دیکھ کے پردے میں وہ چھپا نہ کرے

ترے بغیر عجب مصحفی کی حالت ہے
بتا دے تو ہی کہ پھر کیا کرے وہ، کیا نہ کرے

421

ہمارے خون کرنے میں نہیں تقصیر مہندی کی
ترے ہاتھوں کی سرخی آپ ہے تصویر مہندی کی

کفک کے گرد اس کے یہ جو ہے تحریر مہندی کی
کھنچی ہے خامۂ قدرت سے یہ تصویر مہندی کی

حنا کی دی ہے تہ اُس نے ملا کر یہ دوپٹے میں
کہ تا عاشق کا جی ٹھنڈا کرے تاثیر مہندی کی

مری تربت پہ گل مہندی کے پودے سبز ہوتے ہیں
کفن میں بس کہ الفت تھی گریباں گیر مہندی کی

ذرا مہندی کے پانو اس میں لٹکا بیٹھ اے شیریں
کہ اک مدت سے ہے مشتاق جوئے شیر مہندی کی

ارادے پر جو خوں ریزی کے وہ مہندی لگاتا ہے
تو مچھلی ہاتھ کی ہو جاتی ہے شمشیر مہندی کی

جگر خوں رشک سے ہوتا ہے اس کے پاس سے آکر
مرے آگے کرے ہے گر کوئی تقریر مہندی کی

ہمارے خون کی سرخی تب ان پوروں کو یاد آئی
سرِ ناخن پہ جب کچھ رہ گئی تحریر مہندی کی

حمائل عید کی شب یُوں کیے اُس گل نے ہاتھ اپنے
گلے میں میرے گویا پڑ گئی زنجیر مہندی کی

چھپے[1] تلووں کے اس کے اپنی آنکھوں سے لگاتا ہوں
مرے نزدیک اب یاں تک تو ہے توقیر مہندی کی

کبھی تجھ بن جو ہم گلگشت کو گلشن کی جاتے ہیں
قلم لگتی ہے آنکھوں میں بسانِ تیر مہندی کی

1۔ چھپے تلووں کے = تلووں کی ہلکی سی گہرائی

کبھی فندق، کبھی چھلّے، کبھی تارے بناتا ہے لگانے میں اُسے آتی ہیں سو تدبیر مہندی کی
ہوا ٹھوکر سے اس کی سرنگوں جب کاسہ مہندی کا صدا آئی کہ اُلٹی ہوگئی تقدیر مہندی کی

سلیماں کی طرف سے مصحفی یہ تجھ سے پوچھے ہے
غزل ایسی کہی ہے کوئی تو نے میر مہندی کی؟

422

یوں ہی اک تن میں مرے دم کی ہوا باقی ہے استخواں رہ گئے ہیں، اور تو کیا باقی ہے
خاک میں مل گئے ہم تو بھی نہ دیکھا تو نے ہائے اب تک تری آنکھوں میں حیا باقی ہے
ہووے جب بوسہ و دشنام کا آپس میں حساب بول اُٹھے کاش کہ اک بوسہ ترا باقی ہے
کس کے مقتل سے تو گزرا ہے کہ اس دھونے پر اب تلک سرخیِ دامان و قبا باقی ہے
اے طبیبو دلِ بیمار کی جلدی میرے کر چکو وہ بھی اگر کوئی دوا باقی ہے
مجھ سے مہندی کے لگانے کا عبث ہے انکار ناخنوں پر تو ابھی رنگِ حنا باقی ہے
گرچہ دم ناک میں آیا ہے قفس میں میرا لیکن اس پر بھی گلستاں کی ہوا باقی ہے
گھر مرے آکے شتاب اتنا کہاں جاتے ہو کہ ابھی تو شبِ ہجراں کا گِلا باقی ہے
اب کوئی دم کو نکل آئے ہے خورشید بلند صبح کے ہونے میں ظاہر ہے کہ کیا باقی ہے
نام جانے کا نہ لے، یہ بھی گزر جانے دے رات تھوڑی سی جو اے ماہ لقا باقی ہے

روٹھ کر مصحفی ہم من تو گئے ہیں اُس سے
طبع میں پر ابھی رنجش کا مزا باقی ہے

423

مِسی پر اُس کے رنگِ پاں کی سرخی عیاں ہے جیسے نافرماں[1] کی سرخی
رگِ گل ہوگئی ہیں اشکِ خوں سے نہیں جاتی مرے مژگاں کی سرخی

1۔ نافرمان = ایک پھول کا نام

ترا دستِ حنائی دیکھتے ہی　گئی بہہ پنجۂ مرجاں کی سرخی
کیا میں فرض اشکِ خوں نہ رویا　چھپی کب دیدۂ گریاں کی سرخی
یہ کس کے تیر مارا تھا کہ اب تک　نہیں جاتی پر و پیکاں کی سرخی
یہی صورت رہی تیری تو اک دن　غضب لاوے گی برگِ پاں کی سرخی
اگرچہ لب بھی ہے آفت کا ٹکڑا　قیامت ہے ولے دنداں کی سرخی
ہمارے خون کی شاہد ہے قاتل　ترے پانو کی اور داماں کی سرخی
لکھ اپنا اشکِ خوں سے مصحفی نام
یہی ہے بس ترے دیواں کی سرخی

424

در تلک آ کے ٹک آواز سنا جاؤ جی　اپنے مشتاق کو اتنا بھی نہ ترساؤ جی
غیر کے ساتھ سے بھاگے ہے مجھے دیکھ، تو میں　اُس سے کہتا ہوں کہ اس کو تمھی ٹھہراؤ جی
میں جو اک روز بلایا اُنھیں گھر جاتے دیکھ　پاس آ، بیٹھ کے کہنے لگے ''فرماؤ جی''
شانہ کیا زلفِ پریشاں میں کرو ہو بیٹھے　اپنے اُلجھے ہوئے بالوں کو تو سلجھاؤ جی
زانوے غیر پہ شب سر نہ رکھا تھا تم نے　جاؤ جھوٹی نہ مرے سر کی قسم کھاؤ جی
مجھ سے کیا پوچھو ہو کیا جی میں ترے ہے، سچ کہہ　ہے جو کچھ جی میں مرے تم ہی سمجھ جاؤ جی
رات اندھیری ہے چلے آؤ مرے گھر چھپ کر　آ کے پھر چاند سا مکھڑا مجھے دکھلاؤ جی
عشق میں ہوتے ہیں میاں مصحفی سو طرح کے غم
گو غمِ ہجر ہے، اتنا بھی نہ گھبراؤ جی

425

مجھ کو نہ آنے جانے کے در سے نکالیے　در وہ جو دوسرا ہے اُدھر سے نکالیے
چلکے کے کھولنے میں شتابی ہے کیا میاں　خنجر تو پہلے اپنی کمر سے نکالیے

نے موچنے[1] کا کام نہ ناخن کی واں جگہ مژگاں کی پھانس کیوں کے جگر سے نکالیے

باتوں میں آئے رات تو پھر سوچ سوچ وہ جی میں کہے کہ اب اسے گھر سے نکالیے

اے مرگ طے منزلِ[2] خمسین ہو چکا اب تو مجھے عذابِ سقر[3] سے نکالیے

کانٹا نکالیے مرے دل کا ولے میاں ایذا نہ ہو، کچھ ایسے ہنر سے نکالیے

دیوارِ گلستاں کے تو رخنے بھی بند ہیں یاں راہ کیوں کے بادِ سحر سے نکالیے

نامہ بھی کھول لیجو کبوتر سے مصحفی

پہلے یہ اُس کے تیر تو پر سے نکالیے

426

ساتھ باجے کے جو راتوں کو ترے چنگ اُڑے لولیِ[4] چرخ کا پھر کیوں نہ بھلا رنگ اُڑے

خالِ عارض کو تری زلف نے یوں گرمایا تازیانے کے تلے جیسے کہ شب رنگ[5] اُڑے

اے پری کھینچوں میں جس سنگ پہ تیری تصویر پر بہم کر کے پرستان کو وہ سنگ اُڑے

دام صیاد نے روپا[6] ہے درختوں پر بھی کہ نہ گلشن سے کوئی مرغِ خوش آہنگ اُڑے

ہر گرفتار کو لازم ہے کہ ایامِ بہار جوں بنے توڑ کے اپنا قفسِ تنگ اُڑے

اُڑ گیا تاب و تواں باغ میں جوں بلبل کا اے گل ایسی ہی طرح رخ کا ترے رنگ اُڑے

یادِ فندق میں جو کی آہِ شرر بار میں رات سیکڑوں سطح ہوا پر گلِ اورنگ[7] اُڑے

طے کرے وادیِ مجنوں کی مسافت، کیا دخل ناقہ لیلیٰ کا اگر سیکڑوں فرسنگ اُڑے

عید کے دن جو ملا گرم میں اُس سے تو کہا آگ لگ جائے تجھے اور یہ ترا ڈھنگ اُڑے

اُس فرنگی بچے کے بوسے کے جو خواہاں تھے دہنِ توپ پر آخر وہی بے ننگ اُڑے

میں بھی ہر شعر میں تصویرِ پری کھینچوں ہوں

مصحفی مجھ سے کہاں صاحبِ اورنگ اُڑے

1۔ موچنا = پھانس نکالنے کا آلہ 2۔ یعنی میں عمر کا پچاس سال طے کر چکا 3۔ سقر = جہنم

4۔ لولی = حسینہ 5۔ شب رنگ = گھوڑا 6۔ روپا ہے = تانا ہے 7۔ ایک قسم کا پھول

427

یہ اک پری کی شکل جو چلمن کی اوٹ ہے تیرِ نگہ سے اس کے ہی دل لوٹ پوٹ ہے
وے دن گئے کہ گریے میں تھا خونِ دل ملا اب جو سرشک ہے سو وہ پانی کی پوٹ[1] ہے
کیوں کر سیاہ خیمۂ لیلیٰ میں جا سکے مجنوں کے واسطے تو وہ لوہے کا کوٹ[2] ہے
ابرِ سیہ میں کوند نہ بجلی کی تُو سمجھ نیچے دوپٹے کے یہ اُسی گل کی گوٹ ہے
خطرہ رہے ہے میرے تئیں رات دن یہی دل جس کو میں دیا ہے وہ کافر نلوٹ[3] ہے
ہو کیوں نہ بال بال کہ شانے کے ہاتھ سے داڑھی پہ روز شیخ کی نوچ اور کھسوٹ ہے
یہ اک ڈفالیے[4] سے سنا آج اُس کے گھر شادی ہے، ناچ کود ہے اور روٹ بوٹ[5] ہے
تڑپے ہے جی کہ تم بھی جو ہوتے تو سیر تھی پر کیا کریں کہ کھٹکے ہے دل میں جو چوٹ ہے

ملتا نہیں ہے مجھ سے جو وہ ماہ مصحفی
اس کو تو کیا کہوں مرے طالع کی کھوٹ ہے

428

نہ میلے ٹھیلے کی یاں جا، نہ وعدہ گاہ کوئی کرے کسی سے کس امید پر نباہ کوئی
مرض ہی مجھ کو وہ ایسی شفا سے بہتر تھا کہ آئے تھا مری پُرسش کو گاہ گاہ کوئی
قنات پردے کی جالی کے اِس لیے ہے قریب کہ روزنوں سے نہ اُس پر کرے نگاہ کوئی
میں بدگمانی سے لگتا ہوں کچھ کا کچھ بکنے جو مجھ سے پوچھے ہے اُس کی گلی کی راہ کوئی
نہ بھول اپنے تو جاہ و حشم پر اے منعم کہ ساتھ لے نہ گیا لشکر و سپاہ کوئی
مری طرف سے کوئی اُس کو یہ کہے جا کر کسی پہ ہے ترے کوچے میں دادخواہ کوئی
ثنائے زلفِ درازِ بتاں نہ ہو تحریر کرے ہزار ورق کے ورق سیاہ کوئی
میں کیا لیا تھا ترا یہ تو سوچ اے قاتل کرے ہے قتل کسی کو بھی بے گناہ کوئی؟

1۔ پوٹ = پوٹلی 2۔ کوٹ = چھوٹا قلعہ 3۔ نلوٹ = نادہند (روزمرہ) جو لے کر چیز نہ دے
4۔ ڈفالیا = گانے بجانے والا، بھانڈ 5۔ روٹ بوٹ = روٹی بوٹی (کھانا ہے)

جو خواب میں بھی نہ آوے کبھی شرارت سے　　جتائے کیوں کے بھلا اُس کو اپنی چاہ کوئی
نگاہِ قہر کی اب اُس کی یہ منادی ہے　　کہ تیغ کھائے پہ منہ سے کرے نہ آہ کوئی
میں مدح سنجِ سلیماں ہوں مصحفی کہ نہیں
سوائے اُس کے زمانے میں بادشاہ کوئی

429

جالی تلک آنا بھی موقوف کیا تم نے　　اب آنکھ ملانا بھی موقوف کیا تم نے
رستے میں کبھی تم کو ہم دیکھ تو لیتے تھے　　سو باغ کا جانا بھی موقوف کیا تم نے
کیا تم سے توقع ہو عاشق کو کہ چلمن سے　　کچھ یوں ہی دکھانا بھی موقوف کیا تم نے
اتنے تو نہ تھے روکھے، کیا آ گئی یہ جی میں　　جو پان کا کھانا بھی موقوف کیا تم نے
تا مصحفیِ خستہ رنگ اور نہ لاوے کچھ
مہندی کا لگانا بھی موقوف کیا تم نے

430

ہاتھ آئے کس طرح درِ جاناں کی نوکری　　جب تک کروں نہ روز میں درباں کی نوکری
خوش ہووے کیوں نہ شانہ کہ ہاتھ اُس کے لگ گئی　　قسمت سے اُس کی زلفِ پریشاں کی نوکری
دامن کی اُس کے کیا خبر اس کو کہ روز و شب　　دستِ جنوں کرے ہے گریباں کی نوکری
ناسور سی بہیں ہیں یہ ایسی کہ اب ہمیں　　کرنی پڑی ہے دیدۂ گریاں کی نوکری
اے روے احتیاج سیہ، جس کے واسطے　　کرتی ہے خلق گبر و مسلماں کی نوکری
آئینہ روز اُٹھ کے دکھا دیجیے اُسے　　بس اتنی ہی ہے اُس مہِ تاباں کی نوکری
وہ طفلِ شوخ ناز سے کرتا نہیں نگاہ　　اور پہروں ہم کریں ہیں دبستاں کی نوکری
کھاتے ہیں ہم تصدقِ[1] فرق اُس کا مصحفی
کب ہو سکے ہے ہم سے سلیماں کی نوکری

1۔ تصدقِ فرق = سر کا صدقہ

431

اپنی مجلس میں ہمیں آنے کی رخصت دیجے
ہو سکے یوں نہ تو مر جانے کی رخصت دیجے

وہ بھی گل کھانے لگی تم پہ جو ہنستے ہنستے
ساعدِ حور کو گُل کھانے کی رخصت دیجے

الم عشق کو میں ضبط کروں ہوں اور شوق
یہی کہتا ہے کہ چلّانے کی رخصت دیجے

قصہ خواں گو نہیں پیارے، میں سخن سنج تو ہوں
ایک شب مجھ کو بھی افسانے کی رخصت دیجے

اور سلجھاتے میں جاؤں میں اُسے الجھاتا
گر مجھے زلف کے سلجھانے کی رخصت دیجے

مصحفی شہر میں رہنے کا نہیں اے یارو
ہے دوانا اِسے ویرانے کی رخصت دیجے

432

چاہِ دل سے جو اُٹھا گریے کا لہرا پانی
مثلِ سیماب پھر آنکھوں میں نہ ٹھہرا پانی

کیوں نہ جاوے سرِ عشاق سے لہرا پانی
گھاٹ کا ہے تری تلوار کے گہرا پانی

وصف میں اس کے درِ گوش کی کچھ کر نہ سکا
گرچہ سو بار ہوا فکر کا زَہرا[1] پانی

غیر از اشک کہ آنکھوں سے وہ گرم آتے ہیں
نہ سنا میں کہ رکھے آگ سے بہرا[2] پانی

میری کشتی وہیں لے جائے ہے یہ بختِ دژم[3]
بحرِ الفت میں جہاں ہووے ہے گہرا پانی

کون گلشن سے یہ گزرا شفقی شال اوڑھے
عکس سے جس کے ہے نہروں کا سنہرا پانی

دیکھی ہیں کس رخِ سیمیں پہ لٹیں ایسی تنک
شمع رکھتی ہے جو اشکوں میں کلہرا[4] پانی

یہ غزل میں نے کہی صاحبِ عالم کے طفیل
ورنہ تھا مصحفی یاں اپنا تو زہرا پانی

433

عقل گئی ہے سب کی کھوئی کیا یہ خلق دوانی ہے
آپ حلال میں ہوتا ہوں، اِن لوگوں کو قربانی ہے

1۔ زَہرا = پتّا، (ہمت)　2۔ بہرا (بہرہ) = حصّہ، نصیبہ　3۔ دژم = خشمگیں، افسردہ
4۔ کلہرا = سیاہی مائل

نطقِ زباں گر ہوتا مجھ کو پوچھتا میں تقصیر مری
ہاں یہ مگر دو آنکھیں ہیں، سو اِن سے اشک فشانی ہے

گھاس چری ہے جنگل کی میں، جون[1] میں دنبے بکرے کی؟
ان کا کچھ ڈھالا کہ بگاڑا جس پر خنجر رانی ہے

تین جگہ سے میرے گلے کو مثلِ شتر یہ کاٹتے ہیں
دینِ محمدی[2] ہے جو خلیلی اُس کی یہ طغیانی ہے

جنس نے جنس کو قتل کیا کب، دیکھیو بدذاتی تو ذرا
یعنی جو ہو مردِ مسلماں اُس کی یہ ہی نشانی ہے؟

کافر دل جلاد نہیں ہم، زخم کو ایک سمجھتے ہیں
ہم کو جو اس کام کا سمجھے اُس کی یہ نادانی ہے

راہِ رضا پر اپنا گلا کٹوائے جو نیچے خنجر کے
مصحفی اس کو ہم یہ کہیں گے وہ بھی حسینؓ ثانی ہے

434

پٹرے دھرے ہیں سر پر دریا کے پاٹ والے
آتے ہیں کس ادا سے اِس منہ پہ گھاٹ والے

چسکا پڑا ہے جب سے شیریں لبوں کا اُس کے
کیسے لگے رہیں ہیں بوسے کی چاٹ والے

دریا پہ تو نہانے جایا نہ کر کہ ناداں
واں گھات میں ہیں تیری کئی دھوبی پاٹ[3] والے

کوچے میں تیرے ظالم از بہرِ دادخواہی
یہ ظلم ہے تو لاکھوں آویں گے گھاٹ والے

بازارِ مصر میں وہ جن جن کو چھل[4] گیا ہے
اک سوچ میں ہیں بیٹھے اب تک وہ ہاٹ[5] والے

دیکھے نہ کوئی اُن کو با دیدۂ حقارت
خز پوشوں[6] پر گراں ہیں البتہ ٹاٹ والے

1۔ جُون میں (ہندی یونی) دُنبے کا جنم لے کر 2۔ محمدی (بغیر تشدید اور میم پر سکون) نظم کیا ہے
3۔ دھوبی پاٹ = کشتی کا ایک گُر، پچھاڑنے کے لیے 4۔ چَھلنا = دھوکا دینا 5۔ ہاٹ = بازار
6۔ خز پوش = پشمینہ پوش

میں نے رقیب کو کل باتوں میں خوب کاٹا
چوکیں ہیں مصحفی کب ہیں وہ جو کاٹ والے

435

اُس گلی میں جو جا کے نکلے ہے
دل پہ اک چوٹ کھا کے نکلے ہے

آہ نکلے تو دل سے ہے لیکن
آہ کیا جی جلا کے نکلے ہے

بس ہی جاتا ہے اپنا جی اُسے دیکھ
جب وہ سرمہ لگا کے نکلے ہے

کیوں نہ ہوں خون سیکڑوں کہ وہ شوخ
نت نئی سج بنا کے نکلے ہے

کھل گئے ٹانکے زخمِ دل کے مگر
آہ خوں میں نہا کے نکلے ہے

تا نہ لیں ہاتھ میں ہم اُس کا ہاتھ
اب وہ مہندی لگا کے نکلے ہے

آہ کی بے حجابیاں تو دیکھ
دل کا پردہ اُٹھا کے نکلے ہے

بیٹھے ہوتے ہیں ہم جو رستے پر
تو وہ کیا منھ چھپا کے نکلے ہے

راہِ زخمِ جگر تو چل تو سہی
اُس گلی ہی میں جا کے نکلے ہے

تیرے بسمل کی وقتِ حسرتِ نزع
جان بھی تلملا کے نکلے ہے

مصحفی جانتا ہے کچھ تو وہ
مجھ سے نظریں چُرا کے نکلے ہے

436

نہ بیٹھ سائے تلے جا کے باغ میں گل کے
مبادا بو تری پہنچے دماغ میں گل کے

وہ کیوں کے یاد میں روشن رہے نہ تابہ سحر
نمک ہے دانۂ شبنم چراغ میں گل کے

صبا تو کچھ تو پتا اُس کو دے کہ مدت سے
پھرے ہے نالۂ بلبل سراغ میں گل کے

گئی نہ دھونے سے شبنم کے سرخی اُس کی نسیم
یہ کس نے خون بھرا تھا ایاغ میں گل کے

مزہ الم کا جو ہے مصحفی کو کود کے ساتھ
بھرے ہے نت نمکِ سودہ داغ میں گل کے

437

بیٹھے بیٹھے جو خیال اُس کا گزر جاتا ہے ۔۔۔ گُہرِ اشک سے دامن وہیں بھر جاتا ہے
گھر کے جانے کا نہ لے نام تو اے خانہ خراب ۔۔۔ ابھی سر پیٹ کے ورنہ کوئی مر جاتا ہے
نہیں معلوم کہ کیا نام ہے اُس کا لیکن ۔۔۔ کوئی اس کوچے میں اک آہ تو بھر جاتا ہے
بزم ماتم ہے کہے تو یہ جہانِ گزراں ۔۔۔ یاں جو آتا ہے سو با دیدۂ تر جاتا ہے
جس طرح آنکھیں بھری آتی ہیں دیکھو گے یوں ہی ۔۔۔ ایک دن عمر کا پیمانہ بھی بھر جاتا ہے
میں تو ممنوں ہوں تصور کا ترے، چوری چھپے ۔۔۔ مجھ سے آکر وہ ملاقات تو کر جاتا ہے

مصحفی مار مرا اپنے شبِ وصل اک خنجر
کیونکہ اب پو پھٹی اور یار بھی گھر جاتا ہے

438

ہر چند کہ بات اپنی کب لطف سے خالی ہے ۔۔۔ پر یار نہ سمجھیں تو یہ بات نرالی ہے
آغوش میں ہے وہ، اور پہلو مرا خالی ہے ۔۔۔ معشوق مرا گویا تصویرِ خیالی ہے
کیا ڈر ہے اگر اُس نے در سے مجھے اُٹھوایا ۔۔۔ کہتے ہیں تغیری میں عاشق کی بحالی ہے
بالیں پہ جب آیا ہے بیمار کی تُو اپنے ۔۔۔ تب روح کے قابض نے جان اُس کی نکالی ہے
میں حال بیاں اپنا کرتا ہوں غزل کہہ کے ۔۔۔ اس واسطے اب میرا جو شعر ہے حالی ہے
مہندی کے لگانے میں پھُرتی یہ نہیں دیکھی ۔۔۔ ظالم نے ہتھیلی پر سرسوں سی جما لی[1] ہے
ہر چند کہ پروانہ جل جانے میں ہے آندھی ۔۔۔ پر شمع بھی آتش میں جی جھونکنے والی ہے
مانی نے شبیہ اُس کی کیا سوچ کے کھینچی تھی ۔۔۔ موے کمر اُس کے کی تصویر خیالی ہے
ظاہر ہے کہ جاگے ہو تم رات کہیں رہ کر ۔۔۔ آنکھوں میں نشے کی تو کچھ تھوڑی سی لالی ہے
مقدور مگر کب تھا قربان ہیں ہم اُس کے ۔۔۔ دامن کی ترے جس نے یہ جھونک[2] سنبھالی ہے

1۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا = بہت تیزی سے کوئی کام کرنا   2۔ جھونک = لہرانا

اے مصحفی ہے تیرا اتنا جو سخن چسپاں
کیا تو نے جواں ورزن گھر میں کوئی ڈالی ہے

439

کانوں کا ہر اک بالا ہر چند ہلالی ہے		جوڑے کی ادا اُس کے ہر شب سے نرالی ہے
خوش حال اُنھوں کا جو پاتے ہیں کچھ اس لب سے		قسمت میں ہماری تو، بوسہ ہے نہ گالی ہے
کیا جانیے کافر کی پھر آنکھ لڑی کس سے		سُدھ اس نے نئے سر سے ان روزوں نکالی ہے
بن دیکھے مجھے اُس کے گزرے ہیں مہینے ہی		قسمت کا مری یارو جو چاند ہے خالی [1] ہے
چھن چھن کے گرے ہے نُور اس ماہ کے پردے سے		غربالِ [2] صباحت ہے غرفے کی جو جالی ہے
اُس زلف کا سایہ ہے شاید شبِ ہجراں پر		ہے کچھ تو سبب اس کا یہ رات جو کالی ہے
نیلم کے تئیں اُس نے یاقوت بنایا ہے		مِسّی کی دھڑی پر یہ پانوں کی جو لالی ہے
شیریں سے نہ کر خسرو تو بے مزگی اتنی		معشوق ہے وہ تیری، اور چاہنے والی ہے
آیا ہے نظر مجھ کو اک چاند کا سا ٹکڑا		نتھ ناک سے منھ دھوتے جب اُس نے نکالی ہے
خوشبوئی کے بکّوں [3] سے مہکے ہے جو گھر سارا		شاید کہ دوا اُس نے کچھ بالوں میں ڈالی ہے
کیوں کر دُرِ سفتہ سے آنسو نہ مرے نکلیں		دل بیندھتی ہے میرا کانوں کی جو بالی ہے
ان لوگوں کی مجلس میں غوغا یہ نہیں دیکھا		بزمِ شعرا ہے یہ، یا مرغوں کی پالی ہے

اے مصحفی تو شاید اُس شوخ سے مل آیا
کل سے ترے چہرے پر کچھ آج بحالی ہے

440

بیقراری اور بھی دل کو اگر ہو جائے گی		مجھ کو یہ ڈر ہے کہ پھر اُس تک خبر ہو جائے گی
اُس کے جانے کا کرو ہو کیوں ابھی سے یارو ذکر		مجھ پہ ہونی ہو گی سو وقتِ سفر ہو جائے گی

1۔ عورتوں نے مہینوں کے جو نام رکھے ہیں ان میں ذی قعدہ کو خالی کا مہینا کہتی ہیں
2۔ غربال = چھلنی 3۔ بکّے = لپٹ

آرسی دیکھا بہت کرتے ہو، سوجھے ہے مجھے ایک دن تم کو تمھاری ہی نظر ہو جائے گی
وصل کی شب کو میں سمجھا تھا ابھی ہے یہ دراز یہ نہ جانا تھا کہ باتوں میں سحر ہو جائے گی
مقتلِ عشاق میں پھرنا مناسب ہے تمھیں؟ خون میں صاحب زہِ دامن نہ تر ہو جائے گی
مجھ کو حیرت ہے کہ کیا باندھیں گے شاعر پھر اُسے مُو سے بھی باریک جب اُس کی کمر ہو جائے گی
خط نہ بنواؤ، تمھارا کچھ بگڑنے کا نہیں مفت میں آفت کسی کی جان پر ہو جائے گی
تجھ سے اے آہِ سحر مجھ کو توقع تھی بڑی یہ نہ جانا تھا کہ تو بھی بے اثر ہو جائے گی
بوسہ مجھ سے لالچی کو تم نے گر دو دن دیا یہ سمجھ لینا کہ پھر بوسے کی کر[1] ہو جائے گی
بیکسی پر رحم آتا ہے کہ گر میں اُٹھ گیا میرے اُٹھ جاتے ہی پھر یہ دربدر ہو جائے گی
ہم تو پردے میں رکھیں تھے اُس کی چاہت کے تئیں یہ نہ سمجھے تھے خموشی پردہ در ہو جائے گی

مصحفی اوقات کا اپنی تو ہرگز غم نہ کھا
جس طرح گزری ہے، باقی بھی بسر ہو جائے گی

441

کیا کوئی عہدِ یاری اُس سیم بر سے باندھے غیروں کے ہاتھ لے جو اپنی کمر سے باندھے
نامے میں سوزِ دل کا مضموں رقم کرے جو کیا مرغِ نامہ بر کے شعلہ وہ پر سے باندھے؟
بانکوں کے بل نکالے، پھر اُن کو مار ڈالے بل دے کے شال پٹکا جس دم کمر سے باندھے
اُس بے ہنر کا دشمن ہو جائے کیوں نہ عالم یارو جو بَیر ناحق اہلِ ہنر سے باندھے
سیلابِ اشک میری آنکھوں سے پھوٹ نکلا کوئی کدھر سے روکے، کوئی کدھر سے باندھے
عاشق کے دردِ سر کی میں اک دوا بتاؤں تعویذِ بازو اُس کا لے کر وہ سر سے باندھے
گلچیں نے جس شجر سے توڑا ہو گل، روا ہے ہاتھ اُس کے باغباں بھی اس ہی شجر سے باندھے

بن یار مصحفی نے کہتے ہیں ہجر کی شب
پیکاں گڑوئے دل میں، خنجر جگر سے باندھے

1۔ کر ہونا = لاگ، لت (عوامی)

442

کیا چمکے اب فقط مری نالے کی شاعری
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری

سامان سب طرح کا ہو لڑنے کا جن کے پاس
ہے آج کل اُنھیں کی مسالے کی شاعری

شاعر رسالہ دار نہ دیکھے، نہ میں سنے
ایجاد ہے اِنھیں کا رسالے کی شاعری

مردِ گلیم پوش کو یاں پوچھتا ہے کون
گر گرم ہے تو شال دوشالے کی شاعری

یہ شعر گرم گرم پڑھے جاتے یوں نہیں
منھ بولتی ہے گرم نِوالے کی شاعری

نخرہ بھی شعر میں ہو تو ہاں سوزؔ[1] کا سا ہو
کس کام کی وگرنہ چھنالے[2] کی شاعری

دیوان جن کے کفش سے افزوں نہیں ذرا
کرتے ہیں کیا وہ لوگ کسالے کی شاعری

چونے کے کاغذوں پہ جھڑیں ہیں جو اپنے شعر
یعنی کہ آ رہی ہے دوالے کی شاعری

کیسا ہی بڑھ چلے وہ کلامِ شریف پر ق
سرسبز ہو کبھی نہ رزالے[3] کی شاعری

بعضوں نے تب تو شعر پہ حسرتؔ[4] کے یوں کہا
کیا دال موٹھ بیچنے والے کی شاعری

ہوں مصحفی میں تاجرِ ملکِ سخن کہ ہے
خسرو کی طرح یاں بھی اثالے کی شاعری

443

وہ در تلک، آوے، نہ کبھی بات کی ٹھہرے
حیراں ہوں میں کس طرح ملاقات کی ٹھہرے

ہر روز کا ملنا ہے جو دشوار تو پیارے
اتنا تو کرو قصد کہ اک رات کی ٹھہرے

جس وقت کہ ہم آئیں تو یہ چاہیے تم کو
اوروں سے نہ پھر حرف و حکایات کی ٹھہرے

اے دیدۂ تر تم بھی جھڑی اپنی لگا دو
اس سال تو برسات میں برسات کی ٹھہرے

کس چیز پہ پھر ہم ہوں گرفتارِ تعین
دن رات کی ٹھہرے ہے نہ اوقات کی ٹھہرے

جب کاٹ کے دل پَیر گئی ہووے جگر میں
پھر کیوں نہ چھری آپ کی اس بات کی ٹھہرے

1۔ میر محمد سوزؔ (برادرِ دردؔ) 2۔ چھنالا = بے شرمی 3۔ رزالا = ذلیل، بے حیثیت یہ اصل میں رذیلہ اور رذائل ہے، اردو والوں نے رزالا بنالیا ہے 4۔ جعفر علی خاں حسرتؔ

ہر روز یہ چاہے ہے تری چشم کی گردش　اس مرکزِ خاکی پہ کچھ آفات کی ٹھہرے

اے مصحفی اس وقت وہ مہماں ہے تمھارے
ہے گھات کی جا گہ تو، اگر گھات کی ٹھہرے

444

صحرائے عاشق کہ سراسر زمین ہے　یاں سایہ دار ڈھونڈو تو کم تر زمین ہے

سنگِ مزار چاہیے کیا اُس شہید کو　جس کی کہ آپ چھاتی کا پتھر زمین ہے

بوٹا ہے سرخ تیری رزائی[1] کا گرچہ جان　پر آسمانِ سبز سے بہتر زمین ہے

آتی ہے فرشِ گل پہ تجھے نیند کس طرح　عاشق کا تیرے در پہ تو بستر زمین ہے

برگِ خزاں کی طرح سے ڈرتا ہوں جھڑ پڑے　آخر یہ شاخِ گاؤ کے سر پر زمین ہے

محتاجِ آب پاشیِ سقا نہیں یہ خاک　خوں سے مرے لحد کی مری تر زمین ہے

کر کشتِ زعفراں کی ذرا سیر تا تجھے　معلوم ہو کہ خوانِ مزعفر[2] زمین ہے

ہر لحظہ تازہ بت کی پرستش کرائے ہے　ہے سچ تو یہ کہ زور ہی بُت گر زمین ہے

تاثیر کیا کرے ترے کوچے کی خاک میں　گریہ مرا، کہ واں کی تو پتھر زمین ہے

ریگِ رواں میں جاکے تو کر چاندنی کی سیر　گویا سفید باف[3] کی چادر زمین ہے

تہ خانۂ عدم میں نہ پھیلا تو اپنے پانو　ٹک آنکھ اُٹھا کے دیکھ کہ سر پر زمین ہے

اک دن گیا مزار پہ سودا[4] کے مصحفی　ق　دیکھا تو اُس جگہ کی برابر زمین ہے

پوچھا کہ ”تیرے حکم میں تھی یا زمینِ شعر　یا اب یہ رنگ ہے ترے اوپر زمین ہے“

آئی صدا یہ واں سے کہ ”ٹک سوچ بے خبر　آخر اسی طرح ترا بستر زمین ہے“

1۔ رزائی = روئی بھری ہوئی دولائی، جاڑوں میں اوڑھنے کے لیے

2۔ مزعفر = زعفران کے ساتھ پکایا ہوا، زردہ وغیرہ　3۔ سفید باف = کپڑا بننے والا، بنکر

4۔ مرزا محمد رفیع سودا (متوفی 1190ھ)

445

خیالِ حسن پرستی کو طاق پر رکھ دے
تو جیتے جی ہی بسل اس اشتیاق پر رکھ دے

فراق میں مجھے اُس کے نہ آوے یارب موت
کہ ڈر رہے یہ، کوئی تہمت فراق پر رکھ دے

سمجھ تو اِس سے ہی اندازِ اشتیاق اس کا
جو ہاتھ اپنا کوئی تیری ساق[1] پر رکھ دے

پھر اُس سے قحبۂ دنیا کا کیا رہے دعویٰ
جو اُس کا مہر بھی اس کی طلاق پر رکھ دے

گلی میں اُس کی کوئی جائے کیا جو عاشق کا
سرِ بریدہ علم کر رواق[2] پر رکھ دے

کہے ہے غمزہ مرے صیدِ دل کو دیکھ اُسے
درنگ کیا ہے پھر، اب زہ[3] کو، فاق[4] پر رکھ دے

پڑھوں جو آگے سلیماں کے مصحفی یہ غزل
تو مُہرِ زر صلہ اِس کا طباق پر رکھ دے

446

نسیمِ صبح چمن سے ادھر نہیں آتی
ہزار حیف کہ گُل کی خبر نہیں آتی

رکھے ہے آئینہ کیا منہ پہ میرے اے ہمدم
کہ زندگی مجھے اپنی نظر نہیں آتی

بھٹکتی پھرتی ہے لیلیٰ سوار ناقے پر
جدھر ہے وادیِ مجنوں اُدھر نہیں آتی

کمر ہی کو تری پروا نہیں ہے کچھ اُس کی
وگرنہ جعد تو کب تا کمر نہیں آتی

تری شبیہ مرے سامنے کھڑی ہے میاں
حیا کے مارے ولے پیشتر نہیں آتی

ہوا ہوں آہ میں جس پُر غرور پر عاشق
کنیز اُس کی کبھی میرے گھر نہیں آتی

قلق سے ہوتی ہے کچھ دل کی میرے یہ حالت
کہ نیند رات کو دو دو پہر نہیں آتی

شبِ وصال کب آتی ہے میرے گھر اے چرخ
کہ اُس کے پیچھے سے دوڑی سحر نہیں آتی

گیا ہے گُم مرے نامے کو لے کے کچھ ایسا
کہ آج تک خبرِ نامہ بر نہیں آتی

خرامِ[5] فتنۂ روزِ جزا بہ ایں شوخی
ترے خرام کے عہدے سے بر نہیں آتی

1۔ ساق = پنڈلی 2۔ رواق (بروزن فراق) برآمدہ 3۔ زہ = وتر Bowstring
4۔ فاق = چاک، شگاف 5۔ خرام کو مونث باندھا ہے

میں ترکِ عشق کو کہتا ہوں مصحفی تجھ سے
یہ بات دھیان میں تیرے مگر نہیں آتی

447

آستیں قاتل نے کب خوں سے ہمارے پاک کی
جب بہت رنگیں ہوئی، کہنی سے آدھی چاک کی

ٹھوکریں کھاتی ہے اب تک یہ کس و ناکس کی ہائے
قدر یہ کوچے میں اُس کے ہے ہماری خاک کی

پھر گئی تھی آنکھ تیری جن دنوں میں غیر سے
بس وہی گردش خوش آئی تھی ہمیں افلاک کی

آج اُس کے کاسۂ سر کے مفاصل[1] ہیں جدا
آہ کل جو کشتہ، زینت تھا ترے فتراک کی

مژدہ پہنچے مے کشو تم کو کہ پھر آئی بہار
پھر ہے تیاری چمن میں داربستِ[2] تاک کی

تیغ ہے خنجر ہے، جمدھر ہے، چھری ہے، تیر ہے
کچھ تو بھجوا دو تسلی کو دلِ غم ناک کی

رات بزمِ رقص میں کیا کیا دکھائے ہیں سمے
آہ چالاکی کہوں کیا اُس بتِ چالاک کی

سیکڑوں لاشیں گریں ہیں جنبشِ مژگاں کے ساتھ
آنکھ پھرتی ہے جدھر کو اُس بتِ سفاک کی

خودنمائی کے یہ سب اسباب ہیں اے مصحفی
ورنہ کب عریاں تنوں کو فکر ہے پوشاک کی

448

دیوانہ وار بس کہ وہ مستی سے دَو[3] میں ہے
دیوانہ دل کے لشکرِ طفلاں جلو میں ہے

ابرو تری سیاہ ہے اور اُس کی ہے سپید
سچ پوچھیے تو عیب بڑا ماہِ نو میں ہے

بچنا ہے اس سے خوب ہی اہلِ شعور کو
اس دم سمندِ ناز ترا سخت رَو میں ہے

کہیو صبا پتنگ کا پیغام شمع سے
جب سے جدا ہوا ہے وہ، تیری ہی لَو[4] میں ہے

خواہندہ سیکڑوں ہیں ترے، مجھ سے کیا ہے ننگ
یہ جان تُو فلک زدہ اک یہ بھی سو میں ہے

چمپاکلی[5] کے دانے ترے کیوں نہ دل کو بھائیں
جادوگری بھری ہوئی ہر ایک جَو[6] میں ہے

1۔ مفاصل = جوڑ 2۔ انگور کی بیل باندھنے کی تیاری 3۔ دَو = دوڑ، بھاگنا
4۔ لَو = اشتیاق 5۔ چمپاکلی = گلے میں پہننے کا زیور 6۔ جَو = چمپاکلی کے چھوٹے ٹکڑے

اے مصحفی تو چل کے وہیں دم بھی لیجیو
پانی پیے جو سرد تو فتو[1] کی بَو[2] میں ہے

449

جس لالہ رو کو دیکھ ہزارا[3] لہو پیے — وہ پان کھا کے کیوں نہ ہمارا لہو پیے
انصاف ہے کہ واں تو کرے بادہ نوشیاں — اور یاں یہ دل فراق کا مارا لہو پیے
پیکاں ترے خدنگ کا چسپیدہ دل سے ہے — شکلِ زَلو[4] وہ کیوں نہ ہمارا لہو پیے
حلقِ بریدہ دیکھ کے تیرے شہید کا — کیوں کر نہ لالۂ چمن آرا لہو پیے
ان دلبرانِ مست کو پروا کب اِس کی ہے — گو جامِ غم سے کوئی بچارا لہو پیے
اُس نتھ کے موتیوں کو لگیں کیونکے مہر و ماہ — چُنّی[5] سے جن کی صبح کا تارا لہو پیے
دستار باندھنوں[6] کا ترے ہے یہ رنگ شوخ — یعنی کرے جو اس کا نظارا، لہو پیے
اس خال لب پہ دیکھ کے سرخیِ رنگِ پاں — کیوں کر نہ اپنا عنبرِ سارا لہو پیے
مارِ سیاہِ غم کوئی ہوتا ہے یوں جدا — جب تک نہ میرے جسم کا سارا لہو پیے
دیکھے خمار میں جو تری انکھڑیوں کا رنگ — تا روزِ حشر اپنا چکارا[7] لہو پیے

واں جامِ عیش کیونکے ملے ہم کو مصحفی
جس بزم میں کہ خسرو و دارا لہو پیے

450

کیا یارو اُسے چھوڑ کے ہم بیٹھ رہیں گے — رستے ہی میں جا کر کوئی دم بیٹھ رہیں گے
امیدِ کرم پر تری ہم آتے ہیں یاں تک — اک دن جو نہ دیکھیں گے کرم، بیٹھ رہیں گے
سوچاؤ تھے دل میں، یہ نہ سمجھے تھے کہ ہم یوں — سہہ سہہ کے ترے جور و ستم بیٹھ رہیں گے

1۔ فتو = نام ہے جیسے فتح خاں کی عرفیت ہو 2۔ بَو = باؤلی کا مخفف (اگر ٹھنڈا پانی پینا ہے تو فتو کی باؤلی میں ملے گا) 3۔ ہزارہ = پھول کا نام 4۔ زَلو = جونک 5 - چُنّی = الماس کے چھوٹے ریزے 6۔ باندھنوں = بل، لپیٹ 7۔ چکارا = ہرن کی نسل کا جنگلی جانور

ہم اب تو چلے ہیں سفر، اس راہ میں ہم کو یاری جو نہ دیویں گے قدم، بیٹھ رہیں گے
مت ہم کو تم آزردہ کرو، دیکھو کہیں ہیں پچھتاؤ گے گر کھا کے قسم بیٹھ رہیں گے
کعبے کی زیارت کو کب آؤ گے صنم تم نومید ہو جب اہلِ حرم بیٹھ رہیں گے؟
سمجھے تھے نہ ہم یہ کہ محبّان و عزیزاں جا کر طرفِ ملکِ عدم بیٹھ رہیں گے
.اب یوں ہی جو ٹھہری تو کسی نگری میں ہم بھی لے اُن کی جدائی کا الم بیٹھ رہیں گے
تم بیچ میں لاؤ تو میاں مصحفی اُن کو
اک رات کہیں مل کے بہم بیٹھ رہیں گے

451

کی اُس نے جو اپنی مجھے تلوار حوالے میں لے کے وہیں کی یہ دلِ زار حوالے
اُٹھتے ہوئے بالیں سے مری، رات مسیحا بولا کہ خدا کے ہے یہ بیمار حوالے
جس دم وہ لگا چھوڑنے اقلیمِ جنوں کو کی قیس نے اپنی مجھے دستار حوالے
لے گبر و مسلمان کا قضیہ ہی چکایا دونوں کے میں کیں سبحہ و زنار حوالے
افتادہ جورہ میں ہے تری، سر کو کر اُس کے اک ناز کی ٹھوکر، دمِ رفتار حوالے
وہ جنسِ زبوں ہوں میں کہ لے ہاتھ میں جس کو بائع کو کرے پھیر خریدار حوالے
قاتل ہی کی مرضی نہیں اِس بات پہ ورنہ سر تیغ کے کرتا یہ گنہگار حوالے
اب دیکھیے آئینے کی ہو کیوں کے رسائی زلفوں کو ہوئے ہیں ترے رخسار حوالے
گالی نہیں دیتا ہے تو کر آج بلا سے خنجر ہی کوئی اے بتِ خوں خوار حوالے
بیش آمدِ مجنوں ہوئی سرکار میں جب سے کی عشق نے اپنی اُسے سرکار حوالے
ملتا تھا جہاں ناز و ادا سادہ رخوں کو واں مجھ کو ہوئی خوبیِ گفتار حوالے
مانگے جو کوئی مصحفی افسونِ محبت
کر لکھ کے تو اُس کو مرے اشعار حوالے

452

چرخ پر ہیں غبار کے ٹکڑے یا دلِ داغ دار کے ٹکڑے
لختِ دل یوں ہوا میں پھرتے ہیں جیسے ابرِ بہار کے ٹکڑے
تیغ ہاتھ آئے گر مرے تو کروں اِس شبِ انتظار کے ٹکڑے
پوچھتا کیا ہے حالِ جیبِ جنوں ہوگئے تار تار کے ٹکڑے
جب لحد میں بھی ہو یہ بیتابی ہوں نہ لوحِ مزار کے ٹکڑے؟
اے کہ دل کو جلا کے تو نے کیا جیسے ترقیں[1] انار کے ٹکڑے
نہ کروں میں تو مصحفی ہی نہ ہوں
تیرے اور تیرے یار کے ٹکڑے

453

بارہ وفات[2] میں چل، پیارے کہ گھات بھی ہے ہے ایک تو اندھیری اور پہلی رات بھی ہے
میں بات میں گر اُس کی بولوں تو یوں سناوے کیوں بولتا ہے ناحق، کچھ تیری بات بھی ہے
روزِ وصال جس کو کہتی ہے خلق وہ ہی مذہب میں عاشقوں کے روزِ وفات بھی ہے
ہر چند وہ پری رُو دیتا نہیں مجھے رخ پر ساتھ بے رخی کے اک التفات بھی ہے
شیطاں جسے کہیں ہیں کر دل میں غور ناداں انسان کے مقابل یہ پاک ذات بھی ہے
ہے ایک تو تواتر پردوں کا، چلمنوں کا ساتر[3] کے در کے آگے تس پر قنات بھی ہے
اتنا بھی مصحفی تو بے سُدھ نہ رہ جہاں میں
انساں کے ساتھ آخر موت وحیات بھی ہے

454

تھی کل گلاب کی جو ترے ہات میں چھڑی کرتی تھی کارِ تیغ اشارات میں چھڑی

1۔ ترقنا = چٹخنا (عوامی) انار سے آتشبازی کا انار مراد ہے 2۔ بارہ وفات = عید میلادالنبی کا میلہ
3۔ ساتر = چھپنے والا، پردہ نشین، یہاں مستور کے معنی میں استعمال کیا ہے

آنسو کا تار لختِ جگر سے گُتھا ہے یوں — گل مہندی کی ہو جیسے کہ برسات میں چھڑی
تنہا نہ شاخِ گُل ہی ہے مجنوں کی دل خراش — ہے چوبِ بید کی بھی مکافات میں چھڑی
کیا پھول کھل رہے ہیں، مزہ ہو جو دختِ رز — آوے چلی، تو ایسے طلسمات میں چھڑی[1]
آیا نہیں چمن میں جو وہ گُل بدن نسیم — ہے چوبِ گُل کی کس سے اشارات میں چھڑی
بزمِ بتاں بھی بزمِ عروسی سے کم نہیں — جو ہے نئی طرح کی ہر اک بات میں چھڑی
تعزیرِ جرمِ عشق نہ ہو کس طرح کہ یاں — ہر لحظہ تازیانہ ہے، ہر بات میں چھڑی
لختِ جگر سے گوندھیے گر اپنی آہ کو — تیار ہو سکے ہے یہ اک رات میں چھڑی

ہے مصحفی سے اُس کی جو سر چوٹ باغباں
ڈالی[2] کی جا بھی بھیجے ہے سوغات میں چھڑی

455

آیا لیے ہوئے جو وہ کل ہات میں چھڑی — آتے ہی جڑ دی پہلی ملاقات میں چھڑی
گلبن کا لطف دیکھ کہ شبنم کے دانوں سے — ہیرے جڑی ہوئی ہے، ہر اک پات میں چھڑی
اس جرم پر نہ دستِ معلم قلم کروں — شفتالو[3] کی لگی ہے تری گات میں چھڑی
اس چوبدار[4] کے سے مری کیوں کے پیش جائے — دکھلاوے ہے وہ مجھ کو ہر اک بات میں چھڑی
جب سے سٹک[5] گیا تو مری جاں میں ہو گیا — دوری سے تیری سوکھ کر اک رات میں چھڑی
اک دن چھوا تھا اُس کے میں بندِ ازار کو — سولگتیاں ہیں اِس کی مکافات میں چھڑی

اے مصحفی نہ کیوں کے کر ڈریں تجھ سے نیک و بد
حاکم کی ہے، قلم یہ ترے ہات، میں چھڑی

456

تنہا تو مجھے چھوڑ نہ جا، میں ترے صدقے — تاریک ہے شب، مان کہا، میں ترے صدقے

1۔ چھڑی = اکیلی، تنہا (روزمرہ) 2۔ ڈالی = تحفہ میں پھل وغیرہ جو بھیجتے ہیں اُسے ڈالی کہتے ہیں (روزمرہ)
3۔ شفتالو = گہرے سرخ رنگ کا پھل (Peach) 4۔ چوبدار کے سے = چوبدار کا لڑکا، اولاد (عوامی)
5۔ سٹکنا = چپکے سے کھسک جانا

گھر جا کے اسے کیجو جدا اپنے بدن سے رستے میں تو برقع نہ اُٹھا، میں ترے صدقے

کیا جانیے دیکھے کوئی کس طرح سے تجھ کو ہر ایک کو مکھڑا نہ دکھا، میں ترے صدقے

میں غیر نہیں، عاشقِ جانباز ہوں تیرا مجھ سے بدن اپنا نہ چھپا، میں ترے صدقے

کہتا ہوں تصور سے ترے میں یہی ہر شب ہے ہے تو مرے پاس تو آ، میں ترے صدقے

آنکھوں میں دم آیا ہے مرا، واسطے تیرے اک دم تو مجھے دیکھ تو جا، میں ترے صدقے

گھبرا کے کروں تجھ سے گر اظہارِ محبت عاشق میں ہوں، تو ہو نہ خفا، میں ترے صدقے

آخر یہ دلِ غم زدہ دل ہے، اسے اتنا مت رکھ تو گرفتارِ بلا، میں ترے صدقے

اک دن تو ملا دے مجھے معشوق سے اپنے بندہ ہوں میں، اے میرے خدا میں ترے صدقے

اے دل یہیں رہنے سے ترے چین ہے مجھ کو مت ہو مرے پہلو سے جدا، میں ترے صدقے

پٹکا جو مرا شیشۂ دل، اُس نے زمیں پر اُس سے بھی یہی نکلی صدا، میں ترے صدقے

جب مصحفیِ خستہ کی بالیں سے چلا یار

مرتے ہوئے بھی اُس نے کہا "میں ترے صدقے"

457

ہجر کی شب بس چار پہر تک دل کو اک بے تابی ہے

آنکھ نہیں اک پل بھی لگتی وحشت ہے بدخوابی ہے

رنگ پر اس کے کُرتے کے جی کیونکے اُلجھ کر ڈوب نہ جائے

کوکابیلی[1] بعض کہیں ہیں، بعض کہیں ہیں آبی ہے

بن ٹھن کر ہر ایک کے گھر جو وہ بتِ کافر جاتا ہے

اُس کا کیا بگڑے ہے اس میں، میری خانہ خرابی ہے

کوئی دیارِ خوباں میں بس مہر و وفا کا نام نہ لو

اور سبھی چیزیں ہیں یاں، اس جنس کی اک نایابی ہے

1۔ کوکابیلی = رنگ قسم، گل نیلوفر کا رنگ

حسنِ کفِ پا کا تو اُس کے کر لے قیاس اس سے ہی دلا
ماہ نہیں یہ چرخ پر، اُس کی جوتی کی مہتابی[1] ہے

کعبۂ حسن و جمال ہے گویا روے مخطط اُس بت کا
جس کے ہر ابرو کا خم ہم طاقی ہم محرابی ہے

یاد میں کس کی فندقِ پا کے مصحفی روتا ہے تو لہو
آنسو کا جو رنگ ترے اِس سرخی پر عنابی ہے

458

دم لوں ہوں جس درخت کی میں چھانو کے تلے — کہتا ہے وہ کہ چل، نہ ٹھہر گانو کے تلے
کیا ہی لچک کمر میں نزاکت سے پڑ گئی — دامن شب اُس کا آ جو گیا پانو کے تلے
یا رب ہو اس طرح کی بواسیر شیخ کو — جو دکلے[2] خوں کے چھپ نہ سکیں پانو کے تلے
کل کتنے مُوش[3] کہتے تھے مذکورِ گربہ پر — کیا کیجے ہم دبے ہوئے ہیں میانو کے تلے

بھیجا تھا مصحفی کو جو خط لکھ کے شوخ نے
دشنام تھے سلام کی جا نانو[4] کے تلے

459

آنکھوں میں اُس کی میں نے جو تصویر کھینچ لی — سرمے نے اُس کی چشم کی شمشیر کھینچ لی
زندانیانِ عشق کو یا رب یہ کیا ہوا — پانو کی اُن کے کس نے یہ زنجیر کھینچ لی
اس جذب کا بھی ہوں میں دوانا کہ یار نے — نظروں میں میرے اشک کی تاثیر کھینچ لی
خط کا جواب ہم سے ترے تب لکھا گیا — تصویر تیری جب دمِ تحریر کھینچ لی
کر کے دراز ہاتھ میں کتنا خجل ہوا — شانے نے جب وہ زلفِ گرہ گیر کھینچ لی
ہندوستاں میں دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی — کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

1۔ مہتابی = پاتابہ 2۔ دکلے = دھبّے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے 3۔ مُوش = چوہا
4۔ نانو = نام (عوامی)

تو نے تو مصحفی پہ بڑا یہ ستم کیا
قالب سے جاں بھی او بتِ بے پیر کھینچ لی

460

ہے ایک تو آفت شبِ ہجراں کی سیاہی
گھوٹے ہے گلاتس پہ یہ زنداں کی سیاہی

گر مجھ کو کوئی دیوے ابھی رخصتِ بوسہ
لوں چوس میں خالِ لب جاناں کی سیاہی

کاجل تری آنکھوں کا لگے اس سے تو مجھ کو
بدنام کرے کیوں نہ گریباں کی سیاہی

خورشید کو پردے میں چھپا رکھا ہے اُس نے
اللہ رے تری زلفِ پریشاں کی سیاہی

شاید کہ کوئی ناقہ سوار آئے ہے، مجنوں
بے وجہ نہیں گردِ بیاباں کی سیاہی

صاف آنے میں اس کے ہے یہ آشوبِ قیامت
دریا میں اُٹھے جیسے کہ طوفاں کی سیاہی[1]

مسّی نہ لگانا میں کہا اِس میں ہے تہمت
چھٹنے کی نہیں پھر بُنِ دنداں کی سیاہی

تو ساتھا[2] سفر میں ہے مرے دیکھیے کیا ہو
اور سامنے ہے شامِ غریباں کی سیاہی

وہ کون سا تارا ہے کہ لڑتی نہیں جس سے
راتوں کو ترے خالِ زنخداں کی سیاہی

مسّی جو لگائی لبِ جاں بخش پر اُس نے
ہم سمجھے اُسے چشمۂ حیواں کی سیاہی

صدقے میں گیا کتنی بھلی لگتی ہے مجھ کو
ساتھ آنکھوں کی سرخی کے یہ مژگاں کی سیاہی

ہم کعبۂ مقصود کی منزل کو نہ پہنچے
آئی نہ نظر ہم کو مغیلاں کی سیاہی

اونچی ہو کئی بار یوں ہی رہ گئی موقوف
اِس بادیہ میں گردِ بیاباں کی سیاہی

اے مصحفی روتا ہوں میں اُس خال کے غم میں
بہہ جائے نہ کیوں دیدۂ گریاں کی سیاہی

461

دلا ایک دن خاطرِ یار، رکھ دے
یہ سر کاٹ کر زیرِ دیوار رکھ دے

1۔ طوفان کی سیاہی = آثار 2۔ ساتھا = ساتھ (عوامی)

ترا کشتہ کہتا ہے چتون میں تجھ سے سرہانے مرے اپنی تلوار رکھ دے
اُٹھا لے اُسے جان، پانو پہ تیرے جو سر کوئی مجھ سا گنہگار رکھ دے
مزہ ہو کہے تو شبِ وصل مجھ سے ذرا اُٹھ کے کھونٹی پہ یہ ہار رکھ دے
کوئی بار بار اُس کو کیا بھیجے کاغذ جو خط پڑھ کے آتش پہ یک بار رکھ دے
خریدار ہیں تیغِ ابرو کے لاکھوں تو نام اس کا، کچھ پہلے خونخوار، رکھ دے
نگہ تیری رستم سے کہتی ہے ڈٹ کر ''مرے سامنے اپنے ہتھیار رکھ دے''
تو اے بلبل آخر ہوئی ایک دم میں بس اب عارضِ گل پہ منقار رکھ دے
خمارِ محبت میں کیا سوچتا ہے کمر کھول، سر پیچ دستار رکھ دے
بتاں ایسے کافر سے پھر کیوں نہ اُلجھیں جو مَل دَل کے آتش پہ زنار رکھ دے
نہ غم اور کھا قبرِ عاشق کا لیکن سرہانے دیا تو شبِ تار رکھ دے

وہ اے مصحفی آج سوتا ہے غافل
تو رخسار پر اُس کے رخسار رکھ دے

462

ملنے کو جو تم چاہو تو ہے بات ذرا سی اک آن میں ہوتی ہے ملاقات ذرا سی
گھٹتی ہے شبِ وصل تو کہتا ہوں میں یارب کیا تجھ کو بنانی تھی یہی رات ذرا سی
خورشید اسی تاک میں سرگشتہ ہے اب تک روزن سے جو دیکھی تھی تری گات[1] ذرا سی
گر ہو نہ سپاری تو کوئی دیجیو بُن[2] ہی کافی ہے تری ہم کو عنایات ذرا سی
مثلِ مہِ نو بام پہ شب چھپ گیا کیسا دکھلا کے جبیں اپنی وہ بذات ذرا سی
نرگس تری آنکھوں کو بہت دیکھ رہی ہے ہو جاوے نگاہوں میں مکافات ذرا سی

خشخاش کے دانے پہ یہ جوں مور[3] ہے قانع
ہے مصحفیِ خستہ کی اوقات ذرا سی

1۔ گات = بدن 2۔ بُن = قہوہ کے دانے 3۔ مور = چیونٹی

463

ہم گئے جان سے اور آپ نہ گھر سے نکلے　اور جو نکلے تو خدا جانے کدھر سے نکلے

در جو معمولی ہے اُس پر تو میں بیٹھا ہی رہا　آج شاید کہ صنم دوسرے در سے نکلے

چاہیے حور، نہیں مانی و بہزاد کا کام　تیری تصویر یہ ممکن ہے بشر سے نکلے؟

حیف ہے محملِ لیلیٰ نہ نمودار ہوا　یوں تو محمل کئی یاں گردِ سفر سے نکلے

رکھ کے دستار سجا آپ نے مردانہ لباس　رات تم نکلے تو، پر زور ہنر سے نکلے

اُڑ چلیں کیوں نہ شجر باغ کے ایامِ بہار　پتے شاخوں سے ہرے توتے کے پر سے نکلے

لے کے خنجر جو جگر چاک کیا اُس نے مرا　ٹکڑے الماس کے دو چار جگر سے نکلے

خط کا آغاز ہے چہرے پہ، مِلا کیجیے کبھی　اب تو، اے جان مری، خوف و خطر سے نکلے

سینہ تھا کانِ بدخشاں جو خیالِ لب میں　لعل و یاقوت ہی شب دیدۂ تر سے نکلے

مصحفی کے تئیں ٹھگ مار کے نادم ہے کہ ہائے
پیسے سلپٹ[1] سے کئی اُس کی کمر سے نکلے

464

نالے سے میرے سقفِ عرشِ بریں نہ ٹوٹے　ڈرتا ہوں کچھ فلک پر آفت کہیں نہ ٹوٹے

واں تارِ نور کی ہے ٹوپی اُنھوں کے سر پر　آنسو کا تار یاں بھی چشمِ نمیں نہ ٹوٹے

تو پاس بیٹھ لیکن اتنا لحاظ رکھیو　شیشہ ہمارے دل کا اے ہم نشیں نہ ٹوٹے

فرہاد بیستوں کو تیشے سے کیوں کے کھودے　جب ٹانکیوں[2] سے اُس کی پتھر زمیں نہ ٹوٹے

پاتے ہیں کب ادب ہم استادِ آسماں سے　جب تک ہمارے سر پر لوحِ جبیں نہ ٹوٹے

چاہِ ذقن پہ تیرے ٹوٹے ہیں آ کے پیاسے　ڈرتا ہوں اِس کنویں کا پانی کہیں[3] نہ ٹوٹے

ٹکرائے شیخ جیو کا پینک[4] سے جب کہ ماتھا　گھوڑے کا پھر یہ اُن کے فرپوشِ زیں[5] نہ ٹوٹے

1۔ سلپٹ = پُرانے چکنے گھِسے ہوئے سکّے 2۔ ٹانکی = چوٹ 3۔ ٹوٹ پڑنا = ہجوم کرنا، پانی ٹوٹنا = کنوئیں سے زیادہ پانی نکالنے پر جب کم رہ جاتا ہے تو اُسے پانی ٹوٹنا کہتے ہیں 4۔ پینک = نشے کی جھونک 5۔ ایسا زین جس پر فر کا غلاف ہے، یہ فتراکِ زیں بھی ہوسکتا ہے

مجلس میں مستِ مے تو آیا ہے مجھ کو ڈر ہے   شیشہ کسی کے دل کا اے نازنیں نہ ٹوٹے
کب قتلِ عاشقاں سے وہ ہاتھ اُٹھائے اپنا   جب تک نئی طرح سے روز آستیں نہ ٹوٹے

کہہ اور بھی غزل اک اے مصحفی تو اس میں
پر سلسلہ سخن کا جو ہے کہیں نہ ٹوٹے

465

کیوں دل میں خارِ حسرت اے ہم نشیں نہ ٹوٹے   جب فصلِ گل میں ہم سے غنچہ کہیں نہ ٹوٹے
ناقے کو ٹک بچا کر سائے سے اُس کے لے چل   مجنوں کا بیدِ مجنوں[1]، محمل نشیں نہ ٹوٹے
تصویر کو تو اس کی ٹک احتیاط سے رکھ   بستے میں یہ ورق اے نقاشِ چیں نہ ٹوٹے
میں بوسہ بازیوں سے آتا ہوں باز کوئی   مسّیِ لب کا جب تک حصنِ حصیں[2] نہ ٹوٹے
کشتے کے تیرے سر پر کوہِ گرانِ غم ہے   مت باندھ اُس کو اس سے فتراکِ زیں نہ ٹوٹے
اک چپھنی[3] میں بنے کب پھولوں کا اُس کے گہنا   بھر ٹوکرا چمن سے تا یاسمیں نہ ٹوٹے
زلفِ شکستہ کے ہے نقشے کا زور عالم   کیوں کر کے اس پہ عالم نقاشِ چیں نہ ٹوٹے
الجھے تو ہے تو مجھ سے پر میں نے کہہ دیا ہے   پھولوں کا ہار تیرا اے نازنیں نہ ٹوٹے
اے دل لپٹ تو اس سے، پر اتنا ہوش رکھیو   نادِ علی[4] کا اس کے ڈورا کہیں نہ ٹوٹے
کھا کر کے سنگِ لیلیٰ کہتا گیا یہ مجنوں   ٹوٹے جو کاسۂ سر کیوں کر جبیں نہ ٹوٹے
تو اے صبا اُنھوں سے اُلجھے ہے بے محابا   ڈرتا ہوں کوئی اُس کا موئے جبیں نہ ٹوٹے
زیرِ زمیں چھپے ہیں جو آسماں سے، مجھ کو   ڈر ہے کہ آسماں ہو اُن پر زمیں نہ ٹوٹے

اے مصحفی نہ ہوگی نالے سے دل کو واشد
جب تک کہ یہ طلسمِ چرخِ بریں نہ ٹوٹے

1۔ بیدِ مجنوں = ایک درخت جسے انگریزی میں Weeping willow کہتے ہیں
2۔ حِصنِ حصین = مضبوط قلعہ   3۔ چپھنی = چھوٹا مٹی کا برتن، کٹورا (روزمرہ)
4۔ نادِ علی = ایک دعا ہے جس کو پڑھتے ہیں اور تعویذ بنا کر گلے میں ڈالتے ہیں نادِ علیاً مظہر العجائب الخ

466

خدنگِ شرم و حیا کا شکار رہنے دے　　نہ منھ لگا تو بہت مجھ کو، خوار رہنے دے
تو بے حواس نہ ہو میری بے قراری سے　　میں بے قرار ہوں تو بے قرار رہنے دے
دکھا نہ آنکھ تو آنکھوں کو میری چاہت کی　　اُنھوں کو بامژۂ اشک بار رہنے دے
ترے خیال کا آئینہ ہے دو چار مرے　　ابھی یہ آئینہ میرے دو چار[1] رہنے دے
اسی طرح سے کئی روز میری آنکھوں کو　　شبِ فراق میں اختر شمار رہنے دے
اِس اپنے غمزۂ چالاک کو ابھی اے شوخ　　سمندِ ناز پہ یوں ہی سوار رہنے دے
نہ میرے تارِ گریباں کو جمع کر شبِ وصل　　مرے گلے کا ہوئے اب تو ہار، رہنے دے

نہ مصحفی کو لگا منھ بہت کہ ہے یہ ذلیل
اسی طرح سے اسے خوار و زار رہنے دے

467

سو بار دن بھی ہووے گا اور رات ہووے گی　　کاہے کو اپنی تجھ سے ملاقات ہووے گی
کچھ کچھ جو زیرِ لب مجھے کہتا گیا ہے شوخ　　سوچوں ہوں میں کہ کیا وہ اشارات ہووے گی
وہ شب حسابِ سال میں رکھیں گے ہم میاں　　گر ہم پہ ایک شب بھی عنایات ہووے گی
کیوں داغِ عشق اور جہاں میں کوئی نہیں؟　　چھاتی مری ہی موردِ آفات ہووے گی
آنکھیں ہیں خشک ان سے جو آوے گی سیلِ[2] اشک　　گویا کہ خشک سال میں برسات ہووے گی
کہتے تو ہیں جو یار ملے اُس سے یوں کہیں　　پر آگے اُس کے ہم سے کوئی بات ہووے گی؟
رہ میں چلے ہی جاتے ہیں یارب میں کیا کروں　　ملنے کی اُس کے کون سی شب گھات ہووے گی
رستے میں اُس کو ہم سے ملا دے گا تو اگر　　تو جذبِ عشق تجھ سے کرامات ہووے گی
نامے کو اُس کے کھول کے مجلس میں کیوں پڑھیں؟　ق　ہم جانتے ہیں اِس میں خرافات ہووے گی

1۔ دوچار = سامنے، مقابل　2۔ سیل کو مؤنث باندھا ہے

دشنام لکھے ہوئیں گے القاب کی جگہ — جاے سلام بھی یہی صلوات[1] ہووے گی

اک شب میں خواب میں اسے دیکھا تھا مصحفی
کہتا ہوں جی میں پھر بھی وہی رات ہووے گی؟

468

اک زخم میں ہووے گی نہ بسمل کی تسلی — اتنی کوئی کر دیجیو قاتل کی تسلی

جب تک نہ پھرے نجد میں ناقے سے اُتر کر — محمل میں ہو کیا صاحبِ محمل کی تسلی

محفل سے نہ جا اُٹھ کے تو اے ماہِ دل افروز — یعنی ترے ہونے میں ہے محفل کی تسلی

آوارہ وہ صحراے جنوں کا ہوں میں یارب — جس کو نہ مقام اور نہ منزل کی تسلی

تصویر ہی کھنچوا کے تو اک اپنی دلا بھیج — ہووے کسی صورت تو مرے دل کی تسلی

کہتی ہے حیا یوں اسے دشنام نہ دیجے — اک جنبشِ لب میں ہو جو سائل کی تسلی

مر جائے جو مجنوں تو ابھی ہوتی ہے یارو — اک آن میں لیلیٰ کے قبائل کی تسلی

سمجھائے سے سمجھے ہی نہ جب مصحفی اے وائے
کس طرح کرے پھر کوئی جاہل کی تسلی

469

دیکھ اُس کی شب وصل میں اوسان ہمارے — پھر پھر کے فلک ہووے ہے قربان ہمارے

یاں پہلی ہی تاریخ سے آگ ان کو لگی ہے — دن خاک پھریں گے مہ شعبان[2] ہمارے

اک روز تو چھاتی سے ہمیں اپنی لگا لے — تا جی سے نکل جاویں سب ارمان ہمارے

جب ہو نہ سکا ضبطِ غمِ عشق تو آخر — کیا پھوٹ بہے دیدۂ گریان ہمارے

اے بادِ صبا تُند نہ چل، جاے ادب ہے — اوراق ہیں دیواں کے پریشاں ہمارے

کل پان کا رنگ آئینے میں دیکھ وہ بولے — کیا لال ہوئے ہیں لب و دندان ہمارے

1۔ صَلوات (بہ سکون لام نظم کیا ہے) سرزنش 2۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ شعبان میں تقدیر کے فیصلے بدلتے ہیں

جاتے تو ہیں ہم آئینہ خانے میں بہت لیک آئینے بھی رہ جاتے ہیں حیراں ہمارے

دل تجھ سے نہ بیزار ہوا، تیری طرف سے ہر چند کہ یاروں نے بھرے کان ہمارے

میں تیغِ نگہ کھا کے نہ تڑپا تو وہ بولے عاشق ہوئے ہیں ایسے یہ بے جان ہمارے

ہے ہے نہ رہے کوہ کن و وامق و مجنوں تھے یہ جو کئی سلسلہ جنبان ہمارے

پہنے ہوئے دیکھا ہے اُسے سرخ جو جامہ ہے دجلۂ خوں تا بہ گریبان ہمارے

اے مصحفی اک تازہ غزل اور سناویں
مشتاق ہیں آخر تو سخن دان ہمارے

470

نکلے نہ شب وصل بھی ارمان ہمارے افسوس کہ جی ہی میں موئے مان ہمارے

ہر چند کہ مدفون ہیں ہم کوے مغاں میں جنت میں پڑھے جاتے ہیں قرآن ہمارے

چھپنے کو کہا میں نے تو جھنجلا کے وہ بولے آئے ہیں کہاں سے یہ نگہبان ہمارے

جو ہے سو تمھارا ہی طرف دار ہے صاحب ہندو ہیں ہمارے، نہ مسلمان ہمارے

مجنوں کی یہ حالت ہے کہ اب ہل نہیں سکتا کل ساتھ چلا تھا کئی میدان ہمارے

سوتا ہے وہ جب ساتھ تو جی چاہے ہے اپنا اک پنکھڑی گل کی نہ ہو درمیان ہمارے

پھولوں کے نشاں صبح کو دکھلا کے وہ بولا یہ سوتے میں چبھ گئے کئی پیکان ہمارے

کہتا تھا وہ شب ڈال کے بانہوں کو گلے میں گردن پہ تری ہیں کئی احسان ہمارے

اس شور سے اے دل تو نہ فریاد کیا کر نالوں سے ترے پھوٹ گئے کان ہمارے

کیوں کر نہ غزل تیسری اے مصحفی لکھیے
یہ قافیے ہیں سلسلہ جنبان ہمارے

471

خط لے کے یہاں سے گئے انسان ہمارے پر آپ نہ آئے کسی عنوان ہمارے

گہ شہر میں، گہ دشت میں، گہ کوہ میں پھرنا
اوقات ہیں مدت سے پریشان ہمارے

آتی ہے کسی گھر سے جو آواز تری سی
لگ جاتے ہیں اُدھر ہی کو بس کان ہمارے

خواہش کے دنوں میں وہ ملے غیر سے جا کر
القصہ گئے یوں نکل ارمان ہمارے

جاتا ہے اگر غم، تو کرم کرتی ہے وحشت
ہر روز نیا آوے ہے مہمان ہمارے

شب کر کے بناؤ آئے تو گرمی سے یہ بولے
اس وقت تو ہو اُٹھ کے تو قربان ہمارے

خواہش سے میں دیکھا تو لگے کہنے کہ اے واہ
کچھ آج بہت آپ ہیں حیران ہمارے

کیا سمجھے وہ پیچیدگیِ عشق کا مضموں
ہیں حرف بھی نامے کے تو گنجان ہمارے

رسوائیِ الفت کا بُرا ہووے الٰہی
احباب گئے ہیں ہمیں پہچان ہمارے

قاصد نے خبر تس پہ سنائی وہ کہ جس سے
اب تک بھی ٹھکانے نہیں اوسان ہمارے

اور اس سے سوا مصحفی کیا ہووے گی شہرت
جیتے ہی لکھے جاتے ہیں دیوان ہمارے

472

وہ شب کہنے لگا کر کے نظر بیمار پر اپنے
کہ یوں ہی سیکڑوں مر مر گئے دیدار پر اپنے

بنایا باغباں نے جمع کر جاروبِ باغ اُن کو
چمن میں رہ گئے تھے جھڑ کے جو دو چار پر اپنے

میں سر پاؤں پر اس کے رکھ دیا ناچار ہو اک دن
جھگڑتا تھا وہ مجھ سے سایۂ دیوار پر اپنے

تری رفتار نے اب اور ان کو دھج جو دکھلائی
بھچک[1] کبکِ دری بھی رہ گیا کہسار پر اپنے

کہیں کچھ حرف بے جا سامنے اُس کے جو نکلا تھا
طمانچے مارتا تھا گل کھڑا رخسار پر اپنے

فلک سچ کہیو تو مجھ سے کبھی وہ شب بھی آوے گی
کہ آوے گا وہ میرے گھر چلا اقرار پر اپنے

غزل اب دوسری اے مصحفی میں پڑھ سناتا ہوں
کہ عالم دل فریبی کا ہے اک اشعار پر اپنے

1۔ بھچک = حیران، ششدر، بھونچکا

473

نظر کر آئینے میں ایک دن رخسار پر اپنے
کہ رحم آوے تجھے بھی خود بہ خود بیمار پر اپنے

گلے رکھے تھے مشتاقوں نے یاں تلوار پر اپنے
شب آئے کر کے وعدہ خوب تم اقرار پر اپنے

دلِ خوں گشتہ میرا بھی نہیں کچھ گل سے کم پیارے
رکھے تو جائے گل گر گوشۂ دستار پر اپنے

حنا بندی کی شب جب اُس پری پیکر کی آئی ہے
مجھے آتا ہے رونا دیدۂ خوں بار پر اپنے

گریباں پھاڑ ڈالے اس ادا پر جامہ زیبوں نے
وہ رکھ کر آستیں بیٹھا تھا کل رخسار پر اپنے

کھڑا در پر یہ حرف از راہِ نازش کل وہ کہتا تھا
ہوئے ہیں سیکڑوں خوں سایۂ دیوار پر اپنے

سوالِ وصل میں کرتا تھا اس سے، کچھ جو یاد آیا
تو آپ بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا انکار پر اپنے

گرا کل ایسی صورت سے ترے رستے میں وہ ظالم
کہ پیکانوں کو رحم آیا دل بیمار پر اپنے

کل آئینے میں مکھڑا دیکھ کر اپنا لگا کہنے
بہارِ گل بھی صدقے کیجیے رخسار پر اپنے

شبِ وصل آوے ممکن ہے، یہ ممکن ہی نہیں، آوے
وہ ماہ خانگی اے مصحفی اقرار پر اپنے

474

کیا قہر ہے کسی کو جو جی چاہنے لگے
بوس و کنار اُس کا سبھی چاہنے لگے

انساں کا کیا ہے ذکر، کہ وہ اور جنس ہے
دیکھے گر اُس پری کو پری چاہنے لگے

شورش کے دن ہیں موسمِ گل، اِس کا کیا عجب
بے قصد اگر کسی کو کوئی چاہنے لگے

دیکھے جو اُس کی صورتِ عابد فریب کو
روح القدس، تو وہ بھی ابھی چاہنے لگے

چاہوں ہوں جی سے میں اُسے جس طرح مصحفی
کیا لطف ہو گر اُس کا بھی جی چاہنے لگے

475

کس ناوکِ نگاہ کا یہ دل شکار ہے
کہتے ہیں سب کباب کے قابل شکار ہے

مجنوں جہاں ہو کاش کوئی بول اُٹھے یہاں اِس بادیہ میں صاحبِ محمل شکار ہے
کہتے ہیں دیکھ دیکھ تڑپ دل کی اہلِ ہوش تیرِ نگہ کا کس کے یہ بسمل شکار ہے
پا بوس کا نہیں جو ارادہ تو کس لیے ہر لحظہ رو بہ دامنِ قاتل شکار ہے
گھوڑا وہ ڈپٹے آوے ہے[1] پیچھے سے یا نصیب دل بیٹھ بیٹھ جاوے ہے گھائل شکار ہے
مرضی شکار ہووے اگر شاہِ حسن کی تو دشتِ عشق میں یہی منزل شکار ہے
ہے جائے رحم صیدِ دلِ مصحفی پہ ہائے
ناوک کشش میں اور یہ غافل شکار ہے

476

غیر سے گرم ملو، ہم پہ یہ بیداد رہے اور تو کیا کہیں ہم تم سے بھلا یاد رہے
پنجۂ ضبط سے گھوٹے ہے گلا میرا وہ شوخ تا نہ اتنی بھی مجھے طاقتِ فریاد رہے
اور کچھ ہو کہ نہ ہو بس یہی جی چاہے ہے سامنے آنکھوں کے اک شکلِ پری زاد رہے
دوں تسلی اُسے کر تیری طرف سے تأمین[2] آہ و نالے سے جو ٹک بھی دلِ ناشاد رہے
جستجو اس کی میں، ہر لحظہ بگولے کی طرح عشق چاہے ہے مری خاک بھی برباد رہے
جب ہو مقتول کی قاتل سے تمنا کچھ اور کیوں نہ حیران تہِ خنجرِ جلّاد رہے
طرفہ زنجیرہ ہے اِس دام گہِ دنیا کا ہے بڑا مرد وہی اِس سے جو آزاد رہے
دیکھ کر عارض و قد اُس کا یہ مذکور ہے کیا سر میں قمری کے ہوائے گل و شمشاد رہے
گھر سے آصف کے ہے اے مصحفی سب کی روزی
گو ہو ویران کوئی، پر یہ گھر آباد رہے

477

مجلسِ قرب میں گر اُس کی ہمیں راہ ملے دن کو آ مہر ملے ہم سے، تو شب ماہ ملے
متردد[3] ہیں سبھی خورد و بزرگ اپنے لیے کہ رسائی ہمیں تا بارگہِ شاہ ملے

1۔ ڈپٹے آوے ہے = دوڑتا ہوا آتا ہے 2۔ تأمین = یقین دلانا، تسلی دینا 3۔ متردّد = فکرمند

میں نے کس روز خدایا یہ دعا مانگا تھا کہ عوض عیش کے مجھ کو غمِ جاں کاہ ملے
بارے اے شرمِ محبت جو وہ آجاوے دو چار[1] مجھ کو اُس دم تو بھلا رخصتِ یک آہ ملے
عید کا دن ہے، تو ہر اک کے گلے ملتا ہے خاک میں گو یہ ترا بندۂ درگاہ ملے
اک گدائی ترے در کی میں طمع رکھتا ہوں نہ تمنا ہے حشم کی، نہ کہوں جاہ ملے
مصحفی زیست بسر کیوں کے ہو اپنی بتلا
عمر گزری نہ تبرک ہے نہ تنخواہ ملے

478

افسوس چھوڑ کر کے ہمیں تم سفر گئے حسرت یہ رہ گئی کہ خبر بھی نہ کر گئے
تم نے تو اپنے دل کی خوشی یوں نکال لی سنتے ہی اس خبر کے، بھلا ہم تو مر گئے
دل دو دو ہاتھ سینے میں اُچھلا کیا مرا کیا کیا شبِ فراق میں صدمے گزر گئے
ہم دیکھتے تھے تم کو کبھی جس گلی میں آہ اب اُس گلی سے نکلے تو با چشمِ تر گئے
اک خانماں خراب کے یاں جی پر آ بنی اچھے تم اس محلّے سے اُٹھ اپنے گھر گئے
کرتے تھے گاہ گاہ کرم بندہ خانے میں روتا ہوں میں اُنھیں کو کہ وہ دن کدھر گئے
رہتے ہیں چت چڑھے ہوئے دن رات مصحفی
کیوں کر کہوں وہ اب مرے جی سے بِسر[2] گئے

479

تنہا نہ آسمان کی مٹّی خراب ہے عالم میں اک جہان کی مٹّی خراب ہے
جس کو کیا تھا اُس نے نشاں اپنے تیر کا اب تک اس استخوان کی مٹّی خراب ہے
گم ہو گیا ہے ناقہ تھلوں[3] میں جو نجد کے لیلیٰ کے ساربان کی مٹّی خراب ہے
لکھتا نہیں ہے ہم کو وہ خط اور مفت میں دن رات درمیان[4] کی مٹّی خراب ہے

1۔ دو چار = سامنے 2۔ بِسرنا (بہ کسرِ با بروزن بکھرنا) بھولنا 3۔ تھلا = ٹیلہ
4۔ درمیان = واسطہ، بچولیا، قاصد

ہم نے تو جا لحد میں کیا بسترا[1] ولے — اِس کہنہ خاک دان کی مٹّی خراب ہے
تو ہی اجل سے اتنی سفارش کر ایک دن — اِس تیرے نیم جان کی مٹّی خراب ہے
جوں شمع کشتہ بات نہیں اُس کی پوچھتے — سچ ہے کہ بے زبان کی مٹّی خراب ہے
لیلٰی کی جستجو میں بھٹکتا پھرے ہے قیس — صحرا میں اُس جوان کی مٹّی خراب ہے

سرگشتہ گرد باد سا پھرتا ہے مصحفی
اس تنگِ خاندان کی مٹّی خراب ہے

480

تم نے پردے میں صنم گرچہ لگائی مسّی — لیک شوخی نے ہنسی کی نہ چھپائی مسّی
ہے دھواں گرچہ وہ کہنے کو، ولے رنگ نہیں — رنگ بے رنگی میں دیتی ہے دکھائی مسّی
جب تلک پان نہ کھایا تھا، نہ تھا یہ عالم — پان کھاتے ہی لبوں تک نظر آئی مسّی
آرسی لے کے ذرا دیکھ تو دانتوں کی بہار — کس نے اِس لطف سے ریخوں[2] میں جمائی مسّی
رنگ ڈھنگ اس میں مسی کا سا ہے سب، پر کوئی — اے پری چہرہ رکھے ہے یہ صفائی مسّی؟
نیم رنگی کا بھی عالم ہے عجب کیجیے جو غور — اُس سے یوں حسن میں گو ہووے سوائی مسّی

مصحفی سن یہ غزل رہ گئی مجلس حیراں
اب وہ پڑھ، تو نے جو ہے صاف بنائی مسّی

481

کیا دھواں دھار صنم تو نے لگائی مسّی — رنگ ہونٹوں پہ ترے زور ہی لائی مسّی
لب پہ تحریر سی تھی عالمِ خاموشی میں — ہنس پڑے وہ تو زباں تک نظر آئی مسّی
دانت اُس مسّی میں تارے سے نہ چمکیں کیونکر — شب دیجور سی دیتی ہے دکھائی مسّی
روشنی شمع کی بجلی سی چمک جاتی ہے — اس کے دانتوں میں یہ رکھتی ہے صفائی مسّی

1۔ بسترا (بجائے بستر) عوامی 2۔ ریخیں = دانتوں کے درمیان کی لکیر

قتلِ عالم نہ کرے کیوں کے کہ اُس کافر نے آج دوکان سے سیفو[1] کی منگائی مسّی
پھیر پھیر اُس نے زباں اپنی یہ کیا سحر کیا پان کی پیک سے ہونٹوں پہ جمائی مسّی

مصحفی اس لب و لہجے کی غزل اور بھی لکھ
یوں ہی ہو قافیوں میں جس کے سمائی مسّی

482

روزِ شادی جو کبھی اُس نے لگائی مسّی پہلے مجھ سوختہ جاں کو ہی دکھائی مسّی
میں تو نظروں سے گرا، اور تو لگی منہ اُس کے بارے تیری ہی ہوئی اتنی رسائی مسّی
اور بھی وصل ہوئی وہ تو لبوں سے کافر جوں جوں اُس شوخ نے تُرشی سے چھڑائی مسّی
خوش دہانوں کی بھی مجلس کا عجب عالم ہے جس طرف آنکھ پڑی واں نظر آئی مسّی
کم نہ تھے آپ بھی خوں ریزیِ عاشق کو ولے پان کے رنگ نے بیداد بنائی مسّی
غنچۂ لالہ نہیں یہ، کہ صنم فصلِ بہار سرخ کاغذ میں ترے واسطے لائی مسّی

مصحفی چاہیے ہو چوتھی غزل بھی تحریر
کیوں کہ رکھتی ہے عجب ہوش ربائی مسّی

483

میں جو بھیجی تو نہ کافر نے لگائی مسّی خاک میں بلکہ مری ضد سے ملائی مسّی
جل گیا رشک کے مارے میں، جو اُس کافر نے عکس کو آئینے میں اپنی دکھائی مسّی
گل کی پتّی پہ لیا شب نے بسیرا آکر لب لعل اپنے پہ یا اُس نے جمائی مسّی
ابر خجلت سے وہیں ہو گیا پانی پانی اُس کے ہونٹوں کی جو پھیلی نظر آئی مسّی
سادگی قہر ہے ہر چند کہ محبوبوں کی لیک رکھتی ہے عجب ڈھب کی صفائی مسّی
لب پہ تو مہرِ خموشی ہے، پہ جی ہی جی میں تجھ سے ہم کرتے ہیں بوسے کی گدائی مسّی

1۔ سیفو = کسی دُکاندار کا نام (جیسے سیف الدین کا مخفف)

مصحفی کیا کروں اور اُس دہنِ تنگ کا وصف
غنچۂ گل میں دکھاتی ہے خدائی مسّی

484

سن کے جو نام مرا گھر سے نہ باہر آوے　سامنے خواب میں کس طرح وہ دلبر آوے
جب سے لشکر کو گیا ہے تو، ترا عاشقِ زار　یہ دعا مانگے ہے یارب کہیں لشکر آوے
کیا غضب ہے کہ خیال اُس کا مرے خواب میں بھی　گہے آوے تو لیے ہاتھ میں خنجر آوے
رسم ہی نامہ و پیغام کی گُم صُم[1] ہے کہ اب　قاصد آوے، نہ صبا اور نہ کبوتر آوے
کام اُس چشم سے لینا نہیں اتنا دشوار　بر سرِ رحم اگر غمزۂ کافر آوے
میں جو بیتابی سے جاؤں تو رقیبوں سے کہے　اِس کو کہہ دو کہ نہ ہر دم مرے در پر آوے
خاک چھانیں ہیں وہاں مجھ سے دوانے لاکھوں　اُس کے کوچے سے صبا کیوں نہ مکدر[2] آوے
کھیلتے نرد تجھے دیکھے جو اغیار کے ساتھ　پھر وہ کیوں کر نہ تری بزم سے ششدر آوے
مصحفی ہم تو فقط دید ہی پر صبر کریں
پر بشرطیکہ ہمیں وہ بھی میسر آوے

485

چھوڑ اس کو سوے غیر مری چاہ کھنچ گئی　ڈوری کدھر یہ اے مرے اللہ کھنچ گئی
پھر چاندنی کا لطف ہوا اور بھی دو چند　اک چاندنی بھی جب کہ شبِ ماہ کھنچ گئی
ابرو کے تیرے ذکر پہ، کہتے ہیں شب بہ بزم　تلوار دوست داروں میں ناگاہ کھنچ گئی
آگے سے اور خیمۂ گردوں ہوا بلند　مثلِ طناب جب کہ مری آہ کھنچ گئی
اس کہربائی رنگ کے صدقے کہ جس کو دیکھ　جاں اپنے تن سے شکلِ پرِ کاہ کھنچ گئی
شب مصحفی سے دیکھ کے تجھ کو کھنچا ہوا
ابرو بھی تیری اے بتِ گمراہ کھنچ گئی

1۔ گم صُم = ناپید (صُم = بہرا) مگر یہ روزمرّہ ہے　2۔ مکدر = سَنی ہوئی

486

سو بار تیرے در پہ ہم آکر چلے گئے
درباں کو حالِ زار سنا کر چلے گئے

سمجھے گا ان بتوں سے خدا خوب روزِ وصل
بُتّا ہی[1] صاف ہم کو بتا کر چلے گئے

گلشن میں بے دماغیِ بلبل کو دیکھ کر
ہم آشیانہ اپنا جلا کر چلے گئے

حسرت یہ رہ گئی کہ وہ شرما کے بھیڑ میں
دن عید کے بھی سامنے آکر چلے گئے

ابرِ بہار کی سی طرح اُس گلی میں ہم
آنکھوں سے سیلِ خون بہا کر چلے گئے

یہ اور چھل[2] اُنھوں نے نکالی کہ دور سے
مجھ کو اشارتوں میں بلا کر چلے گئے

منظور گھر کا غیر کے جانا ہوا تو وہ
شادی کے گھر کی ہم کو سنا کر چلے گئے

کوچے میں تیرے آ بھی جو نکلے تو شرم سے
خورشید و ماہ منھ کو چھپا کر چلے گئے

ہیں میرے دل کے چور وہی، سامنے سے جو
دیکھا مجھے اور آنکھ چُرا کر چلے گئے

یارب بھلا ہو اُن کا جو چوری سے وقتِ شب
تجھ کو مری بغل میں سلا کر چلے گئے

اے مصحفی دریغ کہ خوبانِ سرخ پوش
آئے چمن میں آگ لگا کر چلے گئے

487

غوطہ زن حسن کے دریا میں نگاہ اپنی ہے
پَیر جاتی ہے جو پتھر میں سو آہ اپنی ہے

صدمہ کچھ دل پہ نہ ہو اُس کے خدا خیر کرے
حالت اس وقت جو شدت سے تباہ اپنی ہے

دیکھ پانی میں مہِ نو کو، لگا وہ کہنے
مہِ نو تو یہ نہیں، طرفِ کلاہ اپنی ہے

شمعِ مجلس ہے تو کیا جانیے کس کا کہ میاں
آج شدت سے شبِ ہجر سیاہ اپنی ہے

گاہ گاہے تو ہمیں یاد کرے ہے سرِ راہ
بارے اتنی تو ترے دل میں بھی راہ اپنی ہے

گرچہ سنمکھ تو وہ ہوتا نہیں پر چتون سے
یہ عیاں ہو ہے کہ کچھ اُس کو بھی چاہ اپنی ہے

1۔ بُتّا بتانا = دھوکا دینا، ترّی مارنا 2۔ چَھل = فریب

چاندنی میں یہ سیاہی ہے کہ دلدار بغیر　　شبِ یلدا کے مقابل، شبِ ماہ اپنی ہے
کوئی خورشیدِ قیامت سے نہ کہہ دیوے یہ بات　　اس کی دیوار کے سائے میں پناہ اپنی ہے
مصحفی بے سبب آتے نہیں اشکوں کے قشوں[1]
ہیں سپہ دارِ الم ہم، یہ سپاہ اپنی ہے

488

تیری بیدادی[2] سے شہرا ے فتنہ گر خالی ہوئے　　قافلے لاکھوں گئے اور گھر کے گھر خالی ہوئے
بسکہ تُو دَہ جان کر خوباں نے کی مشقِ ستم　　سیکڑوں ترکش ہماری خاک پر خالی ہوئے
خونِ دل بھرنے کا ان میں جب ارادہ میں کیا　　قطرہ ہائے اشک مانند گہر خالی ہوئے
عشق تو تب ہے کہ جیتے جی تو بلبل ہو نثار　　لطف کیا قربانِ گل گر مشتِ پر خالی[3] ہوئے
بس کہ مغزان کا ہوا قوتِ[4] ہمائے عشقِ یار　　استخواں جوں نے ہمارے سر بہ سر خالی ہوئے
دیکھ اے روحِ رُواں[5] تیری صفائے جسم کو　　مجلسِ خوباں میں قالب بیشتر خالی ہوئے
لختِ دل رو رو کے، بھر دیں گے دوبارہ ان کو ہم　　ٹوکرے پھولوں سے اے گل چیں اگر خالی ہوئے
مجلسِ مے میں رہی تا صبح قلقل کی صدا　　گر اِدھر شیشے بھرے، تو پھر اُدھر خالی ہوئے
جھانکیں ہیں خوباں، غزل اک اور بھی پڑھ مصحفی
تیری خاطر رخنۂ دیوار و در خالی ہوئے

489

آپ سے ہم اُس پہ کرتے ہی نظر خالی ہوئے　　جس کی رشوت میں ہزاروں گنجِ زر خالی ہوئے
اُن سے لے لے کر روئی پوچھے جو میں ناسورِ چشم　　تھے سرہانے کے جو تکیے سر بہ سر خالی ہوئے
وہ سراپا شرم آیا اُس دم اپنے بام پر　　اُس کے ہمسایوں کے جب سب بام و در خالی ہوئے

1۔ قشون = لشکر　2۔ بیدادی میں یا زائد ہے (عوامی)　3۔ خالی = صِرف (روزمرہ)
4۔ قُوت (بروزن سُوت) غذا　5۔ روحِ رُواں = (رُواں بروزن فغاں) = جانِ جاں

اب تو بے کھٹکے چلے آؤ کہ ہے سنسان شہر لوگ لشکر کو گئے، اور رہ گزر خالی ہوئے

لے کے اُجرت خط مرا یا لے نہ جاتا تھا کوئی یا پھرے جب دن تو دشمن نامہ بر خالی ہوئے

ٹھور[1] رکھے تیغِ ابرو نے تری کیا کیا امیر کیا کہوں ہُودے[2] کئی اُس کھیت پر خالی ہوئے

کیا لگے دم توڑنے پروانے گر کر پائے شمع صدقے ہونے سے جو تک وقتِ سحر خالی ہوئے

شبنم و گل کو دیا گل چیں نے رونے سے چھڑا خوب جب دونوں کے دل با یک دگر خالی ہوئے

مصحفی پیدا ہوا اُس گل کو جب شوقِ شکار
بحری و بری[3] سے کتنے بحر و بر خالی ہوئے

490

کشتگاں سے تیرے جب شہر اور نگر خالی ہوئے
تعزیہ داری کو اُن کی کتنے گھر خالی ہوئے

قطرہ قطرہ اشک سے ساعت کے پیاں[4] کی طرح
پھر بھرے اک پل میں، گر یہ چشمِ تر خالی ہوئے

خط پہ خط، نامے پہ نامہ بس کہ ہم بھیجا کیے
آمد و شد سے نہ اک دم نامہ بر خالی ہوئے

کیا شبِ ہجراں میں جینے کا رہا مِن بعد لطف
جب اثر سے نالہ ہائے بے اثر خالی ہوئے

آپ میں تا لیویں لاشیں اُس کے کشتوں کی چھپا
غار ہر صحرا کے اندر تا کمر خالی ہوئے

تھا نگاہِ لطفِ خوں ریزاں سے جس کو خفیہ ربط
وار اُس زخمی کے اوپر بیشتر خالی ہوئے

1۔ ٹھور رکھے = خالی کردیے، مار رکھے 2۔ ہودہ = ہاتھی پر سواری کی مسند
3۔ بحری و بری = مراد سمندر اور خشکی کے جانور 4۔ ساعت کے پیاں = ریت کی گھڑی

بادشاہِ حسن جنگِ عشق پر جس دم چڑھا
تھے سلاخوں کے جو کوٹھے [1] سر بہ سر خالی ہوئے

عشق کے ہاتھوں ہمیں دن رات رونا ہی رہا
اس خرابی سے نہ ہرگز عمر بھر خالی ہوئے

گُل تو ہیں [2] پیسوں کے زیبِ ساعد و بازو ہنوز
غم نہیں پیسوں سے ہاتھ اپنے اگر خالی ہوئے

آفریں ان بسملوں کو ہے، جو اس مقتل کے بیچ
جاں کنی کے غم سے لوٹ اور پوٹ کر خالی ہوئے

مصحفی ہر وقت ہم کو دل کا جو ماتم رہا
سینہ کوبی سے نہ ٹک ہم نوحہ گر خالی ہوئے

491

مری جانب سے جا کر یہ کرے اُس کو خبر کوئی
کہ روتا ہے کھڑا تیرے لیے بیرونِ در کوئی

بسانِ آئینہ حیراں ہیں سب اُس کے تماشائی
نہیں مقدور اتنا بھی کہ دیکھے بھر نظر کوئی

یہ عالم اُس پری کا ہے کہ اس کے ملنے والوں سے
کوئی پوچھے ہے اُس کا نام اور ڈھونڈے ہے گھر کوئی

طبیعت ان دنوں اُس کی اِدھر ہے، کاش یاروں سے
مرا بہرِ خدا دو دن کو ہو پیغام بر کوئی

ہزاروں معرکے میں عشق کے یاں جی سے جاتے ہیں
عجب یہ جنگ ہے جس میں نہیں پاتا ظفر کوئی

1۔ سلاخوں کے کوٹھے = میگزین، ہتھیاروں کے گودام 2۔ یعنی پیسے گرم کر کے جو داغ کھائے ہیں وہ تو اپنے پاس ہیں

اثر کر ہی رہے گی دل میں اُس کے صبح تک آخر
عبث برباد جاوے گی یہ آہِ بے اثر کوئی؟

مرا مرنا ہی بہتر ہے صنم، تا تو بھی یہ جانے
کہ دو دن کی جدائی میں گیا جی سے گزر کوئی

خدنگِ نالہ پھینکے ہیں میں لاکھوں ہجر کی شب میں
نشانے پر اثر کے پر نہ آیا کارگر کوئی

گیا میں اُس کی مجلس میں تو وہ درباں سے یوں بولا
یہ مجلس ہے کہ گذری[1]، جو چلا آتا ہے ہر کوئی

خدایا صبر دے دل کو کہاں تک راہ میں اس کی
رکھے زانو پہ سر بیٹھا رہے دو دو پہر کوئی

تو اپنے جی کو مت میلا کر اے رشکِ بہارِ گل
بلا سے تیری، تیرے حسن پر گرجائے مر کوئی

وہی تھا عاشقِ مضطر ترا شاید، میں پہچانا
پھرے تھا شب جو کوچے میں ترے ایدھر اُدھر کوئی

پکڑ بلبل کو کیسے لگ پڑے ہیں کودکاں[2] ہے ہے
کوئی پاؤں میں ڈورے ڈالے ہے، باندھے ہے پر کوئی

نہیں میں اُس کے کوچے کی طرف کچھ آپ سے جاتا
اُدھر کو کھینچے ہے رسّی گلے میں ڈال کر کوئی

میں کیا جانوں قلق کیا چیز ہے، پر اِتنا جانوں ہوں
مَلے ہے دل کو پہلو میں مرے شام و سحر کوئی

1۔ گذری = بازار 2۔ کودکاں (کودک کی جمع) بچے

نشانہ اُس کو گل بازی[1] میں کرتا پر یہ ڈرتا ہوں
مبادا بیچ میں آ جا[2] کے ہو جاوے سپر کوئی

تماشا دیکھیے اُس بزم میں خوباں کی، جس جاگہ
کوئی حسرت فزائے شمس ہو، رشکِ قمر کوئی

صبا گر جائے تو خلوت میں اُس کی، اتنا کہہ دیجو
ترے کوچے سے غافل، کر گیا شب کو سفر کوئی

نہ الفت میں تری الفت، نہ کینے میں ترے کینہ
ترے صدقے بھلا جاوے تری کس بات پر کوئی

جدائی میں تری دی مصحفی نے جاں بہ تنہائی
سرِ بالیں نہ آیا اُس کی ہرگز نوحہ گر کوئی

492

صحبت کی مری آپ کی زنہار نہ ٹھہری — اک روز بھی وہ بوسے کی تکرار نہ ٹھہری
ٹھہرایا جو رستے میں اُسے غیر نے ناگہ — اُس وقت طبیعت مری زنہار نہ ٹھہری
لگتے ہی کیا دو مجھے، اللہ رے صفائی — پہلو پہ بھی ہرگز تری تلوار نہ ٹھہری
آیا جو نظر عکس میں اک برق کا عالم — آئینے پہ ہرگز نگہِ یار نہ ٹھہری
از بس کہ ترے حسن میں تھا مہر کا جلوہ — سودے میں ترے چشمِ خریدار نہ ٹھہری
ہم خانہ کیا عشق نے اس ساتھ کہ آخر — گریے سے مرے بیچ کی دیوار نہ ٹھہری[3]
صیاد کے اب پڑ تو قفس میں کہ کسی جا — قیمت تری اے مرغِ گرفتار نہ ٹھہری
کہتی تھی زلیخا کہ دعا کرتی میں لیکن — یوسف کی سواری سرِ بازار نہ ٹھہری

اے مصحفی اُس شوخ نے کی آکے جو چشمک
گلزار میں پھر نرگسِ بیمار نہ ٹھہری

1۔ گل بازی= پھولوں سے ایک دوسرے کو مارنے کا کھیل 2۔ آجاکے= آکے، آکر
3۔ نہ ٹھہری = قائم نہ رہی

493

آشیاں دور رہا ہم سے، چمن سے نکلے　　گھر سے آوارہ ہوئے، شہر و وطن سے نکلے
سامنے اُس کے یہ مقدور فرشتے کا نہیں　　کہ لگاوٹ کی کوئی بات دہن سے نکلے
ششم انگشت کا اُس گل کی یہ عالم ہے کہ جوں　　شاخ چھوٹی سی کوئی شاخِ سمن سے نکلے
دست و پا مار رہے شب کئی پروانے ہائے　　لیک باہر نہ ہو گردابِ لگن سے نکلے
گرچہ ہے آبِ حیات اس میں بھرا، پر جو گرے　　خضر جیتا نہ ترے چاہِ ذقن سے نکلے
تھا اشارہ کہ تمنائے ہم آغوشی ہے　　جس گھڑی ہاتھ سکندر کے کفن سے نکلے
مثلِ پروانہ نہیں منتظرِ شعلۂ شمع　　میں جلا چاہوں تو خود آگ بدن سے نکلے

مصحفی دامِ گرفتاریِ خاطر تھی وہ زلف
واں سے ہم نکلے تو، پر زور ہی فن سے نکلے

494

کاش اک رات مرے گھر وہ کرم فرمائے　　اور یوں آکے کہے "ہم تری خاطر آئے"
اُٹھے سوتے سے جو ناگاہ شبِ وصل کے بیچ　　وہ اُدھر سوچ رہے اور ہم اِدھر شرمائے
شرم آتی ہے کروں وصل کا کیا اُس سے سوال　　کاش وہ ہی کوئی ملنے کی جگہ ٹھہرائے
میں بھی حیراں ہوں کہ ناصح بصد افسون و فریب　　مجھ سے دیوانے کو سمجھائے تو کیا سمجھائے
قاصد و نامہ سے مایوس ہیں ہم ان روزوں　　ہاں مگر اُس کی خبر بادِ صبا پہنچائے
مصحفی تنگیِ عالم پہ جو کرتا ہوں نگاہ　ق　جی میں سوچوں ہوں کہاں روؤں جو دل بھر آئے
نیست جائے کہ بہ کامِ دل خود گریہ کنم　　کاش می بود برون از دو جہاں صحرائے

495

دیکھ اُس کو اک آہ ہم نے کر لی　　حسرت سے نگاہ ہم نے کر لی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے　　اُس شوخ سے راہ ہم نے کر لی

بندے پر نہ کر کرم زیادہ بس بس تری چاہ ہم نے کر لی
جب اُس نے چلائی تیغ ہم پر ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا کج اپنی کلاہ ہم نے کر لی
زلف و رخِ مہ وشاں کی دولت[1] سیرِ شبِ ماہ ہم نے کر لی
کیا دیر ہے پھر یہ ابرِ رحمت تختی تو سیاہ ہم نے کر لی

دی ضبط میں جب کہ مصحفی جاں
شرم اُس کی گواہ ہم نے کر لی

496

کوئی کیا جانے کہ خوباں کو ادا کس سے ہے وعدہ کس سے ہے، وفا کس سے، دغا کس سے ہے
عشق کے درد کی لکھی ہے دوا شربتِ وصل لیک معلوم نہیں کچھ، یہ دوا کس سے ہے
ہم تو زنداں میں پھنسے، یہ نہیں معلوم کہ ہائے ان دنوں رفتگیِ بادِ صبا کس سے ہے
برہمن دَیر کو پوجے ہے، تو مومن کعبہ راضی اس امر میں کیا جانے خدا کس سے ہے
ہے بگاڑ اپنے نصیبوں کا جدائی اُس کی سچ تو یہ ہے کہ میاں ہم کو گلا کس سے ہے
بدمزاجی سے سبھی اُس کی ہیں نالاں شب و روز چرخِ کیں[2] توز کو یاں صلح و صفا کس سے ہے

مصحفی کا جو گلہ کرتے پھرو ہو صاحب
تم بھلا یہ تو بتاؤ وہ بُرا کس سے ہے؟

497

نہیں لگتی[3] اُسے زنہار دق اور سل کی بیماری
نہ ہو دشمن کے دشمن کو بھی یا رب دل کی بیماری

مسیحا مجھ کو ہے دوری سے اُس کی رنجِ روحانی
دوا کرتا میں، گر ہوتی یہ آب و گِل کی بیماری

1۔ کی دولت = کی بدولت، واسطے سے 2۔ کین توز = کینہ پرور
3۔ نہیں لگتی = مقابلہ نہیں کرتی، اُس کے برابر نہیں

بہ وقتِ ذبح گردن مڑ گئی اُس کی تری جانب
نہ ہووے قسمِ لقوہ سے ترے بسمل کی بیماری

کف اُس کے منہ سے بے موجب نہیں آتے جو سچ پوچھو
یہ ساری آب کے طغیاں سے ہے ساحل کی بیماری

بہ دستِ مرتعش[1] وہ شوخ مجھ کو قتل کرتا تھا
دعا مانگے تھا میں یا رب تو کھو قاتل کی بیماری

جو ناقہ نجد کی اُس کو فضا جا کر کے دکھلاوے
ابھی جاتی رہے سب صاحبِ محمل کی بیماری

پڑے ہیں آبلے شیشے سے اک تو میرے پانو میں
پھر اس پر دیتی ہے دکھ سختیِ منزل کی بیماری

لگا ہو مانگنے کا روگ جس کو، کیا شفا پاوے
کہیں ہیں، جیتے جی جاتی نہیں سائل کی بیماری

تپِ مخفی رہے ہے بے سبب جو اِن دنوں مجھ کو
مگر بھیجی ہوئی ہے یہ کسی عامل کی بیماری

بغیر از وصل اب جانا دوا سے اس کا ہے مشکل
کہ مُزمن[2] ہوگئی ہے یہ ترے مائل کی بیماری

کہا میں مصحفی سے ترکِ عشقِ زلفِ خوباں کر
نہ مانا، اور ناحق بڑھ گئی جاہل کی بیماری

498

غم کھاویں ہوں نت، پر مری نیت نہیں بھرتی　　کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

1۔ مرتعش = لرزتا ہوا، رعشہ دار　2۔ مُزمن = پرانی

عاشق ترا کس دن نہیں مرتا کہ گھر اُس کے — رونے کے لیے آن کے خلقت نہیں بھرتی
جاوے تو صبا کہیو یہ مجنوں سے کہ لیلیٰ — کیا کیا تری فرقت میں مصیبت نہیں بھرتی
چہلم کے دن آتا ہے زیارت کو جو قاتل — کیا خوں سے مری چادرِ تربت نہیں بھرتی
کس روز مرے دیدۂ خوں بار کے آگے — پانی تری شمشیرِ سیاست[1] نہیں بھرتی
ہم دیکھیں ہیں ہر چند اُسے لاکھ طرح سے — پر اپنی طبیعت کسی صورت نہیں بھرتی
یا رب تری بخشش سے یہی مجھ کو ہے شکوہ — ہامی مری کیوں روزِ قیامت نہیں بھرتی
ہیں رام تری چشم کے عالم سے رمیدہ — یاں چوکڑی آہو کی بھی وحشت نہیں بھرتی
کب شرم سے عصیاں کی، مری چشمِ گہربار — دامن میں مرے اشکِ ندامت نہیں بھرتی
اے آہ میں اُٹھنے پہ ہوں اب بزمِ جہاں سے — سُلفے کی چلم کیوں دمِ رخصت نہیں بھرتی

صدقے سے محمدؐ کے میں ہوں مصحفی کُل دوست[2]
کلمہ مرا وہ کون سی اُمت نہیں بھرتی

499

جب ساری سری خوں میں ترے تیر کی بھرتی — تب زخم سے نیت ترے نخچیر کی بھرتی
کرتے نہ ورم[3] پاؤں جو دیوانے کے تیرے — آغوش نہ یوں حلقۂ زنجیر کی بھرتی
گہرا نہ لگا زخم مرے، لطف تو تب تھا — جب پشت بھی خوں میں تری شمشیر کی بھرتی
یوں چاہیے لاؤں نہ اُسے دل سے زباں پر — تا خوب نہ ہو، آہ میں تاثیر کی بھرتی
جاتا ہے تجارت کے لیے آہ کا نایک — ساتھ اپنے لیے نالۂ شب گیر کی بھرتی[4]
لے خامۂ مو، رنگِ نزاکت سے مصور — کرتا ہے ترے خاکۂ تصویر کی بھرتی
زخم اُس کے میں کھا کر جو لپٹتا مرے خوں سے — چولی تو بھلا اُس بتِ بے پیر کی بھرتی

1۔ سیاست = سزا، تعزیر 2۔ کُل دوست = صلحِ کُل، سب کا دوست 3۔ ورَم (بروزن کرم) باندھا ہے (روزمرۃ) 4۔ بھرتی = سامانِ تجارت

اب قافیہ باقی نہ رہا مصحفی اچھا
اور ہے بھی اگر کوئی تو خوگیر[1] کی بھرتی

500

وہ آکر بزم میں جب ایدھر اودھر دیکھ لیتا ہے
تو میری بھی طرف ہاں اک نظر بھر دیکھ لیتا ہے

کوئی سنبل کا گر مذکور کرتا ہے تو وہ کافر
کنکھیوں سے وہیں زلفِ معنبر دیکھ لیتا ہے

ترا بیمار پیاسے جب لگے ہے مُوندنے آنکھیں
تو کیا اُس دم بہ حسرت جانبِ در دیکھ لیتا ہے

کرے رمّال کیا، طالع ہی جب برگشتہ ہوں اپنے
وگرنہ ہر کوئی امید کا گھر دیکھ لیتا ہے

شہیدِ ناز تیرا روزِ محشر اپنی تربت سے
اُٹھے ہے تب، کہ جب ہنگامہ سر پر دیکھ لیتا ہے

مجھے اک عمر گزری ڈھونڈھتے ہی اُس کو حیراں ہوں
کوئی رستہ کسی کے گھر کا کیونکر دیکھ لیتا ہے

تصورِ تیغِ ابرو کا جدا ہوتا ہے تب دل سے
جب اُس کو صورتِ بسمل کبوتر دیکھ لیتا ہے

کبوتر لے جوابِ نامہ جب آتا ہے اودھر سے
خیالِ بدگماں اُٹھتے ہی شہپر دیکھ لیتا ہے

غزل جب دوسری لکھنے لگے ہے مصحفی یارو
تو اُس کے قافیے بہتر سے بہتر دیکھ لیتا ہے

501

وہ جاتے جاتے جس کو پیچھے پھر کر دیکھ لیتا ہے
وہ پیچھا اُس کا تب چھوڑے ہے جب گھر دیکھ لیتا ہے

گلی میں اُس کی جاتا ہوں تو کیا اک چشمِ حسرت سے
دلِ مسکیں بہ سوے رخنۂ در دیکھ لیتا ہے

مجھے اُس کو میں کیوں رُسوا کرے ہے، مان کہنے کو
وگرنہ اب کوئی اے دیدۂ تر دیکھ لیتا ہے

1۔ خوگیر = گھوڑے کی پشت پر ڈالنے کا کپڑا، پسینہ جذب کرنے کے لیے

نشانہ تیرِ مژگاں کا کرے ہے تب وہ عاشق کو
جب اُس کو ہر طرح سے اپنے ڈھب پر دیکھ لیتا ہے

ابھی جو میں لبِ خاموش سے پردہ اُٹھاتا ہوں
مرے نالوں کی صورت شورِ محشر دیکھ لیتا ہے

قلق میں مجھ کو جانے دے ہے ہمدم تب پلنگ اوپر
جب اول اُٹھ کے وہ بالین و بستر دیکھ لیتا ہے

دلِ مضطر نہ ڈھونڈے کیوں دُرِ گوش اُس کی زلفوں میں
چلے ہے شب کو گر شب رَو[1] تو اختر دیکھ لیتا ہے

سراپا رشک کی آتش میں جل جاتا ہوں میں تپ میں
ترا پنڈا کوئی گر ہاتھ رکھ کر دیکھ لیتا ہے

گلی میں اُس کی جب جاتا ہے شب کو چوری چوری دل
تو کیا ترسیدہ ہوکر ایدھر اودھر دیکھ لیتا ہے

محک[2] ہے شعر کی اے مصحفی بزمِ سخن گویاں
کہ یاں کھوٹا کھرا سب کا سخنور دیکھ لیتا ہے

502

مرے گھر میں کل اُس کو غیر سے جس وقت صحبت تھی
ستم دیکھو، مجھے اُس وقت دربانی کی خدمت تھی

ذرا چاہت کی بازی دیکھیو اُس رشکِ پنہاں پر
اُسے تھی جس سے صحبت، مجھ کو اُس سے ہی محبت تھی

تری آنکھوں کے آگے وہ جو مل بیٹھا تھا ہم فن سے
وہی مل بیٹھنا بس وصل کی میری اشارت تھی

1۔ شب رَو = رات کو سفر کرنے والا 2۔ محک = کسوٹی

وہ تھا سرگرمِ صحبت اور لہو سا تھا میں یاں پیتا
اُسے تھا شکر مجھ سے، مجھ کو طالع سے شکایت تھی

بہ ظاہر گرچہ مصروفِ رضا تھا اس کا میں، اُس دم
ولے باطن میں دردِ رشک سے دل پر قیامت تھی

میں اُس کی ہم زبانی غیر سے دیکھے تھا اور چپ تھا
خدا جانے کہاں اے عشق اُس دم تیری غیرت تھی

میں ڈرتا تھا کوئی ایسا نہ ہو اِس وقت آ نکلے
اسے میرے سبب ہم فن سے خلوت با فراغت تھی

خدایا انتقام اس کا ہے یہ، ہوں میں بھی ہم صحبت
اُسی صورت سے، اس کو غیر سے جس طرح صحبت تھی

مقامِ عشق میں اے مصحفی ایسا بھی ہوتا ہے
عبث طالع سے تجھ کو اس گھڑی ناداں شکایت تھی

503

اُسترے سے اُس بتِ گل پیرہن کے رونگٹے
جب منڈے، ہوگئے کھڑے اپنے بدن کے رونگٹے

جسم میں خورشیدِ تاباں کا سراپا نور ہو
چاہیے اُس جسم پر ہوویں کرن کے رونگٹے

لشکرِ خطِ سیہ کی ہے یہ آمد کا غبار
پھیلے جاتے ہیں جو گرد اُس کے دہن کے رونگٹے

آئینے پر حسن کے جوہر سے آتے ہیں نظر
ہم روئیں[1] عارض کے، ہم اُس کے ذقن کے رونگٹے

ربطِ خصمِ روسیہ ہو کیوں نہ باعث رنج کا
خار سے چبھتے ہیں کملے[2] کے بدن کے رونگٹے

ریچھ سے کرتے ہیں اُس کو کودکاں اکثر غلط
بڑھ گئے ہیں بس کہ شیخِ دُنبہ تن کے رونگٹے

مصحفی ہو چہرہ آرا اک غزل کا اور بھی
جس کے عارض پر ہوں ایسے ہی سخن کے رونگٹے

1۔ رُواں (روم) باریک بال 2۔ کملا ایک کیڑا جس کے بدن پر رونگٹے ہوتے ہیں

504

جوں نخِ[1] ریشم ہوں جس نازک بدن کے رونگٹے — ہوویں کیا سرسبز واں مخمل کے گھن[2] کے رونگٹے

بھیگتی اُس کی مسوں نے جس کو کر ڈالا ہو قتل — سر اُٹھاویں کیونکے پھر اُس کے کفن کے رونگٹے

آہ مت پوچھ اُس کی روماول[3] کا عالم کیا کہوں — اس صفا کا پیٹ، جس پر اِس پھبن کے رونگٹے

فرشِ مخمل پر بھلا کس طرح آوے اُس کو خواب — خود رکھیں بے کل جسے اپنے بدن کے رونگٹے

بال بال اپنے ہی، دشمن ایک دن ہو جائیں گے — یہ جو جمتے آتے ہیں گرد اُس دہن کے رونگٹے

منہ چھپایا اپنا خجلت سے بہی نے گرد میں — ننھے ننھے دیکھ اُس سیبِ ذقن کے رونگٹے

مصحفی اب تک رکھیں ہیں دل مرا زیر و زبر
عالمِ نوخیزی، اور وہ سادہ پن کے رونگٹے

505

رات روشن جو میں کی شمعِ سخن کی بتّی — خود زباں ہوگئی فانوسِ دہن کی بتّی

وائے اس مردۂ مجلس پہ، کہ از بہرِ چراغ — پھاڑ کر خلق بٹے جس کے کفن کی بتّی

نمکِ سُودہ کر آلودہ روئی میں اے چراغ — کہ یہی ہے مرے ناسورِ کہن کی بتّی

شعلۂ آہ ہوا رات مرا اتنا بلند — کہ بنا جامۂ گردوں کی لگن کی بتّی

سبز پوشی کا تری دیکھ کے جلوہ شبِ عید — شمعِ مومی سے جلی سروِ سمن کی بتّی

مصحفی زخم ہیں پیکاں کے مرے تن پہ تمام
اور ہر زخم میں ہے مُشکِ ختن کی بتّی

506

زہرہ کی جب آئی کفِ ہاروت میں اُنگلی — کی رشک نے جا، دیدۂ ماروت میں اُنگلی

دن دودھ انگوٹھے کے تئیں چوسے ہے کودک — رکھتی ہے تصرّف عجب اک قُوت میں اُنگلی

1۔ نخ = ریشم کا تار 2۔ گھن کے = گہرے، موٹے 3۔ روماول = روئیں کی دھاری بدن پر

غرفے کی ترے جالی پہ از بہرِ تأسّف ہر موج سے تھی کل دہنِ حوت میں اُنگلی
مہندی کے یہ چھلّے نہیں پوروں پہ بنائے ہے اُس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں اُنگلی
مطرب بچہ چھیڑے ہے تو جس وقت کہ قانون[1] ناچے ہے تری عالمِ لاہوت میں اُنگلی
یوں ہے مرے ناخن میں ہر اک تارِ گریباں حایک[2] کی گرفتار ہو جوں سوت میں اُنگلی
شہتوت سے یا صانعِ عالم نے لگا دی شیریں کی یہ شاخِ شجرِ توت میں اُنگلی

تھا مصحفی یہ مائلِ گریہ کہ پس از مرگ
تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

507

دل کے چھپاؤں گو کہ میں پیکاں لگے ہوئے چھپتے ہیں کوئی زخم، نمایاں لگے ہوئے
شب باشی کا نہ ہم سے تم اخفا کرو کہ ہیں لب پہ تمھارے غیر کے دنداں لگے ہوئے
شاید ہے آج جلوہ گری پر مزاجِ حسن پردوں سے ہیں دروں کے جو درباں لگے ہوئے
ہنگامِ خط بھی کیجیے سودا، کہ میری جاں اب تک ہیں جنس جنس کے خواہاں لگے ہوئے
جھانکیں ہیں اُس کو سارے زمانے کے خوب رو واں روزنوں سے ہیں مہِ تاباں لگے ہوئے
مجنوں چلا ہے روٹھ کر اں سے کدھر، جو آج جاتے ہیں پیچھے پیچھے غزالاں لگے ہوئے
مجلس میں آئینے یہ نہیں اُس کی ہر طرف ہیں عاشقوں کے دیدۂ حیراں لگے ہوئے
کہتے ہیں جس میں ناقۂ لیلیٰ کا تھا گزر تھے کوہ و نجد سے وہ بیاباں لگے ہوئے
کس قوم کا یہ طفل ہے یارب کہ جس کے ساتھ جاتے ہیں لپٹے گبر و مسلماں لگے ہوئے
پوچھو ہو ایک داغ کی تم مجھ سے کیا، یہاں سینے میں ہیں ہزار گلستاں لگے ہوئے

آتا ہے کیا تو وادیِ مجنوں سے مصحفی
دامن میں ہیں جو خارِ مغیلاں لگے ہوئے

1۔ قانون = ایک ساز 2۔ حایک = کپڑا بُننے والا

508

بندے کی ہے اب ہم کو، نے ہے خدا کی چوری
جب دل دیا تو پھر کیا یار آشنا کی چوری

دل گھائیوں میں اُس نے آخر چھپا ہی ڈالا
ظاہر ہوئی نہ ہرگز دزدِ حنا کی چوری

بالوں کی اُس کے نکہت گلشن کو لے چلی تھی
رستے میں ہم نے پکڑی بادِ صبا کی چوری

پانو اُس گلی میں میں نے ازبس الگ رکھے ہیں
ہے نقشِ پا سے ظاہر ہر نقشِ پا کی چوری

بالوں کے پیچ میں دل اُس نے چھپا رکھا تھا
میں ڈھونڈ کر نکالی زلفِ دوتا کی چوری

جاتا تو تھا پلنگ تک شب اُس کے میں ولیکن
کرتا تھا ہر قدم پر آوازِ پا کی چوری

آئینہ دیکھتا ہے اکثر چھپا چھپا کر
تاڑی ہے ہم نے اتنی اُس مہ لقا کی چوری

ربطِ سخن سے اُس پر، وہ بھی رہی نہ پنہاں
نامے میں تھی ہمارے جس مدّعا کی چوری

دشنام دے رہا ہے اے مصحفی وہ تجھ کو
تو زیرِ لب کرے ہے اب تک دعا کی چوری

509

کبھو جو خط میں اُسے حالتِ فراق لکھی
تو بیمِ غیر سے سرنامے پر طلاق لکھی

جواب اُس کے میں دشنام آئی واں سے، جو میں
کسی کے خط میں دعا حسبِ اتفاق لکھی

بدن میں کی تھی بہت احتیاط مانی نے
پھسل گیا قلم اس کا، جب اُس کی ساق لکھی

زبس ملاحظہ[1] تھا اس کی خو کا، ہم نے اسے
تمام خط میں نہ اک سطرِ اشتیاق لکھی

ہوا جو پرگنۂ دل پہ نصب عاملِ عشق
تو پہلے ہم پہ ہی دستک[2] شبِ فراق لکھی

زبس کہ دل میں رکاوٹ تھی، یار نے خط میں
لکھی جو بیت بھی کوئی تو بر نفاق[3] لکھی

بڑا کرم یہ کیا مصحفی پہ مانی نے
کہ اس کی اور مری تصویر ہم وفاق[4] لکھی

1۔ ملاحظہ = لحاظ 2۔ دستک = پروانہ، (سرکاری حکم) 3۔ یعنی وہ بیت جس میں نفاق کا مضمون ہو
4۔ ہم وفاق = ملا کر، ساتھ ساتھ

510

بر درِ پیر مغاں یا کوئی لے جائے مجھے　　یا تجلّی جو ہے مہ کی، یہیں دکھلائے مجھے
چرخ جانے ہے نکما مجھے نادانی سے　　امتحاناً کبھی کچھ کام تو فرمائے مجھے
خواہشِ وصل میں کب تک میں جلوں ہجر کی شب　　شعلۂ آہ ہی اے کاش لپٹ جائے مجھے
اُکھڑے جاتے ہیں نسیمِ سحری سے تو پانو　　صَوتِ بلبل تُو مگر باغ میں ٹھہرائے مجھے
دم بہ دم جان مری غیر کا آنا جانا　　مجھ کو ڈر ہے نہ ترے گھر سے نکلوائے مجھے
بندۂ الفتِ گل ہوں، کہ بہاراں میں کبھی　　ارمغاں جز جگرِ چاک نہ بھجوائے مجھے

اک غزل اور بھی لکھ جاؤں انھیں قافیوں میں
مصحفی اپنی زباں سے جو تو فرمائے مجھے

511

پان کھانے کی ادا جب تری یاد آئے مجھے　　کیوں نہ بیتابیِ دل خون میں تڑپائے مجھے
قیس جب تربتِ لیلیٰ پہ گیا، یہ بولا　　کاش اُٹھ کر ابھی اک شعلہ لپٹ جائے مجھے
راہ صحرا کی میں لی، فصلِ بہار آتے ہی　　نہیں ممکن کہ کوئی شہر میں اب پائے مجھے
کارواں دور گیا، پانو تھکے، جی ہارا　　کون اب منزلِ مقصود کو پہنچائے مجھے
ہمرہِ غیر گیا سیرِ چمن کرنے یار　　بدگمانی دلِ شیدا کی نہ گھبرائے مجھے
رات دکھلائے فلک ہجر کی، اس کا نہیں غم　　پر ترے ہجر میں یہ دن تو نہ دکھلائے مجھے

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

512

ابھی لڑکے ہو میاں تم کو جواں ہونا ہے　　قدِ نوخیز کو جوں سروِ رواں ہونا ہے

1۔ صَوت = آواز

مجھ کو اس چال سے سوجھے ہے کہ رفتہ رفتہ
ایک عالم کا تمھیں دشمنِ جاں ہونا ہے

کششِ عشق مرا سامنے اُس کے جانا
سچ تو یہ ہے کہ ملامت کا نشاں ہونا ہے

دوستو دید کے میلے کو غنیمت جانو
پھر تہِ خاک یہ ہنگامہ کہاں ہونا ہے

خط تو قاصد کو دیا ہے میں، پہ یہ سوجھے ہے
قاصد اک اور بھی پیچھے سے رواں ہونا ہے

برگ و باراپنے اُڑا دے تو ابھی سے، اے گل
آخر اس باغ کو تاراجِ خزاں ہونا ہے

خجلتِ عشق سے محشر میں نہ آویں گے کہ ہائے
ہم کو واں بھی تری آنکھوں سے نہاں ہونا ہے

بیم و امید کہاں تک، یہ محبت میں تری
کاش ہو جائے بھی، گر جی کا زیاں ہونا ہے

رہ نہ بے غم کہ میں ہوں عاشقِ پنہاں اُس کا
ایک دن مصحفی یہ راز عیاں ہونا ہے

513

مہندی زیادہ مت مل ساعد حنائی ہوگی
ناحق کو قتل اس سے ساری خدائی ہوگی

دل کا غبار اس کے، جاتا ہے جیتے جی کب
جاویں گے جان سے ہم، ہاں تب صفائی ہوگی

بلبل قفس کو لے کر، کہتے ہیں اُڑ گئی کل
گل کا صبا کچھ اس کو پیغام لائی ہوگی

اب خواب میں بھی گاہے آتا نہیں جو وہ مہ
ملنے کی میرے اُس نے سوگند کھائی ہوگی

خورشید چلتے چلتے بھچک[1] ہو رہ گیا کل
غرفے سے اُس کو تو نے صورت دکھائی ہوگی

کب منھ سے منھ لگانے دیتے ہیں یوں وہ ہم کو
بوسہ ملے گا تب جب زور آزمائی ہوگی

دیکھوں گا خواب میں کب، میں وصل کی یہ دولت
چھاتی پہ میری تیری نازک کلائی ہوگی

کوچے میں اس کے جا کر کیا میں ہی یوں کھوں ہوں
امید یاں کسی کی کیوں کر بر آئی ہوگی؟

اے مصحفی جہاں کے جتنے ہیں عشق پیشہ
ہیں سوچ میں، کہ دیکھیں کس دن رسائی ہوگی

1۔ بھچک = بھونچکا، ششدر

514

گڑیں شہید ترے کس نمط زمیں کے تلے ، جب اُن کے خون کا بہتا ہو شط[1] زمیں کے تلے
جومٹ گئے تھے محبت میں تیری، بعد از مرگ بس اُن کے نکلے کتابے فقط زمیں کے تلے
جنھوں کی نظم میں پست و بلند ہے، یہ سمجھ ہیں آسمان پہ حرف اور نُقط زمیں کے تلے
جو بعد مرگ ہمارے، اُدھر سے آیا ہو ہماری قبر میں رکھ دے وہ خط زمیں کے تلے
ترا خیال بھی ہوتا جو بعدِ مرگ انیس تو کرتے اُس سے ہی ہم غم غلط زمیں کے تلے

میانِ گورِ غریباں جو مصحفی تھا دفن
ملی تھی کیا اُسے جاے وَسط[2] زمیں کے تلے

515

ہم رہ گئے منھ تکتے، گھر اپنے وہ جا بیٹھے کیا کام کیا ہم نے، دل کس سے لگا بیٹھے
مثلِ مہِ نو مجھ کو آئے تھے نظر یوں ہی سو میں جو لگا تکنے، وہ منھ ہی چھپا بیٹھے
کیا رنگِ حنا میں کچھ دیکھی تھی بھلا خوبی بازی ترے ہاتھوں سے ہم سادہ جو کھا بیٹھے
اس ضبط سے برسوں کے دم ناک میں آیا تھا ناچار ہو شب اُس پر ہم جی ہی چلا بیٹھے
پہلو میں جگہ مجھ کو ہرگز نہ ملی، ہے ہے بازو ترے بازو سے یوں غیر بھڑا بیٹھے
اُن کی سی کہی شاید اغیار نے کچھ اُن سے یوں میری طرف سے جو، وہ منھ کو پھرا بیٹھے

اے مصحفی بوسے کا سائل تو میں ہوں لیکن
یہ ڈر ہے وہ گالی تو مجھ کو نہ سنا بیٹھے

❁......❁......❁

1۔ شط = دریا 2۔ وَسط = درمیانی جگہ

رُباعیات

(1)

مخصوص ہے تو زیرِ زمیں جانے کا رہ بیٹھ، نہ کر قصد کہیں جانے کا
جس وقت گیا لحد میں یاں سے تیرے اسبابِ جہاں ساتھ نہیں جانے کا

(2)

دل پہلو میں قلق سے دکھ پاتا ہے اور جی کی یہ حالت ہے کہ گھبراتا ہے
ہے کس لیے یہ اتنی وحشت یا رب کیا جانیے مجھ کو کون یاد آتا ہے

(3)

ملتی نہیں ہاتھوں سے سفیہوں کے اماں ہوتا رہتا ہے مفت پیسے کا زیاں
تنخواہ تو بارے اب ملے ہے لیکن بنا تحریر، سو وے آفتِ جاں

(4)

شاہا کہ وسیع ہے ترا دستِ سخا گزرے گئی ماہ از رہِ لطف و عطا
انعام ہوا تھا جو دوشالہ مجھ کو رنگت کے لیے ہے وہ کھٹائی میں پڑا

(5)

دانا نے جسے دیکھ کہا ہستی ہے تاریکی ہے وہ عدم، ضیا ہستی ہے
حیران ہے اِس میں عقل اپنی، یہ طلسم معلوم نہیں عدم ہے یا ہستی ہے

(6)

ٹک سوچ کہ انساں کی حقیقت ہے ایک　　خالق نے جو بخشی ہے طبیعت، ہے ایک
ہے فرق اگر بہم تو فہمید کا ہے　　ورنہ یہ عروق[1] و دم و صورت ہے ایک

(7)

فطرت دوڑائے کیا کوئی پاکھنڈی　　جس بادیہ میں عیاں نہ ہو پگڈنڈی
نادان، مخلوق کا ہے صیغہ مفعول　　ہیں سارے یہ فاعلِ قضا کی منڈی

(8)

نزدیک جو اس کی زلف کے میں نہ گیا　　شانے کی عداوت سے تو محفوظ رہا
پرہیز کیا میں اُس سے، اچھا سمجھا　　سچ ہے کہ سمجھنے والے کی دور بلا

(9)

سودا کے خیال کو نہ سمجھے کوئی کم　　سودا فنِ ریختہ میں گزرا رستم
ہے میرتقی بھی تو اگرچہ استاد　　پر اُس کے کلام کا ہے قائل عالم

(10)

معنی کو جو دیکھیے تو ہر دم ہے نیا　　گر لفظ کو جھانکیے تو اللہ رے صفا
ہرچند کہ دَور اس کا ہے بعد اُن سب کے　　پر شعر کا مصحفی کے عالم ہے جدا

(11)

جب تک کہ نفس ہے، ہے تردّد باقی　　جب تک کہ ہوس ہے، ہے تردّد باقی
جب طائرِ روح اُڑ گیا، پھر کیا تھا　　جب تک کہ قفس ہے، ہے تردّد باقی

1۔ عروق = رگیں

(12)

مت جان تو اس نورِ حقیقی کو جدا ہر فرد کے گھٹ[1] میں ہے اُسی کا جلوا
گر مشق مشاہدے کی ہو صاف تری بندے ہی میں پھر تجھ کو نظر آئے خدا

(13)

خالق یہاں آ کے جب کہ مخلوق ہوا موصول[2] جو تھا بخود، وہ مفروق[3] ہوا
اک جلوہ ہے وہ کہ آپھی عاشق ٹھہرا اور آپھی عیاں بہ شکلِ معشوق ہوا

(14)

ہمت ہے سلیماں کی مرے نقشِ نگیں خواہی میں حضور میں ہوں، خواہی میں کہیں
غوطہ خورِ دریا کی سی حالت ہے مری غائب بھی وہیں ہوں، اور حاضر بھی وہیں

(15)

ہر چند کہ زندگی سے ہووے سیری فرقت میں تری اجل نہ آوے میری
امید ہے کہ جب تو آوے مجھ پاس مر جاؤں میں بلائیں لے کر تیری

(16)

ہر روز جو میں نے بار پایا تو کیا دو دن جو حضور میں نہ آیا تو کیا
تشریفِ شریف چھاؤنی میں یہ غریب لایا تو کیا، وگرنہ لایا تو کیا

(17)

تا چند یہ دل آتشِ فرقت میں پُھنکے تا چند دم اپنا زندگانی سے رُکے
اس غم سے تو جاں اپنی بتنگ آئی ہے ہونا ہو سو یک بار کہیں ہو بھی چکے

1۔ گھٹ = دل 2۔ موصول = ملا ہوا 3۔ مفروق = جدا

(18)

ہر صبح کو اک ادا سے تم آتے ہو
واللہ مرے جی کو بہت بھاتے ہو
کیا سینہ دکھا کے مجھ کو ترساتے ہو
لگ جاؤ بھی گر گلے سے لگ جاتے ہو

(19)

عرفاں کی شراب پی کے مستی کب کی؟
اس نقشِ دنی پہ چیرہ دستی کب کی
سب حسن پرستی میں کٹی اپنی عمر
سچ ہے یہ کہ میں خدا پرستی کب کی

قطعۂ تاریخ فتح رام پور

گرچہ تھا گھات میں پرواز فلک نسری کی
دیکھا صعوے[1] نے جوں ہی چنگلِ شاہیں، بھاگا
آصف الدولہ بہادر کا کہوں کیا اقبال
اِسی خورشید سے ڈر لشکرِ پرویں بھاگا
گولہ باری ہوئی اعدا پہ یہاں تک کہ غنیم
رام پور کر کے تہی با دلِ غمگیں بھاگا
مصحفی سے یہی تب آ کے کہا ہاتف نے
فتح آصف کی ہوئی دشمنِ بے دیں بھاگا

1213ھ

1۔ صعوہ = ممولا